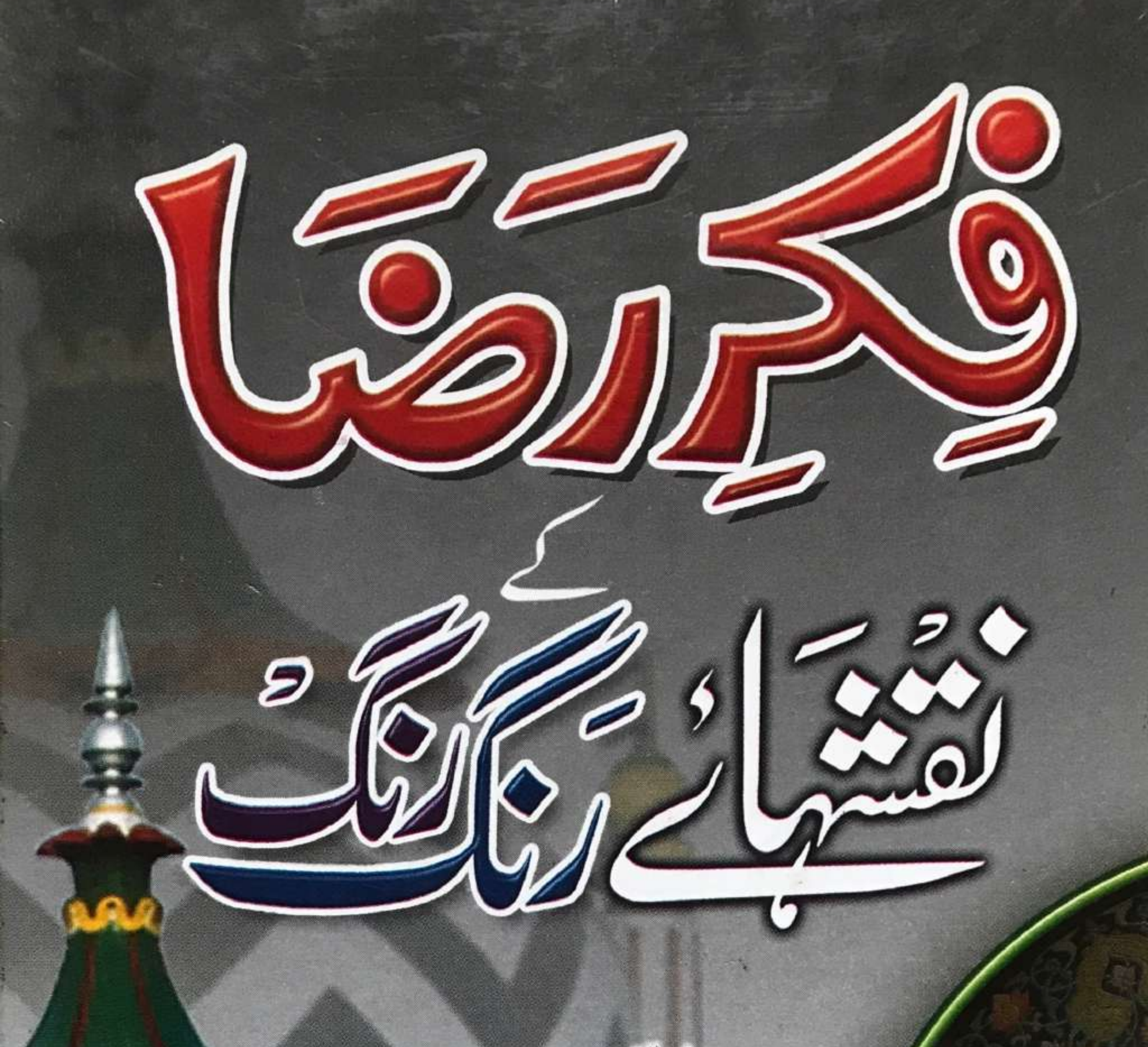


فکرِ رضا

کے

نقشہائے رنگ رنگ

مُرتّب

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی

ایم اے پی ایچ ڈی گولڈ میڈلسٹ

ناشر

جامعہ قادریہ، پونہ

بین الاقوامی دو روزہ امام احمد رضا سمینار و کانفرنس

منعقدہ ۲۶/۲۷ فروری، ۲۰۱۱ء کے فکر انگیز مقالات کا دلچسپ مجموعہ

فکر رضا کے نقشہائے رنگ رنگ

ڈاکٹر غلام جابر شمس پورنوی

ناشر

جامعہ قادریہ، کونڈوا پونہ

نام کتاب : فکر رضا کے نقشہائے رنگ رنگ

مرتب : ڈاکٹر غلام جابر شمس پورنوی

تزئین کار : محمد ارشاد شیخ نجمی

صفحات : ۳۰۴

طباعت : ۲۰۱۱ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : Rs. 150

اہتمام : برکات رضا فاؤنڈیشن، بمبئی

ناشر : جامعہ قادریہ، کونڈوا، پونہ، مہاراشٹر

رابطہ کا پتا

Dr. Ghulam Jabir Shams

201- Gazala Galaxy

Near Kurnal Shoping Centre

Naya nagar Mira road (E) 401107. Mumbai

Ph: 91+9869328511

E-mail: ghulamjabir@yahoo.com

فہرست

انتساب

خانقاہ عالم پناہ مارہرہ مطہرہ

اور خانقاہِ عالیہ رضویہ بریلی شریف

یہ دونوں میری دو آنکھیں ہیں

میں اپنی ہر کوشش کو ان ہی دونوں خانقاہوں کا فیضان سمجھتا ہوں
اور اپنی ہر کوشش اور کامیابی کو ان دونوں کے نام معنون کرتا ہوں

دربار اولیا کا جاروب کش
غلام جابر شمس پورنوی

مٹھی بھر حروف

قصہ امام احمد رضا سمینار و کانفرنس کا

امام احمد رضا، امام احمد رضا ہیں۔ جماعت اہلسنت کی پہچان ہیں، معیار سنیت ہیں۔ میری اوقات یا بساط کیا، یہ میں نہیں کہتا، یہ وہ کہہ گئے ہیں یا کہہ رہے ہیں، جن کو ایسا کہنے کا حق تھا یا ہے۔ ماضی ہی مرکز نور ہے۔ ہم اس مرکز سے نہ ہٹ سکتے ہیں، نہ کٹ سکتے ہیں۔ اسی میں عافیت ہے۔ دین و دنیا کی فلاح کی ضمانت ہے۔ جو اس سے ہٹے گا، ہٹ دھرم کہلائے گا اور جو اس سے کٹے گا، کٹی پتنگ ہو کر رہ جائے گا۔ بغض، حسد، کد، کدورت رکھنے والے چاہے، جو کہیں، اپنے ضمیر کی آواز تو یہی ہے، ایمان کی پکار تو یہی ہے۔

ڈھپ ڈھب کے لوگ ہیں، بھانت بھانت کی بولیاں ہیں۔ میں بھی عجب ڈھب کا آدمی ہوں، الگ قسم کی بولیاں بولتا ہوں، میں کہتا ہوں۔ ہر منفی سوچ کا جواب مثبت کام ہے۔ ہر مرض کی دوا ایک ہی نہیں ہوتی، الگ مرض، الگ دوا۔ تحریر کا جواب تقریر نہیں دے سکتی، اگر تقریر ہی سب کچھ ہے تو پھر تحریر و قلم کی افادیت بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ جب شعبے الگ الگ ہیں، تو ان کے تقاضے بھی جدا جدا ہیں۔ رضویات کا کام جس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ نئے نئے موضوعات سامنے آرہے ہیں۔ وقت اور حالات کے بطن سے جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ اس کے پیش نظر وہ حضرات، جو کام کر رہے ہیں، نتائج کا جائزہ لیں، نئی پالیسی وضع کریں، بالغ حکمت عملی کے ساتھ کام کریں۔ باقی بات خدا کے حوالہ کریں۔ **السعی منا و الاتمام من اللہ۔**

مسلک اعلیٰ کی محبت بچپن سے تحت الشعور میں پڑی ہے۔ پندرہ سال کی عمر سے رضویات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اٹھارہ سال کی عمر سے فکر رضا کی اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ بیس سال کی عمر

میں طباعتی مہم چلائی۔ بائیس برس کی عمر میں تحقیق کی طرف رجوع ہوا۔ تب سے تا حال یہ سفر جاری ہے اور نیت یہی ہے کہ مرتے دم تک یہ سفر رہے گا۔ میری دلی خواہش بھی یہی ہے کہ اسی سفر کی آبلہ پائی میں میرے تن سے میری روح نکلے اور کل قیامت میں امام احمد رضا کے محبین کے زمرہ میں میرا حشر ہو۔ خدا اس خواہش کو پوری فرمائے، قبول فرمائے۔

اللہ! تیرا شکر کیوں کر ادا کروں، تو نے میرے لیے اپنی توفیق ارزاں کر دی ہے اور میں اس راہ عشق و وفا کا مسافر بنا ہوا ہوں، جو تیری پسندیدہ راہ ہے۔ اے اللہ کریم! تو ہی بہترین کریم و کارساز ہے۔ حامی و ناصر ہے، کفیل و وکیل ہے، تیرا در تو تیرا در ہے، یہ در چھوڑ کر جاؤں کہاں تیری کائنات سے باہر رہوں کہاں؟ اے اللہ! میں بے حد گنہگار ہوں۔ تو بے حساب بخشنے والا ہے۔ کیوں کہ تو غفار الذنوب ہے۔ میرے عیوب بے شمار ہیں، ستر پوشی فرما، کیوں کہ تو ستار العیوب ہے۔ دینی کام کے ارادے رکھتا ہوں، پورے فرما۔ کیوں کہ تو مسبب الاسباب ہے۔

امام احمد رضا کانفرنس ۲۰۰۵ء سے فروغ رضویات کا ایک اہم حصہ ہے۔ جس کا انعقاد پچھلے پانچ چھ برسوں سے میرا روڈ، ممبئی میں ہوتا آرہا ہے۔ ۲۰۱۰ء سے اس میں سمینار کا پروگرام بھی شامل کیا گیا۔ جو اپنی نوعیت کا واحد منفرد پروگرام ہے۔ ۲۰۱۰ء کے سمینار و کانفرنس میں دو درجن سے زائد علما، مشائخ اور دانشوران قوم نے شرکت کی۔ اس کے تمام مقالات و بیانات کتابی شکل میں شائع کر دیئے گئے۔ جس کا عنوان 'امام احمد رضا: ایک نئی تشکیل' ہے۔ اس کتاب کا اجرا ۲۰۱۱ء کے سمینار و کانفرنس میں علما و مشائخ کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آیا۔ اب یہ 'فکر رضا کے نقشہائے رنگ رنگ' ہے۔ جو ۲۰۱۱ء کے سمینار و کانفرنس کے مقالات اور رپورٹس پر مشتمل ہے، جو قارئین کے پیش نظر ہے۔

امام احمد رضا سمینار و کانفرنس کا یہ پروگرام میرا روڈ، ممبئی میں منعقد ہوتا ہے۔ کیف و کم، مواد و میٹر، رنگ روغن، گیٹ اپ اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے انتہائی اہم، نتیجہ خیز، مؤثر ہوتا ہوا آرہا ہے۔ درجنوں درجن مندوبین کی آمد، عوام، علما، طلبہ کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ، اسٹوڈینس، ٹیچرس، پروفیسرز اور تمام شعبہ زندگی کے نمائندہ افراد کی شرکت، خالص علمی اور دانشورانہ اسلوب میں گفتگو، نہایت عمدہ نظم و نسق اس پروگرام کی خصوصیت ہے۔ خدا کرے، اس اہم منصوبہ کی یہ خصوصیت برقرار

رہے اور ہر سال یہ پروگرام اپنی امتیازی شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا کرے۔

تصنیف وتحقیق، طباعت واشاعت، تقریر وخطابت کے علاوہ یہ میری جداگانہ کاوش ہے۔ اس کاوش نے ملک کے علمی حلقوں میں ایک نہایت خوشگوار اثر قائم کیا ہے۔ خدا اس اثر کو تادیر قائم رکھے۔ آمین۔ انتشار ذہن کی پوزیشن میں یہ چند حروف سپرد قلم ہوئے ہیں۔ کہیں کچھ کوتاہی ہوئی ہے، تو قارئین نظر انداز فرمائیں۔

جامعہ قادریہ کونڈوا، پونہ کے جملہ اراکین واساتذہ خصوصاً حضرت مفتی محمد ایاز احمد مصباحی، مفتی وصدر المدرسین جامعہ قادریہ اور ہمدردقوم پروفیسر ڈاکٹر سعید احسن قادری کی ذاتی دلچسپی سے چھپ کر یہ کتاب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ قارئین ان حضرات کے لیے دعا فرمائیں۔ خدائے قدیر ان کی خدمات قبول فرمائے، جامعہ قادریہ پونہ کو بام عروج تک پہنچائے، آمین بجاہ سید المرسلین۔

العارض والعاجز	۱۳ر محرم ۱۴۳۴ھ
غلام جابر شمس مصباحی	۷ر دسمبر ۲۰۱۱ء

فقیہ النفس مفتی مطیع الرحمٰن رضوی، پورنیہ

صبح و شفق

امام احمد رضا، جو قرآن و حدیث اور تفسیر و فقہ کے علاوہ آج کے شاخ در شاخ علوم و فنون کے سو سے زائد اقسام پر نہ صرف دسترس و مہارت رکھتے تھے۔ بلکہ صاحب تصنیف تھے۔ مرگ چشیدہ علم توقیت، جس میں نماز روزے کے اوقات نکالنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں، اس علم کو از سر نو زندہ کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ وہ امام احمد رضا ہی کی ذات ہے، جن کے دریائے علم سے سیراب ہونے والے ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ کے مستخرجہ اوقات آج بھی پورے غیر منقسم ہندوستان میں سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے ''فتاویٰ رضویہ'' میں فرمایا ہے کہ ''مغرب اور فجر کا وقت بریلی اور اس کے قریب العرض شہروں میں کم سے کم ایک گھنٹہ اٹھارہ منٹ اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ پینتیس منٹ رہتا ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ جو ہیئت و ہندسہ جانتا ہوا سے براہین کے مطابق پائے گا اور جو نگاہ رکھتا ہو، صبح صادق و کاذب کو دیکھ کر پہچان سکتا ہو، وہ اسے مشاہدہ کے موافق پائے گا۔ کیوں کہ میں نے اس فن میں نہ نری کتابی باتوں پر اعتماد کیا ہے، نہ خالی دلائل ہندسہ پر، نہ تنہا تجربہ و مشاہدہ پر، بلکہ سب کو جمع کیا ہے اور بتوفیق الٰہی اپنی ذہنی جدتوں سے بہت کچھ کام لیا ہے، یہاں تک کہ بفضلہٖ تعالیٰ برہان و عیان کو مطابق کر دیا ہے۔''

مگر لندن میں مقیم ہندوستانی عالم حضرت مولانا نظام الدین صاحب مدظلہ نے ٹیلیفون پر بتایا کہ وہاں ایک صاحب جو فن توقیت میں ماہر کہے جاتے ہیں، اسے غلط بتاتے ہیں۔ پھر بذریعہ ای

میل ان صاحب کی تحریر بھی بھیجی اور وہاں کے متعلق گرمیوں کے بعض دنوں میں عشا کی نماز اور سحری کا وقت دریافت کیا۔ یہ مقالہ اسی پس منظر میں قلم بند ہوا ہے، جس میں ان صاحب کا براہ راست رد کرنے کی بجائے امام احمد رضا کے نظریہ کو عقل ونقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا گیا ہے اوران صاحب کے دلائل کو شبہ کہہ کرفنی اور شرعی اعتبار سے اس کا ازالہ کیا گیا ہے۔

فقیر مطیع الرحمٰن رضوی غفرلہ

صبح شفق

(۱) رات کی تاریکی ہو یا دن کا اجالا، سب میں سورج ہی کی ضوفشانی کارفرما ہے۔ دنیا چونکہ گول ہے، اس لیے آدھی رات کے بعد سورج جب ہماری طرف بڑھتے ہوئے افق کے قریب پہونچتا ہے، تو صبح کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔

(۱) پہلے جائے طلوع میں افق سے کچھ اوپر روشنی کا ایک ستون سا نظر آتا ہے۔

(ٹیکنیکل پروبلم کی وجہ سے یہاں تصویر نہ آسکی)

(۲) اس کے بعد ستون کے نچلے حصہ میں اتر دکھن قوس نما روشنی کی ایک سفید سی پٹی پیدا ہوتی ہے۔

(ٹیکنیکل پروبلم کی وجہ سے یہاں تصویر نہ آسکی)

(۳) پھر افق پر اس طرح سرخی چھا جاتی ہے۔

(ٹیکنیکل پروبلم کی وجہ سے یہاں تصویر نہ آسکی)

(۴) اس کے بعد سورج نکل آتا ہے اور افق زردی نما ہو جاتا ہے۔

اسی طرح دوپہر کے بعد سورج جب ہم سے مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے افق کے قریب پہونچتا ہے تو زرد ہو جاتا ہے اور شام کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔

(۱) پہلے سورج غروب ہوتا ہے۔

(ٹیکنیکل پروبلم کی وجہ سے یہاں تصویر نہ آسکی)

(۲) اس کے بعد افق میں سرخی چھا جاتی ہے۔

(ٹیکنیکل پروبلم کی وجہ سے یہاں تصویر نہ آسکی)

(۳) پھر سرخی غائب ہوکر، جائے غروب سے اتر دکھن ستون کے نچلے حصہ میں قوس نما روشنی کی ایک پٹی سی نظر آتی ہے۔

(ٹیکنیکل پروبلم کی وجہ سے یہاں تصویر نہ آسکی)

(۳) اس کے بعد وہ پٹی غائب ہوکر افق سے کچھ اوپر روشنی کا ایک ستون سا نظر آتا ہے۔

(ٹیکنیکل پروبلم کی وجہ سے یہاں تصویر نہ آسکی)

بدایۃ المجتہد ج ۱، ص: ۶۹ میں ہے:

فالطوالع اذن اربعة الفجر الكاذب والفجر الصادق والاحمر والشمس.. كذالك يجب ان تكون الغوارب۔ سورج طلوع ہونے میں جس طرح سے چار حالتیں ہوتی ہیں (۱) فجر کاذب (۲) فجر صادق (۳) فجر احمر (۴) طلوع شمس۔ غروب ہونے میں بھی اسی طرح سے چاروں حالتیں: (۱) غروب آفتاب (۲) شفق احمر (۳) شفق ابیض (۴) بیاض مستطیل نظیر صبح کاذب، ہونا لازمی ہیں۔

ملا محمود چغمینی کی ''ملخص'' اور قاضی زادہ محمد موسیٰ فاضل رومی کی ''شرح'' ص:۱۲۱ میں ہے:

الشمس اذا وقع ضوئها على الارض استضاء وجهها المواجه للشمس ووقع ظلها فى مقابلة جهة الشمس...... فاذا كان الشمس فوق الارض فهو النهار...... واذا كانت تحت الارض وقع ظلها فوقها وهو الليل ووقوع ظلها يكون على شكل مخروط مستدير...... اذالشمس اعظم جرما من الارض بكثير...... فان كانت الشمس تحت الارض قريبة من الافق كان مخروط الظل مائلا عن سمت الرأس الىٰ مقابلة الشمس وسطحه الذى فى جهتها مائل الينا وكان الهواء المستضىء بضياء الشمس (لكثافته الحاصلة المجاورة للارض والماء يعنى الهواء المستضى من كرة البخار فان الهواء الذى فوقها) لا تقبل الاستضائة للطافته قريبا منا فيظهر فى الافق بل فوقه النور فالبياض المستطيل المستدق الظاهر فوق الارض اولا يسمى بالصبح الكاذب كان لون الافق بعده مظلما يكذب كونه نور الشمس والمستطير المنبسط فى الافق بعده بزمان يسمى بالصبح الصادق لكونه اصدق ظهورا من الاول قال عليه السلام: لايغرنكم الفجر المستطيل فكلوا واشربوا حتى يطلع الفجر المستطير۔

جب سورج کی روشنی زمین پر پڑتی ہے، تو زمین کا وہ حصہ، جو سورج کی طرف ہے، روشن ہو جاتا ہے اور سایہ نیچے چلا جاتا ہے۔ پس جب آفتاب زمین کے اوپر ہو تو دن ہوتا ہے اور زمین کے نیچے ہو تو رات ہوتی ہے۔ سورج چوں کہ زمین سے بہت بڑا ہے، اس لیے زمین کا سایہ مخروط متدیر کی شکل میں ہوتا ہے۔ پس سورج جب زمین کے نیچے افق شرقی سے قریب ہوتا ہے، تو مخروطِ ظل سمتِ رأس سے سورج کی جہت مقابل کی طرف جھکا ہوتا ہے اور اس کی وہ سطح جو سورج کی طرف رہتی ہے، ہماری طرف جھکی ہوتی ہے، تو افق سے اوپر روشنی معلوم ہوتی ہے۔ وہی پہلی روشنی جو زمین سے اوپر مستطیل ومتدق معلوم ہوتی ہے، صبح کاذب کہلاتی ہے۔ اس کے بعد جو روشنی افق پر (قوس نما) پھیلتی ہے، اس کو صبح صادق کہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: فجر مستطیل سے دھوکا نہ کھاؤ، فجر مستطیر تک کھاتے پیتے رہو۔

تصریح از بہاء الدین عاملی ۶۹ میں ہے:

فیری الضوء مرتفعا عن الافق مستطیلا ومابینه وبین الافق مظلما وھو ای الضوء المنی المستطیل الصبح الکاذب ثم ای بعد ظھور الصبح الکاذب اذا قربت الشمس من الافق الشرقی جدارا ای الضوء معترضا فی الافق ویزداد الی ان یظھر کله وھو الصبح الصادق والفجر المستطیر لاستطارته وانتشاره فی الافق ثم یر محمر والشفق بعکس الصبح یبدا محمرا ثم مبیضا معترضا ثم مرتفعا مستطیلا فھما متشابھان شکلا ومتقابلان وضعا ومتخالفان لونا ومتعاکسان حدا ای ابتداء وانتھاء.

جس وقت افق سے بلند ہوتی ہوئی لمبی روشنی دکھائی دیتی ہے، جس کے اور افق کے درمیان تاریکی رہتی ہے، اسی لمبی روشنی کو صبح کاذب سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر صبح کاذب ظاہر ہونے کے بعد سورج جب افق شرقی سے زیادہ قریب ہوتا ہے، تو افق میں روشنی پھیلتی

ہوئی دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ روشنی بڑھتے، بڑھتے افق خوب روشن ہو جاتا ہے۔ اس وقت کو صبح صادق اور فجر مستطیر کہتے ہیں۔ اس کے بعد افق پر سرخی چھا جاتی ہے۔ شفق، صبح کے برعکس یعنی پہلے سرخی چھاتی ہے، پھر پھیلی ہوئی روشنی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد لمبی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ تو صبح و شفق شکل کے اعتبار سے ایک دوسر کے مشابہ، وضع کے اعتبار سے متقابل، رنگ کے اعتبار سے متخالف اور ابتدا و انتہا کے اعتبار سے برخلاف ہیں۔

القانون المسعودی ج: ۲، **المقالة الثامنة الباب الثالث عشر فی اوقات طلوع الفجر ومغیب الشفق** ص: ۹۴۸ میں ہے:

شعاع الشمس حاصل فی کل الهواء الذی فی تجویف الفلک ماخلا موضع مخروط الظل فانه غیر واصل الیه ولکن الانارة لاتکون للمشف وکما قلنا انها للقمر وللارض فقط من جهة استحصا فها فانها ایضا للاجزاء المنفصلة منها احوال الارض مجتمعة کالغیوم ومفترقة کالهبا آت والبصر فی الظّام وخاصة المتراکم منه البعید الحواشی اقوی علی الدراک فاذا اقتربت الشمس من الافق للطلوع واشتد میل مخروط الظل عنا قریب منامحیطة المستنیر والذی یلی الارض منه اشتد استنارة بالهبا آت الارضیة التی فیه فادر کناها جملة غیر منفصلة لان اافلها التی نحونا تکون مضیئة وذالک هو الفجر وهو ثلاثة انواع. اولها مستدق مستطیل منتصب یعرف بالصبح الکاذب ویلقب باذنب السرحان. ولا یتعلق به شئی من.

الاحکام الشرعیة ولا من العادات الرسمیة ۔ والنوع الثانی منبسط فی عرض الافق مستدیر کنصف دائرة یضئ به العالم فینتشرله الحیوانات والناس للعادات، وتنعقد به شروط العبادات. والنوع الثالث حمرة

تتبعها وتسبق الشمس وهو كا لاول فی باب الشرع. وعلى مثله حال الشفق فان سببهما واحد وكونهما واحد وهو ايضا ثلاثة انواع مخالفة الترتيب لما ذكرنا وذالک ان الحمرة بعد غروب الشمس اول انواعه، والبياض المتشر ثانيها، واختلاف الائمة فی اسم الشفق على ايهما يقع اوجب ان يتنبه لهما معا. والثالث المستطيل المتصب الموازی لذنب السرحان، وانما لايتنبه الناس له لان وقته عند اختتام الاعمال واشتغالهم بالاكتنان، واما وقت الصبح فالعادة فيه جارية باستكمال الراحة والتهيؤ للتصرف فهم فيه منتظرون طليعة النهار ليأخذوا فی الانتشار، فلذالک ظهر لهم هٰذا وخفی ذالک، وبحسب الحاجة الى الفجر والشفق رصدا صهاب هٰذه الصناعة امره فحصولا من قوانين وقته ان انحطاط الشمس تحت الافق متى كان ثمانية عشر جزء كان ذالک وقت طلوع الفجر فی المشرق ووقت مغيب الشفق فی المغرب. ولما لم يكن شيئا متعينا بل بالاول مختلطا اختلف فی هٰذا القانون فراٰه بعضهم سبع عشر جزء.

ظل مخروط میں چونکہ شعاعیں نہیں پہونچتی ہیں اس لیے سورج کی شعاعیں ظل مخروط کو چھوڑ کر تجویف فلک میں پوری فضا کو محیط ہوتی ہیں، مگر شفاف چیز روشن نہیں ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ روشنی صرف چاند اور زمین کو ٹھوس ہونے کی بنا پر حاصل ہوتی ہے، وہ بھی اس لیے کہ زمین کے ارد گرد اس سے منفصل و مجتمع یا منفصل و متفرق اجزا جیسے بادل یا غبار کے ذرات ہوتے ہیں۔ اندھیرا، خصوصا گہرا اور پھیلا ہوا اندھیرا، ادراک کا قوی ترین ذریعہ ہے۔ پس سورج جب افق کے قریب ہو کر طلوع ہونے کو آتا ہے، تو مخروط ظلی کا جھکاؤ زیادہ ہو کر اس کا محیط مستنیر ہم سے قریب ہو جاتا ہے اور زمین کے قریبی حصہ میں چونکہ ذرات ہوتے ہیں، اس لیے وہاں روشنی زیادہ ہوتی ہے اور ہم اسے اکٹھا غیر منفصل دیکھتے

ہیں، اس کے نیچے کا وہ حصہ، جو ہماری طرف رہتا ہے، روشن ہو جاتا ہے، جس کو فجر کہتے ہیں۔ فجر کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) جب روشنی باریک مستطیل کھڑی نظر آتی ہے، اس کو صبح کاذب اور ذنب السرحان کہتے ہیں، اس کے ساتھ کوئی حکم شرعی یا انسانی عادت وابستہ نہیں ہے۔

(۲) جب روشنی افق ارض پر پھیلی ہوئی قوس کی شکل میں نظر آتی ہے اور عالم روشن ہو جاتا ہے۔ اس وقت عادۃً انسان سے لے کر جانور تک سبھی جاگ جاتے ہیں۔ عبادتوں کی شرطیں اسی سے متعلق ہیں۔

(۳) جب افق پر سفیدی ختم ہو کر سرخی چھا جاتی ہے اور سورج طلوع ہونے کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ پہلی ہی قسم کی طرح شریعت کا کوئی حکم اس سے بھی متعلق نہیں ہے۔

فجر ہی کی طرح شفق کی بھی تین قسمیں ہیں کیوں کہ دونوں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں اور دونوں کے وجود کا سبب بھی ایک ہی ہے۔ البتہ یہاں ترتیب الٹی ہوتی ہے یعنی غروب آفتاب کے بعد سرخی پہلی قسم ہے اور افق پر سفیدی پھیل جانا دوسری قسم ہے۔

شفق کے سلسلہ میں ائمہ (لغت دانوں) کا اختلاف ہے کہ شفق سرخی کا نام ہے یا سفیدی کا؟ اس لیے ان دونوں کی معرفت ایک ساتھ ضروری ہوئی۔

پھر روشنی ذنب سرحان کے موازی مستطیل ومنصب نظر آتی ہے۔ یہ وقت چونکہ کام کاج سمیٹ کر گھروں میں دُبکے رہنے کا ہوتا ہے، اس لیے سب لوگ اس سے واقف نہیں ہیں۔ جب کہ صبح کا وقت عادۃً نیند پوری کر کے کاروبار کی تیاری کا ہوتا ہے، تو لوگ چلنے پھرنے کے لیے دن ہونے کے انتظار میں رہتے ہیں، اس لیے یہ لوگوں کے لیے ظاہر رہا اور وہ مخفی۔

(۴) غیر مسلم ارباب ہیأت ہوں یا مسلم ارباب ہیأت، جنہوں نے اجرام علویہ اور اجسام بسیطہ کا کم وکیف اور این ووضع جاننے ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، انہوں نے بار بار کے مشاہدہ اور تجربہ سے اصول وقواعد مرتب کیے کہ افق سے کچھ اوپر روشنی کا اٹھتا ہوا

ستون اس وقت نظر آتا ہے، جب آفتاب افق سے ۱۸؍درجے سے زیادہ نیچے رہے اور جب افق کے ۱۸؍درجے قریب آجائے، تو جائے طلوع سے اتر دکھن ستون کے نچلے حصہ میں روشنی قوس نما پٹی میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح افق غربی پر جائے غروب سے اتر دکھن قوس نما سفید پٹی اس وقت نظر آتی ہے، جب آفتاب ۱۸؍درجے سے کم۔۔۔پہونچے اور جب ۱۸؍درجے نیچے پہونچ جاتا ہے، تو وہ قوس نما سفید پٹی غائب ہو کر افق سے کچھ اوپر اٹھتا ہوا روشنی کا ایک ستون سا نظر آتا ہے۔

قانون مسعودی میں ہے:

وبحسب الحاجة الی الفجر والشفق رصد اصحاب هذه الصناعة امره فحصولا من قوانين وقته ان انحطاط الشمس تحت الافق متی کان ثمانية عشر جزء کان ذالک وقت طلوع الفجر فی المشرق ووقت مغيب الشفق فی المغرب ولما لم يکن شيئا متعينا بل بالاول مختلطا اختلف فی هٰذا القانون فرأه بعضهم سبع عشر جزء۔

بہر حال فجر و شفق کی ضرورت رہی، تو اہل فن نے اس طرف توجہ دی اور ان کے اوقات جاننے کے قوانین بنائے۔ جن کا حاصل یہ کہ آفتاب جب پورب طرف اٹھارہ درجے زیر افق آجاتا ہے، تو فجر طلوع ہوتا ہے اسی طرح جب پچھم طرف اٹھارہ درجے زیر افق چلا جاتا ہے، تو شفق غائب ہوتی ہے۔

اس موضوع پر ''السبع الشداد'' وہ کتاب ہے، جس کے مؤلف نے آغاز کتاب میں صراحت کر دی ہے کہ میں نے اس کتاب میں وہ اصول بیان کیے، ہیں جن کو بطلیموس نے اپنی کتاب ''مجسطی'' میں دلائل سے ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں: **واوردت فيه اصول المسائل حکاية ماثبت. فی المجسطی بالدلائل**، اس السبع الشداد مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ کے ص: ۳۷ میں ہے:

الصبح استنارة فی البخار نحو المشرق قبل طلوع الشمس والشفق نحو المغرب بعد غروبها ویتشابهان شکلا ویتقبلان وضعا وانحطاطها عند اول الاول وآخر الآخر ثمانی عشر جزء ففی عرض ثمانیة واربعین ونصف یتصلان معا۔

سورج نکلنے سے پہلے مشرق کی طرف بخارات کے روشن ہوجانے کا نام صبح اور غروب آفتاب کے بعد پچھّم کی طرف بخارات ہی کے روشن ہوجانے کا نام شفق ہے۔ یہ شکل میں ایک دوسرے کے مشابہ اور وضع میں متقابل ہیں۔ صبح کی ابتدا اور شفق کی انتہا کے وقت سورج اٹھارہ درجے زیرافق ہوتا ہے۔ تو ساڑھے اڑتالیس درجے عرض البلد میں دونوں ایک ساتھ مل جاتے ہیں۔

محقق طوسی نے ''بست باب'' میں اسطرلاب کے ذریعہ صبح وشفق کے استخراج سے متعلق لکھا ہے:

نظیر درجه آفتاب بر مقنطره (افق حقیقی کے موازی جو دائرہ صغیرہ ہیں) هژدهم درجه غربی نهیم ومرئی (وہ دائرہ جو افق حقیقی کا موازی ہو اور زمین پر بسنے والوں کی نگاہ اس دائرہ سے نیچے نہ جاتی ہو) نشان کینم، پس بر افق مغرب نهیم ومرئی نشان کینم، ومیان هر دو نشان بشمریم وبرپا نثرده قسمت کینم، آنچه بیرون آید ساعات مستوی باشدمیان طلوع صبح و آفتاب، وچنین نظیر درجهٔ آفتاب را برافق شرقی نهیم ومرئی نشان کینم، پس بر مقنطره هژدهم درجه شرقی نهیم ومرئی نشان کینم، ومیان هر دو نشان بشمریم وبرپانشده قسمت کینم، انچه بیرون آید ساعات بودمیان غروب آفتاب وغروب شفق.

اٹھارہ درجہ غربی کے مقنطرہ پر درجہ آفتاب کی نظیر کو رکھیں اور افق مرئی پر نشان لگادیں، پھر مغربی افق پر رکھیں اور مرئی پر نشان لگادیں، اب دونوں نشانوں کے بیچ کو شمار

کر کے پندرہ سے تقسیم کریں، تو حاصل قسمت، صبح اور طلوع آفتاب کے درمیان کے اوقات ہوں گے۔ اسی طرح درجۂ آفتاب کی نظیر کو افق شرقی رکھیں اور مرئی پر نشان لگادیں پھر اٹھارہ درجہ شرقی کے مقنطرہ پر رکھیں اور افق مرئی پر نشان لگادیں اور دونوں نشانوں کے بیچ کو شمار کر کے پندرہ سے تقسیم کردیں، تو حاصل قسمت غروب آفتاب اور غروب شفق کے درمیاں کے اوقات ہوں گے۔

محشی نے لکھا ہے کہ محقق طوسی کا یہ قاعدہ آفتاب کے اٹھارہ درجہ زیر افق ماننے پرمبنی ہے، حاشیہ کے الفاظ ہیں:

وچوں آفتاب بدائرہ نصف النہار تحت الارض رسد راس ایں...... مخروط بدائرہ نصف النہار فوق الارض رسیدہ باشد ونیم شب باشد وچوں نزدیک شود بافق شرقی سفیدی کہ از طرف مشرق برافق منبسط باشند آن را صبح خوانند...... وبتجربہ وامتحان بالآتے کہ لائق است یعنی از اسطرلاب معلوم کردہ اند کہ چون آفتاب ہشردہ درجہ از افق منحط شود شفق منقضی گشتہ ۔جب آفتاب زمین کے نیچے دائرۂ نصف النہار میں ہوگا، تو مخروط کا رأس زمین کے اوپر دائرۂ نصف النہار میں پہونچ جائے گا اور آدھی رات ہوگی اور جب افق شرقی سے قریب ہوگا، تو افق پر پھیلی ہوئی سفیدی نظر آئے گی اسی کو صبح کہتے ہیں۔ تجربہ اور آلات یعنی اسطرلاب کے ذریعے معلوم کیا گیا، تو پتا چلا کہ جب آفتاب افق سے اٹھارہ درجے منحط ہوتا ہے، شفق ختم ہوجاتی ہے۔

شرح چغمنی میں ہے:

وقدعرف بالتجربۃ ان اول الصبح وآخر الشفق انما یکون اذا کان انحطاط الشمس ثمانیۃ عشر جزاء۔ تجربہ نے بتایا کہ صبح کی ابتدا اور شفق کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب آفتاب افق سے اٹھارہ درجے نیچے ہوتا ہے۔

التحفۃ الشاھیہ، ص:۲۰۳۹ میں ہے:

الفصل العاشر ان الصبح والشفق استنارة فی کرة البخار لاقبال الشمس علی الافق الشرقی وادبارها عن الغربی والا لما اثر قربها وبعدها فیه لکن علم بالتجربة ان اول الفجر وآخر الشفق انما یوجد وانحطاطها ثمانیة عشر درجة ولا یریٰ ان کان اکثر.......... وهما متشبهان شکلا متقابلان وضعا لان اول طلوع الفجر کآخر غروب الشفق اذا الفجر یبدو من ضیاء ضعیف وهو البیاض المستدق السمتطیل یسمی الصبح الاول.......... ثم البیاض المستطیر وهو العریض المنبسط ویسمی بالصبح الصادق ...... ثم یرتفع بالقطعة شئی بعد شئی ویصیر کلها فوق دائرة البخار فیقوی الضیاء ویشرع الحمرة ویزداد الی حین الطلوع...... ثم ینحط جانبها نحو الغرب کلما ارتفعت الشمس عن الافق الی حین وصولها افق الغرب فکان حالها کما کان عند الطلوع ثم یمیل نحو الغرب الی ان ینحط الشمس ثمانیة عشرة فیماس دائرة المخروط دائرة البخارات علی نقطة من جهة الغرب ثم ینحط عنهاویصیر کل دائرة المخروط تحت دائرة البخار فیختفی الضیاء...... الی ان یماسها لجانبها الشرقی قبیل الصبح ویعود الامر من الراس...... اعلم انه ان کان انحطاط الشمس من الافق عند اول الصبح وآخر الشفق ثمانیة عشرة من دائرة ارتفاعها ...... اذا کانت الشمس فی المنقلب الذی فی جهة الارض یتصل الشفق بالصبح لان قوس انحطاطها من دائرة نصف النهار حینئذ یصیر ثمانیة عشرة جزاء والآن الذی هو آخر غروب الشفق یتصل اول طلوع الصبح وفیما جاوز العرض ذالک یکون اتصالهما فی زمان بحسب تناقص انحطاطها عن الافق لان طلوع الصبح یکون قبل غروب الشفق۔

صبح کے وقت سورج کا افق شرقی کے سامنے اور شام کو افق غربی کے پیچھے ہونے کی بنا پر کرۂ بخار میں اجالا ہوتا ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ صبح کا آغاز اور شفق کا اختتام اس وقت ہوتا ہے، جب سورج افق کے ۱۸؍درجے نیچے ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ نیچے ہو تو صبح و شفق نمودار نہیں ہوتے ہیں۔ شکل کے لحاظ سے صبح و شفق ایک دوسرے کے مشابہ اور وضع کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ طلوع صبح کی ابتدا غروب شفق کی انتہا کی طرح ہے۔ کیوں کہ اس کا آغاز کمزور روشنی یعنی مستدق و مستطیل سفیدی سے ہوتا ہے، جسے صبح اول کہتے ہیں۔ بیاض مستطیل کے بعد پھیلی ہوئی بیاض مستطیر کا آغاز ہوتا ہے، جسے صبح صادق کہتے ہیں...... پھر سورج آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے ہوئے دائرۂ بخار کے اوپر آجاتا ہے اور روشنی بڑھ جاتی ہے، تو سرخی نمودار ہوتی ہے۔ سورج طلوع ہونے تک یہی حال رہتا ہے۔ پھر جب سورج بڑھتے بڑھتے افق مغرب تک پہونچتا ہے، تو مغرب کی طرف جھک جاتا ہے اور غروب کی حالت طلوع کی حالت جیسی ہو جاتی ہے۔ پھر سورج پچھم کی طرف بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ افق مغرب سے اٹھارہ درجے دور ہو جاتا ہے، تو پچھم کی طرف ایک نقطہ پر دائرۃ المخروط دائرۂ بخار سے مماس ہو جاتا ہے۔ پھر اس سے دور ہٹتا ہوا دائرۂ بخار کے نیچے آجاتا ہے تو روشنی غائب ہو جاتی...... آغاز صبح اور اختتام شفق کے وقت آفتاب ۱۸؍درجے زیر افق ہوتا ہے۔ اس لیے جب سورج زمین کی جانب منقلب میں ہو، تو شفق صبح سے مل جائے گی، کیوں کہ نصف النہار کے دائرہ سے اس کی قوس انحطاط اس وقت اٹھارہ درجہ ہوگی اور وہ لمحہ جو غروب شفق کا آخری لمحہ ہے، اول طلوع صبح سے مل جائے گا اور جہاں عرض اس سے بڑھ جائے، وہاں دونوں کا اتصال افق سے انحطاط کے تناقص کے حساب سے ہوگا، کیوں کہ طلوع صبح غروب شفق سے پہلے ہی ہو جاتا ہے۔

(۳) اسلام نے اپنے ماننے والوں کے لیے عبادتوں کے جو اوقات متعین فرمائے ان کا مدار بھی رویت و مشاہدہ ہی پر رکھا:

(۱) واقم الصلوٰۃ طرفی النہار وزلفامن الیل ۔(ہود:۱۱۴)اورنماز قائم رکھودن کے دونوں کناروں اور کچھ رات کے حصوں میں۔

(۲) اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل وقراٰن الفجر۔(بنی اسرائیل: ۷۶)نماز قائم رکھوسورج ڈھلنے سے رات کی اندھیری تک اور صبح کا قران۔

(۳) وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا ومن آناء الیل فسبح واطراف النھار لعلک ترضیٰ (طٰہٰ:۱۳۰)اوراپنے رب کوسراہتے ہوئے اس کی پاکی بولو، سورج چمکنے سے پہلے اوراس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کی گھڑیوں میں اس کی پاکی بولواوردن کے کناروں پر، اس امید پر کہ تم راضی ہو۔

(۴) فسبحٰن اللہ حین تمسون وحین تصبحون ولہ الحمد فی السمٰوٰت والارض وعیشاً وحین تظھرون ۔(روم:۱۷،۱۸)تواللہ کی پاکی بولو جب شام کرواور جب صبح ہواوراسی کی تعریف ہے آسمانوں اورزمین میں اور کچھ دن رہے اور جب تمہیں دوپہر ہو۔

(۵)وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتموا الصیام الی الیل (بقرر:۱۸۵)اورکھاؤاور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے ظاہر ہوجائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے پو پھٹ کر، پھر رات آنے تک روزے پورے کرو۔

(۴) اور رویت ومشاہدہ خالص دینی بات نہیں ہے، البتہ دینی بات کو مستلزم ہے۔لہٰذا فقہائے اسلام خود تجربہ نہ کرکے ہیأت دانوں کے تجربہ ہی پر عمل کرلیتے تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا، جیسے ہم ریڈیو سے گھڑی ملا کراس کے مطابق نمازیں پڑھتے ہیں، سحری وافطار کرتے ہیں۔حالانکہ ریڈیو سے وقتوں کی خبر عموماً غیر مسلمین ہی دیتے ہیں۔

فتاویٰ عالمگیری کتاب الکراہیۃ ج ۵، مکتبہ رشیدیہ پاکستان ص:۳۰۸ میں ہے:

ولا یقبل قول الکافر فی الدیانات الا اذا کان قبول قول الکافر فی المعاملات یتضمن قبوله فی الدیانات فحینئذ تدخل الدیانات فی ضمن المعاملات فیقبل قوله فیها ضرورة هکذا فی التبیین من ارسل اجیر اله مجوسیا او خادما فاشتری لحما فقال اشتریته من...... مسلم وسعه اکله۔

دین کی باتوں میں غیر مسلم کے کہنے کا اعتبار نہیں۔ ہاں! دین کی بات معاملات کے ضمن میں ہو تو غیر مسلم کے کہنے کا بھی اعتبار ہو جائے گا۔ تبیین میں ایسا ہی ہے۔ لہٰذا کسی نے اپنے مجوسی مزدور یا خادم کو گوشت خریدنے کے لیے بھیجا اور مزدور یا خادم نے بتایا کہ وہ مسلمان سے خریدا ہے تو اس گوشت کا کھانا جائز ہے۔

لیکن پھر بھی فقہائے اسلام نے خود تجربے کیے۔ جس کے نتیجے میں ارباب ہیأت کی تصدیق ہوگئی کہ واقعی سورج جب اٹھارہ درجے زیر افق ہوتا ہے تو صبح صادق کا آغاز اور شفق ابیض کا اختتام ہوتا ہے۔ چنانچہ امام برہان کبیر، امام بقالی اور امام شمس الائمہ حلوانی کے زمانے میں استفتا ہوا کہ بُلغار جس کا عرض البلد اس زمانے کی رصدگاہ اور پیمائش کے مطابق جیسا کہ امام احمد رضا نے ''زیج سمرقندی'' اور ''زیج الوغ بیگی'' کے حوالوں سے نقل فرمایا ہے، ساڑھے انچاس درجے شمالی تھا، وہاں گرمیوں کی چھوٹی راتوں میں عشا کا وقت نہیں آتا ہے، ابھی شفق ابیض غائب نہیں ہو پاتی ہے کہ سپیدۂ سحر طلوع ہو جاتا ہے، وہاں کے لوگ کیا کریں؟ امام برہان کبیر نے فتویٰ دیا کہ قضا پڑھیں اور امام بقالی و شمس الائمہ حلوانی نے فرمایا کہ ان سے عشا کی نماز ساقط ہے۔ تو حکم میں اختلاف کے باوجود تینوں ہی اماموں نے تسلیم کرلیا کہ جس مقام کا عرض البلد ساڑھے انچاس درجہ ہوگا وہاں اس زمانے میں گرمیوں کی چھوٹی راتوں میں ابھی شفق ابیض غائب نہیں ہو پائے گی کہ سپیدۂ سحر طلوع ہو جائیگا، اس لیے عشا کا وقت نہیں آئے گا۔

بعد کے فقہائے کرام میں کچھ حضرات نے امام برہان کبیر کے قول کو ترجیح دی تو کچھ حضرات نے شمس الائمہ حلوانی کے قول کو راجح قرار دیا۔ بہر حال سارے ہی فقہائے کرام نے اپنی

اپنی کتابوں میں اسے نقل کیا اور برقرار رکھا۔ چنانچہ کنز الحقائق اور اس کی شرح بحر الرائق ج:۱، ص:۲۲۸ میں ہے:

ومن لم یجب وقتهمالم یجبا. ای العشاء والوتر کما لو کان فی بلد یطلع فیه الفجر قبل ان یغیب الشفق کبلغار فی اقصرلیالی السنة فیما حکاه معجم صاحب البلدان لعدم السبب وافتی به البقالی...... وافتی بعضهم بوجوبها واختاره المحقق فی فتح القدیر الخ ۔ بلغار، جہاں صاحب معجم البلدان کے مطابق گرمی کی چھوٹی راتوں میں شفق غائب ہونے سے پہلے ہی فجر طلوع ہوجاتی ہے، وہاں کے بارے میں امام بقالی کا فتویٰ یہ ہے کہ سبب نہیں پائے جانے کی وجہ سے عشا کی نماز فرض نہیں ہے اور بعض حضرات نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ فرض ہے محقق علی الاطلاق نے فتح القدیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

فتح القدیر، ج:۱،ص:۲۲۵ میں ہے:

ومن لایوجد عندهم وقت العشاء کما قیل یطلع الفجر قبل غیبوبة الشفق عندهم، افتی البقالی بعدم الوجوب علیهم لعدم السبب، وهو مختار صاحب الکنز...... وانکره الحلوانی ثم وافقه، وافتی الامام البرهانی الکبیر بوجوبها. جہاں عشا کا وقت ہی نہ آئے یعنی شفق غائب ہونے سے پہلے ہی فجر طلوع ہوجائے، وہاں کے تعلق سے امام بقالی نے فتویٰ دیا ہے کہ سبب نہیں پائے جانے کی وجہ سے نماز فرض نہیں ہے۔ صاحب کنز نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام حلوانی نے پہلے اس کے خلاف کہا پھر امام بقالی کے موافق ہوگئے۔ امام برہان الدین کبیر نے فرض قرار دیا۔

تنویر الابصار و درمختار میں ہے:

وفاقد وقتهما کبلغار، فان فیها یطلع الفجر قبل غروب الشفق...... مکلف بهما فیقدر لهما...... به افتی البرهان الکبیر، واختاره الکمال،

وتبعه ابن الشحنة فی الغازه فصححه، وقیل لایکلف بهما لعدم سببهما، وبه جزم فی الکنز والدرر والملتقی، وبه افتی البقالی، ووافقه الحلوانی والمرغینانی ورجحه الشرنبلالی والحلبی۔ جس مقام پر وقت آئے ہی نہیں جیسے بلغار میں کچھ دنوں عشا کا وقت نہیں آتا ہے کیونکہ وہاں ان دنوں شفق غائب ہونے سے پہلے فجر طلوع ہو جاتا ہے، اس مقام کے تعلق سے برہان کبیر کا فتویٰ یہ ہے کہ عشا کی نماز فرض ہے۔ محقق علی الاطلاق نے اسی کو اپنایا ہے۔ ابن شحنہ نے انہی کا اتباع کیا ہے اور تصحیح کی ہے۔ مگر بعض حضرات نے سبب (وقت) نہ پائے جانے کی وجہ سے فرض نہیں مانا ہے۔ کنز، ملتقیٰ اور درر میں اسی پر جزم کیا ہے۔ امام بقالی نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ حلوانی اور مرغینانی نے ان کی موافقت کی ہے۔ شرنبلالی اور حلبی نے اسے ترجیح دی ہے۔

الغرض سارے فقہائے کرام کا یہ متفقہ فیصلہ ہوا کہ بلغار کے اندر گرمیوں کی چھوٹی راتوں میں ابھی شفق ابیض غائب نہیں ہو پاتی ہے، سپیدۂ سحر طلوع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عشا کا وقت نہیں آتا ہے اور یہ بات گزر چکی کہ بلغار کا عرض البلد اس زمانے کی رصدگاہ اور پیمائش کے مطابق ساڑھے انچاس درجے شمالی تھا اور ۲۲ر جون کی سب سے چھوٹی رات میں میل شمس شمالی کی مقدار ۲۳ر درجے ۳۳ر دقیقے تھی۔ پس آفتاب کو اٹھارہ درجے زیر افق ماننے کی صورت میں غروب شفق ابیض اور طلوع بیاض صبح دونوں ایک ساتھ ہو جاتے ہیں کیوں کہ:

عرض شمالی	49°30
میل شمس شمالی	- 23°33
بعد فوقانی	=25°57
بعد کوکب	+108°00
میزان	= 133°57
نصف	66°58'30

بعد کوکب ______ 108°00'00

نصف ______ -66°58'30

حاصل تفریق ______ = 41°01'30

سکنڈ عرض ______ +1874556

سکنڈ میل ______ + .0377672

سائن نصف ______ +9 .99639455

سائن حاصل تفریق ______ + 9 .8171608

مجموعہ اربعہ ______ = 9 .0063293

جیبی جدول سے شفق کی سفیدی غائب ہونے کا وقت 00-00

جیبی جدول سے صبح کی سپیدی نمودار ہونے کا وقت 00-00

لہٰذا رات کے بارہ بجے شفق کی سفیدی غائب ہوتے ہی صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی اور عشا کا وقت نہیں آیا۔ بدایۃ المجتہد، ج:۱ص:۹۶ میں ہے:

اختلفوا فی وقت العشاء الاخرۃ فی موضعین احدھما فی اولہ والثانی فی آخرہ. اما الاولیٰ فذھب مالک والشافعی وجماعۃ الی انہ مغیب الحمرۃ وذھب ابو حنیفۃ الی انہ مغیب البیاض الذی یکون بعد الحمرۃ وسبب اختلافھم فی ھذہٖ المسئلۃ اشتراک اسم الشفق فی لسان العرب فانہ کما ان الفجر فی لسانھم فجر ان کذالک الشفق شفقان، احمر وابیض ومغیب الشفق الابیض یلزم ان یکون بعدہ من اول اللیل اما بعد الفجر السمتدق فی اخر اللیل اعنی الفجر الکاذب، واما بعد الفجر الابیض المستطیرد تکون الحمرۃ نظیر الحمرۃ، فالطوالع اذ اربعۃ الفجر الکاذب، والفجر الصادق، والاحمر، والشمس، وکذالک یجب ان تکون الغوارب۔

عشائے آخر کے سلسلے میں دو اختلافات ہیں (۱) آغاز کے سلسلہ میں (۲) اختتام کے سلسلہ میں۔ آغاز کے سلسلہ میں اختلاف یہ ہے کہ امام مالک و امام شافعی کے نزدیک سرخی کے اختتام سے وقت عشا کا آغاز ہوتا ہے، امام ابو حنیفہ کے نزدیک سرخی کے بعد جو سفیدی ہوتی ہے اس کے اختتام پر وقت عشا کا آغاز ہوتا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ شفق بھی لفظ فجر ہی کی طرح دو معنوں میں مشترک ہے۔ (الف) شفق احمر (ب) شفق ابیض۔

شفق ابیض کی غیبوبت کے بعد لازمی طور سے رات کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ یونہی فجر مستدق یعنی صبح کاذب کے اختتام پر لازمی طور سے رات کی انتہا ہو جاتی ہے۔ فجر مستدیر کے بعد ویسی ہی سرخی نظر آنے لگتی ہے جیسی سرخی غروب آفتاب کے بعد نظر آتی ہے۔ پس سورج طلوع ہونے میں جس طرح سے چار حالتیں ہوتی ہیں (۱) فجر کاذب (۲) فجر صادق (۳) فجر احمر (۴) طلوع شمس، غروب ہونے میں بھی اسی طرح سے چاروں حالتیں ہونا لازمی ہیں۔

فتاویٰ رضویہ مترجم ج: ۱۰، ص: ۶۲۱ میں ہے:

صبح صادق کے لیے سالہا سال سے فقیر کا ذاتی تجربہ ہے کہ اس کی ابتدا کے وقت ہمیشہ ہر موسم میں آفتاب ۱۸ ؍ ہی درجہ زیر افق پایا ہے۔ تاج التوقیت از امام احمد رضا میں ہے:

انحطاط صبح صادق و شفق بر مذہب صحیح معتمد کہ بہ تجربہ و مشاہدہ قویہ و جماہیر متاخرین اہل ہیأت قدیمہ و جدیدہ را بر اں اجماع شدہ است ۱۸ ؍ بود۔ صبح صادق اور شفق کے وقت صحیح و معتمد مذہب کے مطابق آفتاب ۱۸ ؍ درجے زیر افق ہوتا ہے۔ یہ تجربہ اور قوی مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے۔ جمہور متاخرین اہل ہیئت قدیمہ و جدیدہ کا اس پر اجماع ہے۔

بہار شریعت میں ہے:

شفق ہمارے مذہب میں اس سفیدی کا نام ہے جو جانب مغرب میں سرخی ڈوبنے کے بعد جنوباً شمالاً صبح صادق کی طرح پھیلی ہوئی رہتی ہے اور یہ وقت ان شہروں میں کم سے کم

ایک گھنٹہ اٹھارہ منٹ اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ پینتس منٹ ہوتا ہے۔ (فتاویٰ رضویہ)

فقیر نے بھی اس کا بکثرت تجربہ کیا۔

وقت ان کا ان شہروں میں کم سے کم ایک گھنٹہ اٹھارہ منٹ اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ پینتس منٹ ہونا آفتاب کے افق سے اٹھارہ درجہ نیچے ہونے پر ہی ممکن ہے۔

ملک العلما مولانا سید محمد ظفر الدین صاحب مدرس ہیئت وحدیث شمس الہدیٰ پٹنہ اپنی کتاب ''الجواہر والیواقیت'' ص:۱۶۳ر میں لکھتے ہیں:

''آفتاب ہمیشہ طلوع صبح وغروب شفق ابیض کے وقت افق سے ۱۸ر درجے نیچے ہوتا ہے اور افق حقیقی کا ہر دو طرف سمت الراس سے ۹۰ر درجہ فاصلہ ہوتا ہے، تو ان دونوں وقت آفتاب کو سمت الراس سے ۱۰۸ر درجہ فاصلہ ہوتا ہے۔ یہ اس وقت آفتاب کا بعد سمتی ہے۔''

دوسری کتاب ''سلم السماء'' قلمی میں لکھتے ہیں:

''صبح صادق انتہائے عشا اور ابتدائے نماز فجر ہے اور شفق انتہائے مغرب اور ابتدائے عشا ہے۔ ان دونوں وقتوں میں آفتاب کا غایۃ الانحطاط اٹھارہ درجہ ہوتا ہے جس سے ثابت ہوا کہ نماز فجر کا وقت جس قدر ہے اتنا ہی نماز مغرب کا بھی اس لیے صبح سے لے کر طلوع تک آفتاب کو اٹھارہ درجہ طے کرنا ہے۔ اسی طرح غروب سے لے کر انتہائے شفق تک بھی اٹھارہ درجے طے کرنا ہے۔ تو مسافت ایک، چال ایک تو ضرورت بھی ایک ہی درکار ہوگی۔''

بحر العلوم مفتی سید محمد افضل حسین توضیح الافلاک ص:۶۲ پر لکھتے ہیں:

''تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اول صبح صادق اور آخر شفق ابیض کے وقت آفتاب افق سے پورے اٹھارہ درجے نیچے ہوتا ہے یعنی اس وقت افق اور مرکز شمس سے دائرۃ الارتفاع کی جو قوس مماس ہوتی ہے اس کی مقدار پورے اٹھارہ درجہ ہے۔''

اس فقیر نے بنگال میں مالدہ ضلع کے ''کلیا چک'' جس کا عرض البلد 24,54 اور طول البلد 88,06 ہے، وہاں اپنے جامعہ کے چند مدرسین اور طلبہ کو ساتھ لے کر گنگا ندی کے کنارے ۱۳/ اپریل، ۱۷/اپریل ۲۳/اپریل اور ۲۹/اپریل کو مشاہدہ کیا تو،

13 اپریل کو 58-3 منٹ پر

17 اپریل کو 54-3 منٹ پر

23 اپریل کو 48-3 منٹ پر

29 اپریل کو 42-3 منٹ پر

صبح صادق کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا، جس سے نگاہ کی قوت وضعف سے کسرات کے فرق کو چھوڑ کر اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ صبح صادق اس وقت ہوتی ہے، جب آفتاب افق مشرق سے اٹھارہ درجے نیچے ہوتا ہے۔

(۷) جدید ہیئت داں جن میں مسلم غیر مسلم سبھی ہیں، وہ بھی یہی بتا رہے ہیں، چنانچہ، تعین المواقیت فی ای زمان ومکان علی سطح الارض، مجلة البحوث الاسلامية المجلد الاول العدد الثالث، ۱۳۹۷ھ از ڈاکٹر حسین کمال الدین میں ہے:

وقد وجد بالاستقراء ان وقت الشفق ووقت الفجر يتساويان فی المكان الواحد تقريبا وانهما يرتبطان بحركة الشمس تحت الافق، وان ضوء الشمس الغير مباشر والمنعكس علی الغلاف الهوائی الارض ينتهی او يبدا عند ما تصل درجة ميل الشمس تحت الافق ۱۸/ كماهومبين بالشكل رقم (۱) ويظهر من الشكل ان شعاع الضوئی عند ما يقابل الغلاف الجوی الارضی بزاوية الاكبر من ۵، وهی الزاوية الحرجة فانه يسير الی الفضاء الخارجی ولا يصل الی سطح الارض ويستمر هكذا

حتی تصل ھذہ الزاویة الی المقدار ھو=۱۸، عند ذالک ینعکس الشعاع الشمسی علی الطبقة الھوایة (نقشہ) ویتجه الی سطح الارض حیث یبدء ظھور الفجر الصادق، ومثل ذالک یحدث عند انتھاء وقت الشفق، ای انه من الممکن اعتبار وجود الشمس تحت الافق الشرقی بقمدار ۱۸ بدایة لوقت الفجر، کما یمکن کذالک اعتبار وجود الشمس تحت الافق الغربی بقمدار ۱۸ ھونھایة وقت الشفق الابیض۔

استقرائی طور پر ثابت ہے کہ کسی مقام پر شفق کا جتنا وقت ہوگا فجر کا بھی اتنا ہی وقت ہوگا، کیوں کہ دونوں ہی کا تعلق تحت افق سورج کی حرکت سے ہے۔ آفتاب کی غیر مباشر اور ہوائی ارضی غلاف پر منعکس شعاع کا اختتام اور آغاز اس وقت ہوتا ہے جب میل شمس افق کے اٹھارہ درجے نیچے ہوتا ہے جیسا کہ نقشہ 1 سے واضح ہے اور اس شکل ہی سے یہ بھی ظاہر ہے کہ شعاع ضوئی جب زاویہ اکبرھ سے غلاف جوی ارضی کے مقابل ہوتا ہے تو فضا خارجی میں چلا جاتا ہے اور سطح زمین تک نہیں پہونچتا۔ لگاتار اسی طرح رہتا ہے یہاں تک کہ یہ زاویہ 18 کی مقدار کو پہونچ جاتا ہے۔ اس وقت سورج کی شعائیں طبقہ ہوائیہ پر منعکس ہوتی ہیں اور سطح زمین کی طرف آتی ہیں تو فجر صادق کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی صورت شفق کے اختتام کے وقت بھی ہوتی ہے۔ یعنی فجر کے وقت سورج 18 درجے افق شرقی کے نیچے ہوتا ہے جس طرح سے شفق ابیض کے اختتام کے وقت افق غربی کے 18 درجے نیچے ہوتا ہے۔

Minnaert,M, Natur of light & Coulor in the Open Air Dover, 1954 p.293

اردو میں ترجمہ: جب سورج ۲۰ درجے یا ۱۹/درجے زیر افق رہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا مشرقی افق پر ظاہر ہونے والی اہرام کی شکل وصورت والی بروجی روشنی کا قاعدہ

مزید اور پھیل گیا ہے اور اس کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ اس کی روشنی، اجالے چمک میں بھی اضافہ ہو گیا ہے اور یہ سلسلہ پھیلتے پھیلتے صبح کی شفق (Astronomical twiligh) واضح ہو جاتی ہے۔

انگریزی زبان میں جدید علم ہیأت (astronomi) کی کوئی بھی کتاب یا مقالہ ہو اس میں اس عنوان کے تحت درج ذیل قسم کی عبارت ضروری ہوتی ہے:

Twilight is the time between dawn and sunrise, and the time between snset and dusk. sunlight scattered in the upper atmosphere illuminates the lower atmosp her.

Twilight. ther are three kainds of twilight defined: sivil twilight, nautical twilight, and astronomical twilight. for computational purposed, civil twilight begins befor sunrise and ends after sunset when the geometric zenith distance of the center of the sun is 90 degrees -6 degrees below a horizontal plane. the corresponding splar zenith distances for nautical and astronomical twilight are 102 and 108 degrees, respectively. that is, at the dark limit of nautical twilight, the senter of the sun is geometrically 12 degrees below a horizontal plane,

and at the dark limit of sastronomical twilight, the cneter of the sun is geometrically 18 degrees below a horizontal plane.

Twilight: سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے لے کر طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے لے کر رات کی تاریکی چھانے تک کا وقت کو twilight کہتے ہیں۔اس وقت کا دھندلا فضا کے اوپر سورج کی پھیلی ہوئی روشنی کی مرہون منت ہے۔ twilight کی تین قسمیں ہیں:

astronomical(۳) nautical twilight(۲) sivil twilight (۱) twilight.

siveil twilight کا آغاز، سورج کے مشرقی افق (۹۰ ڈگری) کی سطح سے ۶ رڈگری کے قریب آجانے اور اختتام، مغربی افق (۹۰رڈگری) کی سطح سے ۶ رڈگری دور ہوجانے پر ہوتا ہے۔یعنی اس وقت سمت الرأس سے آفتاب کی دوری ۹۶رڈگری ہوتی ہے۔اسی طرح nautical twilight کا آغاز، سورج کے مشرقی افق (۹۰رڈگری) کی سطح سے ۱۲رڈگری قریب آجانے اور اختتام، مغربی افق (۹۰رڈگری) کی سطح سے ۱۲رڈگری دور ہوجانے پر ہوتا ہے۔ یعنی وقت سمت الرأس سے آفتاب کی دوری ۱۰۲ر ڈگری ہوتی ہے۔ یونہی astronomical twilight کا آغاز، سورج کے مشرقی افق (۹۰ ڈگری) کی سطح سے ۱۸ر ڈگری قریب آجانے اور اختتام، مغربی افق (۹۰ ڈگری) کی سطح سے ۱۸رڈگری دور ہوجانے پر ہوتا ہے۔یعنی اس وقت سمت الرأس سے آفتاب کی دوری ۱۰۸رڈگری ہوتی ہے۔

شبہ: شرح چغمنی میں تو یہ ہے کہ سورج جب افق سے اٹھارہ درجے نیچے رہتا ہے، صبح کا آغاز اور شفق کا اختتام ہوتا ہے:

وقد عرف بالتجربة بان اول الصبح و آخر الشفق انما یکون اذا کان انحطاط الشمس ثمانیة عشر جز ۔تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ صبح کا آغاز اور شفق کی انتہا کے وقت انحطاط شمس کی مقدار ۱۸؍ڈگری ہوتی ہے۔

مگر صبح سے مراد صبح صادق نہیں، بلکہ صبح کاذب ہے۔ کیونکہ اس عبارت کے فوراً بعد اس پر جو تفریع کی گئی ہے اس میں صبح کے ساتھ کاذب کی صراحت ہے۔

ففی بلد یکون عرضہ اقل من تمام المیل ثمانیة عشر جز یتصل الشفق بالصبح الکاذب اذا کانت الشمس فی النقلب الصیفی ۔جس مقام کا عرض البلد تمام میل سے ۱۸؍ڈگری کم ہوگا، وہاں جب سورج منقلب صیفی میں ہو تو شفق صبح کاذب سے مل جائے گی اور تصریح الافلاک میں صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ ابتدائے صبح کاذب اور انتہائے شفق کے وقت سورج افق سے ۱۸؍ڈگری نیچے رہتا ہے:

اذ قدم علم بالتجربة ان انحطاط الشمس اول الصبح الکاذب و آخر الشفق ثمانیة عشرة درجة من دائرة ارتفاء الشمس بمرکز ھاففی عرض مح ل ای ثمانیة واربعون درجة وثلثون دقیقة یتصل الشفق بالصبح الکاذب اذا کانت الشمس فی المنقلب الصیبی اذ غایة انحطاطھا عنه لایزید علی ثمانیة عشرة درجة۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اول صبح کاذب اور آخر شفق کے وقت افق (۹۰ ڈگری) سے انحطاط شمس کی مقدار ۱۸؍ڈگری ہوتی ہے۔ تو جو مقام ساڑھے اڑتالیس ڈگری عرض البلد پر ہے، وہاں سورج جب منقلب سیفی میں ہوگا، شفق صبح کاذب سے مل جائے گی کیونکہ اس سے انحطاط شمس کی غایت مقدار اٹھارہ ڈگری سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔

ازالۂ شبہ: شرح چغمینی ہو یا تشریح الافلاک، ان کتابوں میں کتابت کی غلطی سے الکاذب کا

لفظ بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ دونوں ہی کتابوں میں پہلے یکے بعد دیگر صبح وشفق کو بیان فرمایا گیا ہے کہ صبح:
(۱) پہلے مشرقی افق سے کچھ اوپر اٹھتا ہوا روشنی کا ایک مخروط سا نظر آتا ہے، جس کو صبح کاذب کہتے ہیں۔
(۲) اس کے بعد جب کچھ اور قریب ہو جاتا ہے تو جائے طلوع سے اتر دکھن نصف دائرہ کی طرح روشنی کی ایک پٹی سی نظر آتی ہے، جس کو صبح صادق کہتے ہیں۔
(۳) پھر جب اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے، تو افق پر سرخی چھا جاتی ہے۔
(۴) اس کے بعد سورج طلوع ہوتا ہے۔

شام کو اس کے برعکس:

(۱) پہلے سورج غروب ہوتا ہے۔
(۲) پھر جب سورج افق سے کچھ دور ہو جاتا ہے، تو سرخی چھا جاتی ہے۔
(۳) اس کے بعد جب کچھ اور دور ہو جاتا ہے، تو سرخی غائب ہو کر جائے غروب سے اتر دکھن نصف دائرہ کی طرح روشنی کی ایک پٹی سی نظر آتی ہے۔
(۴) پھر جب اور زیادہ دور ہو جاتا ہے تو وہ پٹی غائب ہو کر افق سے کچھ اوپر اٹھتا ہو، روشنی کا ایک مخروط سا نظر آتا ہے۔

الغرض افق سے سورج کی جتنی دوری پر صبح کا آغاز ہوتا ہے اتنی ہی دوری پر شفق کا اختتام ہوتا ہے۔ اب اگر ۱۸ر ڈگری کی دوری پر صبح کاذب (جب مشرقی افق سے کچھ اوپر اٹھتا ہوا روشنی کا ایک مخروط سا نظر آتا ہے) کا آغاز ہو، تو ۱۸ر ہی ڈگری پر افق سے کچھ اوپر اٹھتا ہو روشنی کے اس مخروط کا اختتام بھی ہوگا، جو جائے غروب سے اتر دکھن نصف دائرہ کی طرح روشنی پھیلی ہوئی پٹی جسے شفق ابیض کہتے ہیں، غائب ہونے کے بعد نظر آتا ہے۔

اور اس صورت میں صبح کاذب، شفق ابیض غائب ہونے کے بعد افق سے کچھ اوپر اٹھتا ہو روشنی کا مخروط کے ظہور سے متصل ہوگا، شفق ابیض سے نہیں۔ اس لیے فنی اور مذہبی دونوں ہی اعتبار

سے یہ کہنا لغو ہوگا کہ ''جو مقام ساڑھے اڑتالیس ڈگری عرض البلد پر ہے، وہاں سورج جب منقلب سیفی میں ہوگا، شفق صبح کاذب سے مل جائے گی''

فنی اعتبار سے لغو اس لیے ہوگا کہ اہل فن نے تجربے کر کے مشرق کی بیاض مستطیل ومنتصب ہو یا مغرب کی بیاض مستطیل ومنتصب، ان کے جاننے کے لے قواعد بنائے ہی نہیں۔ کیوں کہ یہ اوقات عادۃً سورہنے اور نیند کے مزے لینے کے ہیں، کام کاج کرنے اور بیدار رہنے کے نہیں، جیسا کہ قانون مسعودی میں ہے:

ولها مستدق مستطيل منتصب يعرف بالصبح الكاذب ويلقب بذنب السرحان ولا يتعلق به شئى امن العادات الرسمية. والثالث المستطيل المتصب الموازى لذنب السرحان، وانما لايتنبه الناس له لان وقته عند اختتام الاعمال واشتغالهم بالاكتنان ۔پہلی صبح متدق ومستطیل اور منتصب ہوتی ہے، اس کو صبح کاذب اور ذنب سرحان کہتے ہیں۔ انسانی عادات اس سے متعلق نہیں ہیں۔ تیسری شفق اس کے متوازی مستطیل ومنتصب ہوتی ہے، وہ وقت کام کاج نپٹا کر سونے اور آرام کرنے کا ہوتا ہے، اس لیے لوگ اس سے واقف نہیں ہیں۔

مذہبی اعتبار سے لغو اس لیے ہوگا کہ شفق ابیض غائب ہوتے ہی عشا کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اس کے بعد افق سے کچھ اوپر اٹھتا ہو روشنی کا مخروط کے ظہور کا وقت بھی عشا ہی کا وقت ہوتا ہے اسی طرح صبح کاذب بھی وقت عشا ہی کا حصہ ہے، تو ملنے نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اسی لیے شرح چغمنی کے محشی علامہ عصمت سہارن پوری نے بھی اپنے حاشیہ میں اس غلطی پر تنبیہ کی ہے، لکھا ہے: **الظاهر ان يقول اول الصبح بدون الكاذب كما فى عبارة القوم**، ظاہر کے مطابق صبح کاذب کی بجائے صرف صبح کہنا چاہیے تھا جیسا کہ عام ماہرین ہیأت کی عبارتوں میں ہے۔

شبہ: جمہور ہیأت دانوں کی تصریحات اور مندرجہ بالا شواہد وقرائن کے علاوہ فقہائے کرام کے

بیانات سے تو ثابت ہو گیا کہ سورج جب افق سے ۱۸؍ڈگری نیچے پہونچتا ہے تو صبح صادق کا آغاز اور شفق ابیض کا اختتام ہوتا ہے، شرح چغمینی اور تصریح میں کتابت کی غلطی سے صبح کے ساتھ کاذب کا اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن شرح چغمینی کے حاشیہ میں تو یہ صراحت بھی ہے کہ صبح صادق کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب آفتاب افق کے ۱۵؍ڈگری سے نیچے آجائے۔

ابتدا الصبح الصادق فقد قیل ان انحطاط الشمس ح خمسة عشر جزء۔

کہا گیا ہے کہ آغاز صبح صادق کے وقت انحطاط شمس کی مقدار ۱۵؍ڈگری ہوتی ہے۔

ازالۂ شبہ: پہلی بات یہ کہ حاشیہ شرح چغمینی اور ردالمحتار کی نقل کے مطابق صبح صادق کا آغاز اس وقت ہو جب سورج افق مشرق سے پندرہ درجے نیچے ہوتا ہے تو شفق ابیض کا اختتام بھی لامحالہ اسی وقت ہوگا جب سورج افق مغرب سے پندرہ درجے نیچے چلا جائے اور اس صورت میں فقہائے کرام کے اس متفقہ فتویٰ کو غلط قرار دینا ہوگا جس میں بتایا گیا ہے کہ انچاس درجے تیس دقیقے عرض البلد میں گرمیوں کی چھوٹی راتوں میں عشا کا وقت نہیں آتا ہے، کیوں کہ شفق کی سفیدی غائب نہیں ہو پاتی ہے کہ صبح کی سپیدی نمودار ہو جاتی ہے، جیسے:

عرض شمالی ______ 49°30

میل شمس شمالی ______ 23°33 -

بعد فوقانی ______ 25°57=

بعد کوکب ______ 105°00+

میزان ______ 130°57 =

نصف ______ 65°28'30

بعد کوکب ______ 105°00'00

نصف ______ -65°28'30-

حاصل تفریق ______ 39°31'30 =

سکنڈ عرض ______ +1874556+

سکنڈ میل ______ .0377672 +

سائن نصف ______ 9589365. 9+

سائن حاصل تفریق ______ 9 .8037402 +

مجموعہ اربعہ ______ 9 .9878995 =

جیبی جدول سے شفق کی سفیدی غائب ہونے کا وقت 22-43-40

جیبی جدول سے صبح کی سپیدی نمودار ہونے کا وقت 01-16-20

تو شفق کی سفیدی رات کے ۱۰ ربج کر ۴۳ منٹ ۴۰ سکنڈ پر غائب ہوگی اور صبح کی سپیدی ار بج کر ۱۶ رمنٹ ۲۰ سکنڈ پر نمودار ہوگی اور عشا کا وقت نہیں ہوگا بلکہ ۲ رگھنٹے ۳۲ منٹ ۴۰ سکنڈ رہے گا۔ دوسری بات یہ کہ درجات کے تعین کا تعلق چونکہ رویت ومشاہدہ سے ہے اور رویت ومشاہدہ میں مقام، موسم اور نظر کی تیزی سے فرق ہو جاتا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ سورج جس وقت پندرہ درجے افق شرقی سے زیادہ فاصلہ پر تھا کسی کو صبح کی سپیدی نظر نہ آئی ہو، اسی طرح سورج جب افق غربی میں پندرہ درجہ سے دور ہو، تو کسی کی نگاہ سے شفق اوجھل ہوگئی ہو۔ اسی لیے علما فرماتے ہیں کہ اثبات کے مقابلہ میں نفی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

کل بینة قامت علی ان فلانا لم یقل، لم یفعل، لم یقر (لاتقبل الشهادة) کذا فی الحیط۔ یہ گواہی نہیں مانی جائے گی کہ فلاں شخص نے یہ بات نہیں کہی ہے یا یہ کام نہیں کیا ہے یا اس چیز کا اقرار نہیں کیا ہے، محیط میں ایسا ہی ہے۔

تنویر الابصار و درمختار میں ہے:

(لایعتق عبد قیل لہ ان لم احج العام فانت حر) ثم قال حججت وانکر العبد واتیٰ بشاھدین (فشھد ابنحرہ) لاضحیتہ (بکوفۃ) لم تقبل لقیامھا علی نفی الحج، اذا التضحیۃ لاتدخل تحت القضاء۔

مالک غلام سے کہے کہ میں امسال حج نہ کروں، تو تم آزاد، بعد میں کہے کہ میں نے حج کرلیا اور غلام انکار کرتے ہوئے دو گواہ پیش کرے، جو گواہی دیکہ امسال مالک نے کوفہ میں قربانی کی ہے، تو یہ گواہی نہیں مانی جائے گی اور غلام آزاد نہیں ہوگا کیوں کہ اس کی گواہی کا مقصد اس کے حج کرنے کی نفی ہے۔

ردالمحتار ج ۵ مکتبہ زکریا ص: ۶۴۵ میں ہے:

قولہ: (لم تقبل الخ) ای عندھما، لانھا قامت علی النفی، لان المقصود منھا نفی الحج لا اثبات التضحیۃ، لانھا لا مطالب لھا فصار کما اذا شھدوا انہ لم یحج ۔ یہ گواہی اس لیے مانی نہیں جائے گی کہ یہ نفی پر گواہی ہے کیوں کہ مقصود حج کی نفی کرنا ہے، قربانی ثابت کرنا نہیں۔ کیوں کہ قربانی کا مطالبہ ہی نہیں ہے۔ تو کوفہ میں قربانی کرنے کی گواہی معنی اس بات کی گواہی ہوگئی کہ اس نے حج نہیں کیا۔

شاید یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر محشی نے اسے ''قیل'' یعنی ''کہا گیا ہے'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

ابتداء الصبح الصادق فقد قیل ان انحطاط الشمس ح مسۃ عشر جزء۔ کہا گیا ہے کہ آغاز صبح صادق کے وقت انحطاط شمس کی مقدار ۱۵ ڈگری ہوتی ہے۔

جو اس کے قول ضعیف ہونے کی علامت ہے۔

(۸) عادت کے مطابق انسان صبح صادق کے وقت ہی اُٹھ کر اپنے اپنے کام کاج کی تیاری میں لگ جاتے تھے اور شفق ابیض کے غائب ہونے تک سوتے نہیں تھے اس لیے قدیم ہیأت کے ماہرین نے صبح صادق کی ابتدا اور شفق ابیض کی انتہا جاننے کے لیے اصول وضابطے مقرر کیے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کے مطابق نماز فجر کی ابتدا اور روزے میں سحری کی انتہا کا وقت افق شرقی میں جائے طلوع سے اتر دکھن قوس نما روشنی کی ایک سفید پٹی سی نظر آنے یعنی آغاز صبح صادق سے متعلق ہے، اسی طرح نماز مغرب کی انتہا اور نماز عشا کی ابتدا کا وقت افق غربی میں جائے غروب سے اتر دکھن قوس نما نظر آنے والی روشنی کی سفید سی پٹی کے غائب ہو جانے یعنی انتہائے شفق ابیض سے متعلق ہے، تو ہر چند کہ ماہرین ہیأت کی بات پر اعتماد روا تھا، پھر بھی فقہائے احناف نے خود تجربے کیے جن سے ماہرین ہیأت کے قول کی تصدیق ہوگئی کہ واقعۃً آفتاب جب افق شرقی سے اٹھارہ درجہ نیچے رہتا ہے تو جائے طلوع سے اتر دکھن قوس نما روشنی کی ایک سفید سی پٹی نظر آتی ہے اور افق غربی سے اٹھارہ درجہ نیچے چلا جاتا ہے تو جائے غروب سے اتر دکھن پیدا شدہ قوس نما نظر آنے والی روشنی کی سفید سی پٹی غائب ہو جاتی ہے۔

مشرقی افق پر سرخی چھانے کی ابتدا اور مغربی افق پر شفق احمر کی انتہا سے کوئی ضرورت متعلق نہیں تھی، اس لیے ان کو جاننے کے اصول وضابطے نہیں بتائے۔ البتہ بعض حضرات جن کو سورج کے ۱۸ ڈگری زیر افق رہنے پر صبح صادق کا ظہور اور شفق ابیض کی غیبوبت کا مشاہدہ نہ ہو کر ۱۵ ڈگری زیر افق نے پر مشاہدہ ہوا تھا، انہوں نے بتایا کہ شفق احمر اور شفق ابیض کی غیبوبتوں کے درمیان ۳ ڈگری کا فرق ہوتا ہے جیسا کہ علامہ شامی نے ردالمحتار ج:۱، ص:۲۴۰ میں نقل فرمایا ہے:

فائدة: ذكر العلامة المرحوم الشيخ خليل الكاملي في حاشيته على رسالة الاسطرلاب لشيخ مشائخنا العلامة المحقق على آفندى الداغستاني: ان ا لتفاوت بين الفجرين و كذا بين الشفقين الاحمر و الابيض انما هو بثلاث درج ا۔

علامہ شیخ خلیل کاملی مرحوم نے ہمارے شیخ المشائخ علامہ محقق علی آفندی داغستانی کے رسالہ اسطرلاب کے حاشیہ میں بیان کیا ہے کہ دونوں فجر، یوں ہی احمر و ابیض دونوں شفق کے مابین تین تین ڈگری کا تفاوت ہوتا ہے۔

اس تقدیر پر آفتاب مغربی افق سے 12=03-15 نیچے پہنچتا ہے تو شفق احمر غائب ہوکر شفق ابیض کا ظہور ہوتا ہے۔ جدید ہیأت دانوں نے تجربہ کیا تو ان کے تجربے میں بھی یہی آیا کہ سورج افق سے ۱۲ر ڈگری کے فاصلے پر پہونچ جائے تو شفق احمر غائب ہوکر شفق ابیض کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس موضوع پر انگریزی زبان کی تمام کتابوں اور مقالوں میں یہ یا اس سے ملتے جلتے الفاظ پائے جاتے ہیں:

that is, at the dark limit of nautical twilight, the center of the sun is geometrically 12 degrees below a horizontel plane.

nautical twilight کا آغاز، سورج کے مشرقی افق (۹۰ر ڈگری) کی سطح سے ۱۲ر ڈگری قریب آجانے اور اختتام، مغربی افق (۹۰ ڈگری) کی سطح سے ۱۲ر ڈگری دور ہوجانے پر ہوتا ہے۔ یعنی اس وقت سمت الرأس سے آفتاب کی دوری ۱۰۲ر ڈگری ہوتی ہے۔

الغرض متذکرہ بالا قدیم ہیأت دانوں کے ساتھ جدید ہیأت داں بھی متفق ہیں کہ سورج افق سے ۱۲ر ڈگری کے فاصلے پر پہنچ جائے تو شفق احمر غائب ہوکر شفق ابیض کی ابتدا ہوتی ہے۔ عقل کے قریب بھی یہی ہے کہ اختتام شفق اور طلوع آفتاب تک تین مدارج ہیں، تو ہر حصہ ۶، ۶ ہی درجہ ہونا چاہیے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کے مطابق افق شرقی میں سرخی چھا جانے اور افق غربی سے سرخی کے غائب ہوجانے سے کوئی حکم بھی متعلق نہیں ہے، تو فقہائے احناف نے اسے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی، اس لیے انہوں نے خود اس کا تجربہ کرکے فنی اعتبار سے ضابطہ واصول نہیں بتایا۔ جیسا کہ فقہ کی متداول کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں آنے سے سمجھ میں آتا ہے۔

جن مقامات پر کچھ دنوں افق مغرب میں جائے غروب سے اتر دکھن قوس نما روشنی کی سفید پٹی غائب نہیں ہو پاتی ہے کہ افق شرقی پر جائے طلوع قوس نما روشنی کی ایک سفید سی پٹی نمودار ہو جاتی ہے یعنی امام اعظم کے مذہب پر مغرب کا وقت ختم ہوتے ہی فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور عشا کا وقت نہیں آپاتا، ان مقامات پر بعض فقہائے احناف کے نزدیک عشا کی نماز فرض ہی نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا وہاں عشا کی نماز نہ پڑھنے والے گنہ گار نہیں ہوں گے۔ بعض فقہائے احناف کے نزدیک تقدیراً فرض ہوتی ہے تو قضا پڑھی جائے گی اور نہ پڑھنے والے گنہ گار ہوں گے۔ جیسا کہ بحر الرائق، فتح القدیر اور تنویر ا ردالمختار کے حوالوں سے گزرا۔

ادھر امام شافعی کے علاوہ خود امام اعظم کے شاگرد امام ابو یوسف و امام محمد علیہم الرحمۃ والرضوان کے مسلک کے مطابق افق غربی میں چھائی سرخی غائب ہوتے ہی عشا کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے تو عشا کی نماز بہر حال فرض ہوگی اور جو لوگ ادا نہ کریں گے وہ گنہ گار ٹھہریں گے۔

لہٰذا تقاضائے احتیاط یہی ہے کہ عشا کی نماز پڑھ لی جائے تا کہ بالیقین بری الذمہ ہوا جا سکے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ نماز کب پڑھی جائے؟ معمول کے برخلاف آدھی رات کے بعد یا معمول کے مطابق ہمیشہ کی طرح رات سے پہلے؟ اس کے برخلاف آدھی رات کے بعد پڑھی جائے تو فریضہ تو بالاتفاق ساقط ہو جائے گا مگر روزانہ اس وقت تک نماز کا انتظار گی۔

ترمذی میں ہے:

لولا ان اشق علی امتی.......... لاخرت العشاء الی ثلث الیل - مجھے اپنی امت کی مشقتوں کا لحاظ ہے ورنہ میں تہائی رات تک عشا کی نماز کو مؤخر کر دیتا۔

ساتھ ہی امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد علیہم الرحمۃ کے مسلک کے مطابق دانستہ قضا کرنا بھی لازم آئے گا جس سے گناہ کے مرتکب ہوں گے اس کے علاوہ سحری و عشا کے اختتام کا وقت بھی ایک نہیں رہے گا۔ جب کہ معمول کے مطابق ہمیشہ کی طرح آدھی رات سے پہلے پڑھ لی جائے،

جو حضرات تقدیراً وجوب قضا کے قائل ہیں، ان کے نزدیک اگر چہ عشا کی نماز نہیں ہوگی اور فریضہ باقی رہ جائے گا کیوں کہ وقت تقدیری ہی نماز واجب ہونے کا سبب ہوگا اور سبب سے پہلے مسبب کا وجود نہیں ہوسکتا، مگر روزانہ آدھی رات تک انتظار کی کلفت اور حرج ومشقت سے نجات مل جائے گی، امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد علیہم الرحمۃ کے مسلک کے مطابق نماز اپنے وقت ہی پر ادا ہوگی اور گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے، ساتھ ہی عشا و سحری کے اختتام کا وقت ایک ہی رہے گا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ شفق احمر کے اختتام کا وقت معلوم کرنے کے لیے تجربہ کیا جائے، مگر موافق مقام، موسم اور فضا کا حال معلوم کرنا آسان نہیں اس لیے جو لوگ رصد گاہ (گرین وچ) کے قریب ہیں، وہ چاہیں تو ارباب رصد سے رابطہ کر کے تجربہ کر سکتے ہیں، ورنہ ہم فقہی اصول کے حوالہ سے لکھ آئے ہیں کہ رصد گاہ والوں کے تجربہ پر اعتماد کر کے عمل کر لینا کافی ہے۔

اس فقیر نے بنگال میں ضلع مالدہ کے ''کلیا چک'' جس کا عرض البلد 24,54 اور طول البلد 88,06 ہے وہاں اپنے جامعہ کے چند مدرسین کو ساتھ لے کر گنگا ندی کے کنارے ۱۲ر اپریل، ۱۶ر اپریل، ۲۱ر اپریل اور ۲۸ر اپریل کو مشاہدہ کیا تو:

12 اپریل کو 12-19 منٹ پر

16 اپریل کو 14-19 منٹ پر

21 اپریل کو 17-19 منٹ پر

28 اپریل کو 20-19 منٹ پر

شفق احمر کو غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ جس سے نگاہ کی قوت وضعف سے کسرات کے فرق کو چھوڑ کر اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ شفق احمر اس وقت غائب ہوگی جب آفتاب افق مغرب سے بارہ درجے نیچے چلا جاتا ہے۔

اس بنیاد پر بلغار میں ۲۲ر جون کو:

عرض شمالی ______ 49°30`00

میل شمس شمالی ______ 23°33`00 -

بعد فوقانی ______ 25°57`00=

بعد کوکب ______ 102°00`00+

میزان ______ 127°57`00 =

نصف ______ 63°58`30

بعد کوکب ______ 102°00`00

نصف ______ 63°58`30-

حاصل تفریق ______ 38°01`30 =

سکنڈ عرض ______ 10.1874558

سکنڈ میل ______ 10.0377672

سائن نصف ______ 9 .9535677+

سائن حاصل تفریق ______ 9`7895844 +

مجموعہ اربعہ ______ 9`9683951 =

جیبی جدول سے شفق کی سرخی غائب ہونے کا وقت ___ 09-57-00

تو

24-00-00

-21-57-00

=02-03-00

لہٰذا رات کے نو بج کر ستاون منٹ کے بعد سے بارہ بجے کے پہلے تک عشا کی نماز پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح بارہ بجے رات تک سحری بھی کھا سکتے ہیں۔ یعنی سحری کا وقت ختم ہونے سے پہلے دو گھنٹے تین منٹ عشا کا وقت مل جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

○ ○ ○

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی
۱۰۴، جسولی۔ بریلی شریف

'الدولۃ المکیہ' میں شامل الجبراء کی تھیوریوں کا تجزیاتی مطالعہ

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی ۱۰ر شوال المکرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء بریلی شریف میں پیدا ہوئے اور یہیں ۲۵ صفر المظفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو انتقال فرمایا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا تقریباً ۷۵ نقلی اور عقلی علوم فنون میں اس طور حاوی تھے کہ ہر علم وفن میں انہیں محققانہ حیثیت حاصل تھی۔ انہیں علوم وفنون پر آپ نے ۱۲۰۰ر کے قریب کتب ورسائل اور حواشی تصنیف فرمائے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ العزیز تمام دینی ونقلی علوم وفنون میں ید طولیٰ رکھنے کے ساتھ ساتھ متعدد سائنسی، ریاضیاتی، تجارتی اور معاشی ودیگر عقلی علوم وفنون میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ علم ریاضی میں آپ کو خصوصیت کے ساتھ زبردست مہارت حاصل تھی۔ آپ نے ریاضی کی مختلف برانچوں مثل ارثماطیقی (Aritheanethe)، ابتدائی، جدید اور ہائر الجبرا، اقلیدس (Euelidiam\n Geometry) لوگارثم (Logarithms)، مثلث مسطح (Plane Trigonometry) مثلث کروی (Spherical Trigononetry)، کوآرڈی ینٹ

جیومٹری، نجوم (Astrology)، ہیئت (Astronomy)، توقیت (Timings) ثماریات (statrsties)، حرکیات (Dymamics)، سکونیات (Stathes) وغیرہ۔

علم ریاضی میں اعلیٰ حضرت، امام احمد رضا نے ۸۱؍ کتب و رسائل اور حواشی تصنیف فرمائے ہیں۔ ان میں زیادہ تر کتابیں عربی اور فارسی میں ہیں، اردو میں ان کی تعداد کم ہیں۔ افسوس ان میں؟ چند ہی دستیاب ہیں۔ بقیہ غیر مطبوعہ ہیں۔

ان کتب و رسائل اور فتاویٰ رضویہ کی مختلف جلدوں، فوز مبین، الکلمۃ الملہمہ، معین مبین اور الدولۃ المکیہ وغیرہ میں بھی آپ کے ریاضیاتی اصول ونظریات اور تھیوریاں پائی جاتی ہیں۔

راقم زیرِ نظر مقالہ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی معرکۃ الآرا تصنیف ''الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ'' کے حوالے سے دو الجبرائک تھیوریوں سیٹ تھیوری (set theory) اور ٹاپالوجی (Topology) میں ان کی مہارت کا ایک جائزہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں جب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا اپنے دوسرے حج کے لیے تشریف لے گئے تھے تو اسی موقع پر مکہ معظّمہ میں حرمین طیبین نیز دیگر بلاد اسلامیہ کے علما و مشائخ نے آپ سے حضور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے اثبات میں کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ آپ نے مکہ معظّمہ میں بزبان عربی ''الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ'' نامی کتاب آٹھ گھنٹے میں تصنیف فرمائی تھی۔ زیرِ نظر کتاب میں آپ نے قرآن واحادیث اور اقوال ائمہ وعلما کے حوالے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کا ثبوت دینے کے باوصف الجبرا کی دو مشہور تھیوریوں، سیٹ تھیوری اور ٹاپالوجی کو بروئے کار لا کر بھی پیغمبر اسلام، نبی امی علیہ التحیۃ والثناء کا علم غیب ثابت کیا تھا اور یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آپ کا علم غیب مخلوقات الٰہیہ میں سب سے زیادہ بلند مقام پر تھا جو کہ عالم الغیب والشہادۃ اللہ عزوجل نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔

سیٹ تھیوری (Set Theory): سیٹ تھیوری جدید الجبرا کی ایک اہم برانچ ہے۔ جارج کینٹر (George Canter) نامی ایک جرمن ریاضی داں (پ ۱۹۴۸ء) نے اس تھیوری کو ۱۹؍ویں صدی کی آٹھویں دہائی میں متعارف کرایا تھا۔ البتہ یہ تھیوری مکمل طور سے ۲۰ ویں صدی

کے اواخر میں عام ہوئی۔ سیٹ تھیوری کسی چیز کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ جارج کیئر نے سیٹ کی تعریف اس طرح کی ہے:

"Aset is a collection into a whole of definite, distinet and distmg uishable of jects of our perception or thoughts"

یعنی سیٹ ہمارے سوچے ہوئے کسی متعین، خاص اور قابل شناخت اشیا کا مجموعہ ہے۔ یعنی سیٹ اشیا ہندسوں وغیرہ کا مرتب مجموعہ ہے۔ جو اعداد، اشیا وغیرہ سیٹ کی تشکیل کرتے ہیں انہیں ارکان (Elements) کہتے ہیں۔ مثال:

۱ اگر ہم یہ کہیں کہ ۱، ۲، ۳، ۴ حقیقی اعداد کا سیٹ ہے۔ اسے ہم اس طرح لکھیں گے:

س = (۱، ۲، ۳، ۴) یہاں اس سے مراد ہے "سیٹ" اور ۱، ۲، ۳، ۴ اس سیٹ کے ارکان ہیں۔

۲ حروف تہجی۔ ا، ب، پ، ت وغیرہ کا سیٹ: س = (ا، ب، پ، ت......) پورے حروف تہجی کا سیٹ

۳ اسی طرح پھلوں کا سیٹ: س = (آم، انگور، سیب، سنگترہ، کیلا)

سیٹ کے اقسام:

۱ متناہی سیٹ (Finite set):

مثلاً: (۱) سیٹ (۱، ۳، ۹، ۲۷) متناہی سیٹ ہے کیوں کہ ارکان کی تعداد چار ہے۔

(۲) سیٹ (۳، ۵، ۷ ۔ ۔ ۔ ۱۳) متناہی سیٹ ہے کیوں کہ ارکان کی تعداد متناہی یعنی چھ ہے۔

۔ غیر متناہی سیٹ (Infinite Set):

۱۔ (الف) ایک سیٹ غیر متناہی ہے اگر وہ متناہی نہیں ہے۔

ب۔ کسی سیٹ کو قابل شمار غیر متناہی کہیں گے اگر وہ قابل شمار (Countable) ہے، اگر وہ متناہی ہے یا قابل شمار غیر متناہی ہے (Contable infini)۔

(۲) ناقابل شمار سیٹ (un conunabreset): کسی سیٹ کو ناقابل شمار سیٹ کہیں گے اگر اس کے ارکان ناقابل شمار ہیں۔

(۳) واحد سیٹ(singleton set): وہ سیٹ جس میں صرف ایک ہی رکن ہو۔
(۴) خالی سیٹ(Null or Empty Set): وہ سیٹ جس میں کوئی رکن نہ ہو، جدید ریاضی میں اسے فائی (ɸ) سے ظاہر کرتے ہیں۔
مثلاً: یک ہندسہ جو ۴ سے بڑا ہو اور ۵ سے چھوٹا ہو۔ اس کے سیٹ کو خالی سیٹ کہتے ہیں یا اگر یہ کہا جائے کہ س = (ی) ایک سیٹ ہے جہاں ی موجودہ عہد میں ایک ایسا آدمی ہے جس کی عمر ۴۰۰ سال ہے تو یہ سیٹ ''خالی سیٹ'' کہلائے گا۔
تحتی سیٹ(Sub Set):
اگر کسی سیٹ 'الف' کا ہر رکن 'ب' کا رکن ہو تو 'الف' کو 'ب' کا تحتی سیٹ کہیں گے۔ اسے اس طرح لکھیں گے۔

ب ایا د ب

مثال: (ا) اگر سیٹ الف = (۲،۴،۸) اور سیٹ ب = (۲،۳،۶،۸،۱۰) تو الف۔ب کا تحتی سیٹ ہوگا اس لیے کہ الف کا ہر رکن ب میں شامل ہے۔
درجہ گیارہ کے طلبہ کا سیٹ، کالج کے طلبہ کا تحتی سیٹ ہوگا۔
نوٹ: ہر سیٹ خود کا بھی تحتی سیٹ ہوتا ہے۔
(۲) خالی سیٹ فائی (ɸ) ہر سیٹ کا تحتی سیٹ ہے۔
تحتی سیٹ کے اور بھی اقسام ہیں جیسے پرابر سب سیٹ(propersubset) مجموعہ سیٹ (Colletion of sets) یا فیملی آف سیٹس(Famly of sets) پاور سیٹ (power set) وغیرہ!
سیٹوں کا اتصال(union of the sets): دو سیٹوں 'الف' اور 'ب' کا اتصال ان دونوں کے ارکان کا سیٹ ہوتا ہے۔ اس کو ظاہر کرنے کے لیے U بطور علامت استعمال کرتے ہیں یعنی الف U ب۔
مثال اگر سیٹ 'الف' = (پ،ج،د) اور سیٹ 'ب' = (ط،ع،ف،ل)

تو 'الف' اور 'ب' کا اتصال = ال ب = (پ، ج، د، ط، ع، ف، ل)

سیٹوں کا تقاطع (intersection of sets): دو سیٹوں 'الف' اور 'ب' کا تقاطع ان دونوں سیٹوں کے مشترک ارکان کا سیٹ ہوتا ہے۔ یعنی اگر 'الف' = (۱، ۲، ۳، ۴) اور 'ب' = (۱، ۴، ۵) تو ان دونوں سیٹوں کا تقاطع ہوگا۔ (۱، ۴)۔

نوٹ: سیٹ تھیوری سے متعلق یہاں وہی تفاصیل بیان کی گئی ہیں جن کی اس مقالہ میں ضرورت ہے۔

سیٹ تھیوری میں امام احمد رضا کی مہارت: سیٹ تھیوری تو اپنی مکمل حالت میں ۲۰ ویں صدی کے اواخر تک آ گئی تھی لیکن ٹاپالوجی (Toplogy) کا ابھی وجود بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ تھیوری یونیورسٹیوں کے گریجویشن سطح سے پوسٹ گریجویشن سطح کی ریاضی میں داخل ہے۔

اب پہلے سیٹ تھیوری میں امام احمد رضا کی مہارت کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے بعدہ ٹاپالوجی میں جائزہ پیش کیا جائے گا۔

علم الٰہی سے متعلق امام احمد رضا کی ریاضیاتی بحث و وضاحت: فرماتے ہیں: بلکہ میں یہ کہتا ہوں، یہی معلومات الٰہیہ سے غیر متناہی در غیر متناہی ہے، چہ جائیکہ اس کے دوسرے معلومات اور میں نے لفظ سلاسل بہ صیغہ جمع کہنے سے اسی طرف اشارہ کیا اور یہ یوں کہ ۱۔۲۔۳ تا آخر غیر متناہی اور طاق اعداد۔۱۔۳۔۵ تا آخر لیں تو بے نہایت اور جفت ۲۔۴۔۶ تا آخر لیں تو بے انتہا اور ایک سے چھوڑ کر لیے جائیں، ۱۔۴۔۷۔۱۰ تا آخر تو بے نہایت۔ یونہی دو سے، ۲۔۵۔۸۔۱۱ تا آخر تو بے نہایت یا ایک سے تین تین چھوڑ کر، ۵۔۹۔۱۳ تا آخر بے نہایت یا دو سے تین تین کے فصل سے ۲۔۶۔۱۰۔۱۴ تو بے نہایت اور اسی طرح بفصل اعداد غیر متناہیہ اور یونہی ہر عدد سے اسی جیسا ملا کر لیں ۱۔۲۔۴۔۱۸ الخ لا تا متناہی یا اس جیسے دو عدد ملا کر ۱۔۳۔۹۔۷۔۱۲ الخ تو نا متناہی اور ایسے ہی اس جیسے ملا کر یا چار تا بے نہایت اور اگر انتشار کر دیں اور کسی نظم خاص کی رعایت نہ کریں، تو غیر متناہی در غیر متناہی رعایت ترتیب نہ رکھیں تو بھی نا متناہی اور نا متناہی اور اگر اموال (Squares) لیں ۱۔۴۔۹۔۱۶ الخ تو نا متناہی اور مکعبات (Cubes) ۱۔۸۔۲۷۔۶۴ الی آخرہ لیں تو نا متناہی اور

اموال الاموال، اموال الکعب یا کعب الکعب چڑھنے والی قوتوں میں سے تا بے نہایت لیں تو سب ہی نامتناہی اور ہر مذکورہ قوت متصاعدہ کے مقابل اترنے والی قوتوں کے سلسلے لیں جیسے جذر (Square root) اور جزء الکعب وجز مال المال جس کی کوئی نہایت نہیں اور کسرین جیب آدھا، تہائی، چوتھائی تا بے نہایت تو سب کے سب غیر متناہی اور سارے یہ سلسلے نامتناہی در نامتناہی، اللہ سبحٰنہ وتعالیٰ کی معلومات میں داخل اور ازل ازل تا ابد ابد پوری تفصیل کے ساتھ شامل اور یہ صرف ایک ہی نوع ہے اس کے غیر متناہی انواع معلومات میں"۔

(امام احمد رضا: الدولۃ المکیہ بالمدۃ الغیبیہ (حاشیہ میں) ص:۱۸۳۔۱۸۵)

تبصرہ: زیرِ نظر کتاب الدولۃ المکیہ میں امام احمد رضا نے غیر متناہی (Infinite) کے تصور کی کثرت سے وضاحت کی ہے۔ امام احمد رضا نے قابل شمار غیر متناہی (Countable infinite) اور نا قابل شمار (uncountable) وغیرہ کی زبردست وضاحت کی ہے۔

پیش کردہ اقتباس میں امام احمد رضا نے قدرتی اعداد کے سلسلے کا ذکر کیا ہے اور اس سے مختلف حسابی سلاسل، ہندسی سلاسل، قوتوں کے سلاسل (Sequences of powers) حاصل کیے۔ قدرتی اعداد یعنی ۱،۲،۳ .... کا سلسلہ قابل شمار غیر متناہی اور اس کے تمام تحتی سلاسل (Subsets یا Se-quences) بھی قابل شمار غیر متناہی۔ اگر کسی نظم کی رعایت نہ کریں اور اعداد میں انتشار کردیں تب بھی سیٹ موجود رہے گا اور غیر متناہی ہی ہوگا۔ آپ نے اعداد کو جذور، کسور (Fraction) وغیرہ سے ملنے والے سیٹوں کا بھی ذکر کیا۔ سب کے سب غیر متناہی ہیں۔

امام احمد رضا نے اس طرح ناطق (Rational) اعداد اور حقیقی اعداد کا بھی ذکر کردیا۔ ملاحظہ کیجیے:

(۱) ۱،۲،۳،........... غیر متناہی

(۲) ۱،۲،۳...... غیر متناہی

(۳) ۲،۴،۶ ...... غیر متناہی

(۴) ۱،۴،۷...... غیر متناہی

(۵) ۱،۲، ۳...... غیر متناہی

(٦) ١، ١/٢، ١/٣...... غیر متناہی وغیرہ۔

امام احمد رضا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے علم میں غیر متناہی کے سلسلے غیر متناہی بار ہیں۔ ریاضی کی زبان میں مزید واضح ہو جاتا ہے۔

لکھتے ہیں: ''گویا وہ اہل حساب کی اصطلاح پر غیر متناہی کی تیسری قوت ہے جسے مکعب (یا کعب) کہتے ہیں''

یعنی (غیر متناہی)٣ = (Infinity^3)

یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم کا اجتماع (Collenction) غیر متناہی ہے اور اس کا ہر رکن غیر متناہی اجتماع ہے۔ یہ سلسلہ غیر متناہی بار جاریہ ہے۔

(٢) امام احمد رضا علم مخلوق کے محدود ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں:

''کسی مخلوق کا علم آن واحد میں غیر متناہی بالفعل کو پوری تفصیل کے ساتھ ہر فرد دوسرے سے بروجہ کامل ممتاز ہو محیط نہیں ہو سکتا اس لیے کہ امتیاز جب ہی ہوگا کہ ہر فرد کی جانب خصوصیت کے ساتھ لحاظ کیا جائے اور غیر متناہی لحاظ ایک آن میں نہیں حاصل ہو سکتے تو مخلوق کا علم اگرچہ کتنا ہی کثیر وبسیار ہو یہاں تک عرش وفرش میں روز اول سے روز آخر تک اور اس کے کروروں مثل سب کو محیط ہو جائے جب بھی نہ ہوگا مگر محدود بالفعل اس لیے کہ عرش وفرش دو کنارے گھیرنے والے ہیں اور ازل سے روز آخر تک یہ دوسری دو حدیں ہوئیں اور جو چیز دو گھیرنے والوں میں گھری وہ نہ ہوگی مگر متناہی۔ (ایضاً ص: ١٨٩۔١٩١)

امام احمد رضا مخلوق کے علم کو وہ چاہے اس قدر زیادہ ہو کہ عرش وفرش میں روز اول تا روز آخر اور اس کے مثل سب کو محیط کیوں نہ ہو جائے، متناہی بتاتے ہیں۔ اس لیے کہ عرش وفرش یا روز ازل تا روز آخر دو کنارے یا دو حد ہوئے لہٰذا محدود ہوئے اور محدود سیٹ کے ارکان کو شمار کیا جا سکتا ہے لہٰذا یہ متناہی ہی ہوگا۔

اب امام احمد رضا اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ متناہی کس طرح غیر متناہی بن سکتا ہے:

(١) ''ہاں علم مخلوق بایں ہمہ غیر متناہی ہونا ٹھیک ہو سکتا ہے کہ آئندہ کسی حد پر اس کی وک نہ کردی

جائے (ہمیشہ بڑھتا رہے) اور بایں معنی لا متناہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں محال ہے اس واسطے کہ اس کے علم اور اس کی سب صفتیں نو پیدا ہونے سے برتر ہیں تو ثابت ہوا کہ غیر متناہی بالفعل ہونا اللہ تعالیٰ ہی سے خاص ہے اور وہ عدم متناہی کہ بڑھنا کسی حد پر نہ رکے اس کے بندوں کے علم سے خاص ہے اور پہلا اس کے غیر کے لیے حاصل نہ ہوگا۔"

ریاضیاتی زبان میں اللہ اور مخلوق کے علم میں کس طرح فرق کو واضح کیا ہے۔ اللہ کا علم اور ساری صفات ازلی وابدی ہیں، لہٰذا غیر متناہی بالفعل صرف اور صرف اسی کے علموں سے خاص ہے اور اس طرح غیر متناہی کہ اس میں اضافہ ہوتا رہے اور کسی حد پر روک نہ ہو بندوں کے علم سے خاص ہے۔ یہ غیر متناہی بہر حال قابل شمار ہے، لیکن اللہ کا علم غیر متناہی اور نا قابل شمار۔

(۴) معرفتِ الٰہی کے لحاظ سے مخلوق خداوندی میں جو نمایاں تخصیص ہے، اس کی وضاحت اس طرح فرمائے ہیں:

"اللہ عزوجل کو جاننے والے انبیاء اور اولیاء اور صالحین اور مؤمنین ان میں جو باہم مراتب کا فرق ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو جاننے ہی میں فرق کی بنا پر ہے (جو جتنا زیادہ جانتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کا مرتبہ ہے) تو ہمیشہ ابد الاباد تک انہیں علم پر علم بڑھتا رہے گا اور کبھی اس کے علم میں سے قادر نہ ہوں گے مگر قدر متناہی پر اور ہمیشہ معرفت الٰہی سے غیر متناہی باقی رہے گا، تو ثابت ہوا کہ جمیع معلومات الٰہیہ کو پوری تفصیل کے ساتھ کسی مخلوق کا محیط ہو جانا عقلاً اور شرعاً دونوں طرح محال ہے، بلکہ اگر تمام اولین وآخرین سب کے علوم جمع کر لیے جائیں تو ان کے مجموعہ کو علوم الٰہیہ سے اصلا کوئی نسبت نہ ہوگی، یہاں تک وہ نسبت بھی نہیں ہو سکتی جو ایک بوند کے دس لاکھ حصوں میں سے ایک حصہ کو دس لاکھ سمندروں سے اس واسطے کہ بوند کا یہ حصہ بھی محدود ہے اور وہ دریائے ذخار بھی متناہی ہیں اور متناہی کو متناہی سے ضرور کوئی نسبت ہوتی ہے اس لیے کہ ہم بوندھ کے اس حصہ کے برابر یکے بعد دیگر ان سمندروں میں سے پانی لیتے جائیں تو ضرور ان سمندروں پر ایک دن وہ آئے گا کہ ختم دفنا ہو جائیں گے کہ آخر متناہی ہیں، لیکن غیر متناہی میں سے کتنے بڑے متناہی حصے کے امثال لیتے چلے جاؤ، تو حاصل ہمیشہ متناہی ہی ہوگا اور اس میں ہمیشہ غیر متناہی باقی رہے گا تو کبھی کوئی نسبت حاصل نہیں

ہو سکتی۔ یہ ہے ہمارا ایمان عزوجل پر" (ایضاً ص:۱۹۳۔۱۹۷)

تبصرہ: امام احمد رضا نے یہاں متناہی سیٹ، غیر متناہی سیٹ اور تحتی سیٹ تینوں کی بخوبی وضاحت فرماتی ہے۔ غیر متناہی سیٹ کا تحتی سیٹ متناہی ہو سکتا ہے اور اگر تحتی سیٹ کو اصل سیٹ سے منہا کر دیا جائے تو بھی غیر متناہی سیٹ ہی رہے گا۔

متناہی۔ غیر متناہی = غیر متناہی۔ امام احمد رضا نے سیٹ تھیوری سے ثابت کر دیا ہے کہ اللہ عزوجل کا علم غیر متناہی ہے اور مخلوق کا متناہی۔ حاشیہ میں بڑے پتے کی بات کہتے ہیں:

"رہا غیر متناہی کو محیط نہ ہونا، تو مسئلہ عقلیہ ہے اس پر شریعت سے کوئی دلیل نہیں، نہ ہر مسئلہ یہ کا انکار کفر تاوقتیکہ اس میں انکار کسی امر دینی کا نہ ہو"

ٹاپالوجی میں امام احمد رضا کی مہارت:

کسی سیٹ "س" پر ٹاپالوجی "ٹ" سیٹ "س" کے تحتی اجتماع کا مجموعہ ہے جو کہ مندرجہ ذیل کی حامل ہوں۔

خالی سیٹ "فائی" اور سیٹ "س" "ٹ" میں شامل ہوں۔

"ٹ" کے کسی تحتی سیٹ کے ارکان کا اتصال (Union) "ٹ" میں ہوں۔

"ٹ" کے متناہی تحتی اجتماع کے ارکان کا تقاطع (Intersection) "ٹ" میں ہو۔

ٹاپالوجی کے اقسام:

۱ ممیّز یا مجرد ٹاپالوجی (Discrete Topology): اگر "س" کوئی سیٹ ہے تو "س" کے تمام تحتی سیٹوں کا اجتماع "س" پر ممیّز یا مجرد ٹاپالوجی کہلاتا ہے)۔

۲ غیر ممیّز یا غیر مجرد ٹاپالوجی (Indiscrete Topology): وہ اجتماع جو سیٹ "س" اور خالی سیٹ-فائی پر مشتمل ہو غیر ممیّز یا غیر مجرد یا خفیف ٹاپالوجی (Trivial Topology) کہلاتا ہے۔

۳ متناہی تکملہ ٹاپالوجی (Finite Complement Topology): اگر "س" کوئی سیٹ ہے اور مان لیا اس کے تمام تحتی سیٹوں کا مجموعہ "ٹ" ہے اس طرح کہ "س-ٹ" یا تو متناہی ہے یا "س" کوئی سیٹ ہے اور مان لیا اس کے تمام تحتی سیٹوں کا مجموعہ "ٹ" ہے اس طرح کہ "س-ٹ" یا

تو متناہی ہے یا ''س'' میں موجود ہے تو اس وقت ''ٹ''۔ ''س'' پر جو ٹاپالوجی ہوگی اسے متناہی تکملہ ٹاپالوجی (Finite Complement Topology) کہتے ہیں۔ ٹاپالوجی کے اور بھی اقسام ہیں لیکن مضمون کے تعلق سے ان کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا انہیں پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

اب ہم امام احمد رضا کے ٹاپالوجیکل نظریات کا جائزہ لیتے ہیں۔

امام احمد رضا فرماتے ہیں: ''ہمارا رب تبارک وتعالیٰ اپنی ذات کریم اور اپنی غیر متناہی صفتوں اور ان سب حادثوں کو جو موجود ہوئے اور ان کو جو ابد کے ابد تک موجود ہوتے رہیں گے اور تمام ممکنات کو جو نہ کبھی موجود ہوئے اور نہ کبھی موجود ہوں، بلکہ تمام محالات کو بھی ان سب کو جانتا ہے، تو تمام مفہومات میں سے کوئی چیز علم الٰہی سے باہر نہیں اور ان سب کو پوری تفصیل کے ساتھ جانتا ہے ازل سے ابد تک اور اللہ سبحٰنہ وتعالیٰ کی ذات غیر متناہی اور اس کی صفتیں غیر متناہی اور ان میں ہر صفت غیر متناہی اور عدد کے سلسلے غیر متناہی ہیں اور ایسے ہی ابد کے دن اور اس کی گھڑیاں اور اس کی آنیں اور جنت کی نعمتوں سے ہر نعمت اور جہنم کے عذابوں سے ہر عذاب اور جنتیوں اور دوزخیوں کی سانسیں اور ان کے پلک جھپکنا اور ان کی جنبشیں اور ان کے سوا اور چیزیں یہ سب غیر متناہی ہیں اور سب اللہ تعالیٰ کو ازل اور ابد میں پوری تفصیلی احاطہ کے ساتھ معلوم ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے علم میں غیر متناہی کے سلسلے غیر متناہی بار ہیں بلکہ اللہ سبحٰنہ وتعالیٰ کے لیے ہر ذرہ میں غیر متناہی علم ہیں، اس لیے کہ ہر ذرہ کو ہر ذرہ سے جو ہو گزرا یا آئندہ ہوگا یا ممکن ہے کہ ہو کوئی نہ کوئی نسبت قرب وبُعد وجہت میں ہوگی جو زمانوں میں بدلے گی ان مکانوں کے بدلنے سے جو واقع ہوئے یا ممکن ہے اور ازل زمانہ یا محدود تک اور یہ سب اللہ عزوجل کو بالفعل معلوم ہیں تو مولیٰ تعالیٰ کا علم غیر متناہی در غیر متناہی ہے گویا وہ اہل حساب کی اصطلاح پر غیر متناہی کی تیسری قوت تک ہے جسے مکعب (یا کعب) کہتے ہیں۔'' (ایضاً، ص: ۱۸۲۔۱۸۷)

امام احمد رضا فاضل بریلوی نے ہر پہلو اور ہر جہت سے ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی ہے۔ ہر حال میں اور یہ ایسا غیر متناہی ہے کہ ناقابل شمار ہے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی (۱)

(عدد کے سلسلے) حاشیہ میں (ص:۱۸۳۔۱۸۴) اس طرح بحث کرتے ہیں: "(ا) بلکہ میں کہتا ہوں یہی معلومات الٰہیہ سے غیر متناہی ہے چہ جائیکہ اس کے دوسرے معلومات اور میں نے لفظ سلاسل بہ صیغہ جمع کہنے سے اسی طرح اشارہ کیا اور یہ یوں کہ ۱، ۲، ۳ تا آخر غیر متناہی اور طاق اعداد، ۱، ۳، ۵ تا آخر لیں تو بے نہایت جفت ۲، ۴، ۶ تا آخر لیں تو بے انتہا اور ایک سے چھوڑ کر لیے جائیں، ۱، ۴، ۷، ۱۰، ۱۴، تو بے نہایت اور اسی طرح مفصل اعداد غیر متناہیہ اور یوں ہی ہر عدد سے اس جیسا ملا کر لیں ۱، ۲، ۴، ۸، تا متناہی یا اس جیسے دو عدد ملا کر ۱، ۳، ۹، ۲۷، الخ تو نا متناہی اور ایسے ہی اس جیسے ملا کر یا چار تا بے نہایت اور اگر انتشار کر دیں اور کسی نظم خاص کی رعایت نہ کریں تو غیر متناہی اور غیر متناہی اور رعایت ترتیب نہ رکھیں تو بھی نا متناہی در نا متناہی اور اموال لیں ۱، ۴، ۹، ۱۶، الخ تو نا متناہی اور مکعبات ۱، ۳، ۲۷، ۶۴ الیٰ آخرہ لیں تو نا متناہی اور اموال المال یا اموال الکعب یا کعب الکعب چڑھنے والی قوتوں میں سے تا بے نہایت لیں تو سب ہی نا متناہی اور ہر مذکورہ قوت متصاعدہ کے مقابل اترنے والی قوتوں کے سلسلے لیں جیسے جذر اور جذر الکعب و جذر مال المال جس کی کوئی نہایت نہیں اور کسرین جیسے آدھا، تہائی، چوتھائی تا بے نہایت تو سب کے سب غیر متناہی اور سارے یہ سلسلے نا متناہی اور نا متناہی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معلومات میں داخل اور ازل تا ابد پوری تفصیل کے ساتھ شامل اور یہ صرف ایک ہی نوع ہے۔ اس کے غیر متناہی انواع معلومات میں سے تو پاک وہ جسے ادراک نہیں کر سکتے عقول وافہام۔ وہ بلند تر ہے اس سے کہ اس کے سراپردۂ عزت وجلالت تک رسائی پائیں۔ تخیلات واوہام تو اسی کے لیے ہیں۔ ساری خوبیاں اور اس کے نبی پر درود وسلام بے شمار۔ جمیع معلومات الٰہی پروردگار ذی الجلال والاکرام۔ (۱۲ رمنہ غفرلہ مکیہ)

یہاں پر امام احمد رضا نے ہندسوں کے سیٹ بنائے ہیں جو سب کے سب غیر متناہی ہیں۔

مثلاً:

1-(1, 2, 3 غیر متناہی)

2-(1, 3, 5......)

3-(2, 4, 6,......)

(......13,10,7,4,1)-4

(......11,8,5,2)-5

(......17,13,9,5)-6

(......16,9,4,1)-7

(......64,27,8,1)-8

(....../3,/2,/1)-9

(......4\1,3\1,2\1,1)-10

کسی بھی طریقے سے ہندسوں کا سیٹ لیں وہ غیر متناہی اور نا قابل شمار ہوگا۔

(3,2,1......غیر متناہی) اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سیٹ پر ٹاپالوجی کی شرائط پوری اترتی ہیں کہ نہیں

شرائط کے مطابق:

ا۔ا کے تحتی سیٹ ضرور ہوں گے

۲۔تحتی سیٹ کا یہ مجموعہ بھی ظاہر ہے غیر متناہی ہوگا۔

۳۔خالی سیٹ بھی اس میں شامل ہوگا۔

لہٰذا نظریہ ٹاپالوجی یہاں پایا جاتا ہے اور اس ٹاپالوجی کو خفیف یا غیر ممیز ٹاپالوجی کہیں گے۔

مثال 1 کے لیے ٹاپالوجی کا نظریہ ثابت ہے۔

مثال 2 سے 10 تک سارے سیٹوں کے لیے ٹاپالوجی کا نظریہ ثابت ہے۔

ایضا: مثال نمبر 1 سے 10 تک کے سیٹوں کے لیے پھر دیکھیں۔ ہر سیٹ غیر متناہی ہے۔ ہر غیر متناہی سیٹ کے تحتی سیٹوں کا مجموعہ بھی غیر متناہی ہوگا۔ یہ غیر متناہی تحتی سیٹ کا مجموعہ سیٹ پر ٹاپالوجی ہوگا اور اس حالت میں یہ ممیز ٹاپالوجی (Topology Discrete) ہوگا۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ امام احمد رضا کی مذکورہ عبارت سے جو دس سیٹ بنائے گئے ہیں ان سے ٹاپالوجی کی دو قسمیں ظاہر ہوتی ہیں۔

1۔ خفیف ٹاپالوجی یا غیر ممیز ٹاپالوجی (Indiscrete Topology or Travia topology)۔
2۔ ممیز ٹاپالوجی (Discrete topology)۔

اب جہاں امام احمد رضا مخلوق کے علم کی بحث کرتے ہیں اور علم الٰہی سے اس میں امتیاز ظاہر کرتے ہیں، وہاں وہ اس طرح رقم طراز ہیں: ''مخلوق کا علم اگرچہ کتنا ہی کثیر وبسیار ہو یہاں تک کہ عرش وفرش میں روز اول سے روز آخر تک اور اس کے کروڑوں مثل سب کو محیط ہو جائے جب بھی نہ ہوگا مگر محدود بالفعل اس لیے کہ عرش وفرش دو کنارے گھیرنے والے ہیں اور روز اول سے روز آخر تک یہ دوسری دو حدیں ہوئیں اور جو چیز دو گھیرنے والوں میں گھری ہو وہ نہ ہوگی مگر غیر متناہی۔ ہاں علم مخلوق میں بایں معنی غیر متناہی ہونا ٹھیک ہوسکتا ہے کہ آئندہ کسی حد پر اس کی روک نہ کر دی جائے (ہمیشہ بڑھتا رہے) اور بایں معنی لا متناہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں محال ہے اس واسطے کہ اس کے علم اور اس کی سب صفتیں تو نو پیدا ہونے سے برتر ہیں۔ تو ثابت ہوا کہ غیر متناہی بالفعل ہونا اللہ تعالیٰ ہی کے علموں سے خاص ہے اور وہ عدم متناہی کہ بڑھنا کسی حد پر نہ رکے اس کے بندوں کے علم سے خاص ہے۔'' (الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ، ص:۱۸۹/اردو ترجمہ، مطبوعہ قادری بکڈپو، بریلی شریف)

عرش وفرش دو کنارے ہیں۔ روز اول تا روز آخر دو حدیں ہیں۔ لہٰذا ان سب کی حیثیت سیٹوں کی ہے اور یہ سیٹ قابل شمار غیر متناہی (Countably Infinite) ہیں۔

اب دیکھتے ہیں کہ اس طرح کے سیٹ میں ٹاپالوجی کی شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں نظریۂ ٹاپالوجی کی شرائط کے مطابق۔

۱ خالی سیٹ اور سیٹ کوٹ میں ہونا چاہیے۔
۲ سیٹ کے کسی بھی تحتی مجموعہ کا اتصال ''ٹ'' ہونا چاہیے۔

اب امام احمد رضا کی مذکورہ بالا عبارت کے مطابق فرض کیجیے سیٹ اس طرح ہے۔

{1,2,3,4......ن}

یہ سیٹ اس کے قوت سیٹ = ن اہوں گے۔

(4,1) (3,1) (4,3) (3,2) (2,1) (ن) (4) (3) (2) (1)}

{((ن...... 4,3,2,1)(ا،ن) (4,2)

اور یہی تحتی سیٹوں کا مجموعہ ہے۔

۱ ظاہر ہے اس میں شامل ہے اور خود سیٹ بھی شامل ہے۔

۲ کسی بھی تحتی سیٹ کا یونین لیں تو وہ بھی مجموعہ سیٹ میں موجود ہے۔

۳ کسی بھی تحتی سیٹ کا تقاطع لیں تو وہ بھی مجموعہ سیٹ میں موجود ہے۔

لہٰذا یہاں بھی نظریہ ٹاپالوجی ثابت ہے۔ امام احمد رضا آگے پھر لکھتے ہیں:

''جمیع معلومات الٰہیہ کو پوری تفصیل کے ساتھ کسی مخلوق کا محیط ہو جانا عقلاً اور شرعاً دونوں طرح محال ہے، بلکہ اگر تمام اولین و آخرین سب کے علوم جمع کر لیے جائیں، تو ان کے مجموعے کو علوم الٰہیہ سے اصلاً کوئی نسبت نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ نسبت بھی نہیں ہو سکتی جو ایک بوند کے دس لاکھ حصوں میں سے ایک حصہ کو دس لاکھ سمندروں سے۔ اس واسطے کہ بوند کا یہ حصہ بھی محدود ہے اور وہ دریائے ذخار بھی متناہی ہیں اور متناہی کو متناہی سے ضرور کوئی نسبت ہوتی ہے اس لیے کہ ہم بوند کے اس حصہ کے برابر یکے بعد دیگرے ان سمندروں میں سے پانی لیتے جائیں، تو ضرور ان سمندروں پر ایک دن وہ آئے گا کہ ختم وفنا ہو جائیں گے کہ آخر متناہی ہیں لیکن غیر متناہی میں سے کتنے ہی بڑے متناہی حصے کے امثال لیتے جاؤ تو حاصل ہمیشہ متناہی ہوگا اور اس میں ہمیشہ غیر متناہی باقی رہے گا تو کبھی کوئی نسبت حاصل نہیں ہو سکتی، یہ ہے ہمارا ایمان اللہ عزوجل پر۔''

(الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ، اردو ترجمہ، ص:۱۹۵، تا ۱۹۷، مطبوعہ قادری بک ڈپو، بریلی شریف)

یہاں پر امام احمد رضا نے متناہی اور غیر متناہی کے فرق کو بدرجہ اتم واضح کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ علم الٰہی سے علم مخلوق کو اصلاً کوئی نسبت نہیں۔ امام موصوف نے یہ بھی واضح کر دیا ہے:

غیر متناہی - متناہی = غیر متناہی

اور اس کے لیے سمندروں کے قطرات کی مثال دی ہے اور سمندر بہر حال فانی ہے۔ لہٰذا اس کے قطرات کا سیٹ بظاہر تو غیر متناہی ہے لیکن ہے قابل شمار۔ یعنی Countably Infinite لہٰذا

یہاں بھی ٹاپالوجیکل نظریہ ثابت ہے۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز نے علم غیب کی بحث میں جس طرح ریاضی سے کام لیا ہے اور الجبرا کی سیٹ تھیوری اور ٹاپالوجیکل نظریات پیش کیے ہیں یہ علم ریاضی میں ان کی مہارت تامہ پر دال ہیں۔

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جب مغربی ریاضی داں سیٹ تھیوری اور ٹاپالوجیکل نظریات پر کام کررہے تھے اور بالخصوص ٹاپالو جی کی تھیوری ابھی وجود میں بھی نہیں آئی تھی، اس وقت امام احمد رضا نے علم غیب کی بحث میں اس تھیوری سے کام لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کو عطائے الٰہی اور تمام مخلوقات الٰہیہ سے بلند و بالا ثابت کر دکھایا۔

لہٰذا اگر سیٹ تھیوری میں نہ سہی تو ٹاپالو جی کے تعلق سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس کے موجد امام احمد رضا ہی ہیں اور انہیں اس تھیوری میں اولیات کا درجہ حاصل ہے۔

○ ○ ○

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی
۱۰۴، جسولی، بریلی شریف

کتاب فوز مبین اور امام احمد رضا کے طبعیاتی نظریات کا مطالعہ

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز ۱۰ر شوال المکرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵٦ء کو بریلی میں پیدا ہوئے اور یہیں ۲۵ر صفر المظفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو انتقال فرمایا۔

آپ تمام دینی و نقلی علوم وفنون پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد دنیاوی و عقلی علوم وفنون مثل سائنس، ریاضیاتی، تجارتی، بینکنگ اور معاشی علوم وفنون میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔

امام احمد رضا ہر علم کی تھیوریوں اور نظریوں کو قرآن وسنت ہی کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ جو اس کسوٹی پر کھرے اترتے ان کو تسلیم کرلیا اور جو قرآن وسنت سے متصادم ہوئے ان کا ردو ابطال کیا۔

چوں کہ قرآن حکیم اس پر نص ہے کہ سورج اور چاند متحرک ہیں اور زمین ساکن ہے لہٰذا امام احمد رضا نے مغربی ماہرین سائنس وہیأت کے حرکت زمین کے نظریہ کے ردو ابطال میں ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء ایک تحقیقی کتاب بنام "فوز مبین در رد حرکت زمین" تصنیف فرمائی اور ماہرین سائنس وہیأت ہی کی تھیوریوں کی روشنی میں گردش زمین کے نظریہ کا ابطال اور زمین کے ساکن ہونے کا احقاق فرمایا۔

زیر نظر تصنیف میں علم طبعیات، علم کیمیا، جغرافیہ اور ریاضی کی مختلف برانچوں، الجبرا، مثلث

مسطح (Plane Trgo nonetry) مثلث کروی (jugoholnetry) ، ڈائنامکس (Gyhamies) کو آرڈی نیٹ جیومٹری (Coardinate geometry) کی تھیوریوں سے بھی کام لیا ہے۔

اس تصنیف میں امام احمد رضا کے طبیعیاتی نظریات کا مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

لمحہ جمود کی بابت Moment of Inertna: اپنے قرار یا حرکت کی کیفیت کی تبدیلی کے خود کے جمود یا نا قابلیت کو "لمحہ جمود" (Monent of inerta) کہتے ہیں۔ امام احمد رضا نے نیوٹن کے اس کلیہ کو اپنے الفاظ میں اس طرح لکھا ہے: "نیوٹن نے کہا کہ اجسام میں اصلا کسی طرف اٹھنے، گرنے سرکنے کا میل ذاتی نہیں بلکہ ان میں بالطبع قوت ماسکہ ہے کہ حرکت کی مانع اور تاثیر قاسر کی تا حد طاقت مدافع ہے۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"اولاً: خود جسم میں یہ قوت ہونے پر کیا دلیل ہے۔ اگر کہیے تجربہ کہ ہم جتنے زیادہ وزنی جسم کو حرکت دینا چاہتے ہیں زیادہ مقابلہ کرتا ہے اور قوی طاقت مانگتا ہے۔ جذب زمین کدھر بھلا یا زمین اسے کھینچ رہی ہے تم اسے جہاں حرکت دینا چاہتے ہو تو اس کی روک کا احساس کرتے ہو، یہ تمہارے طور پر ہے اگر چہ یقیناً باطل ہے اور ہمارے نزدیک جسم کا میل طبعی اپنے خلاف جہت میں مزاحمت کرتا ہے، مطلقاً حرکت سے "۔ (فوزمبین دررد حرکت زمین، ص:۳۱، مطبوعہ بریلی از امام احمد رضا)

مقدار و وزن Mass & weight: چوں کہ نیوٹن نے زمین میں کشش (Jorea of gravity) مائی اور اس بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا کہ:

Every body possess mass, every body attracted toward the centre of earth; therefore the body has weight. no body having mass. can be weightless

یعنی ہر جسم میں کمیت ہے۔ ہر جسم مرکز زمین کی طرف کھینچتا ہے لہٰذا جسم میں وزن ہوتا ہے۔ کوئی با کمیت جسم بے وزن نہیں ہو سکتا۔ جدید سائنس نے مقدار اور وزن کی نسبت سے یہ مساوات

پیش کیا ہے:

w=mg یعنی وزن = کمیت مادہ یا کمیت جسم، کشش ثقل

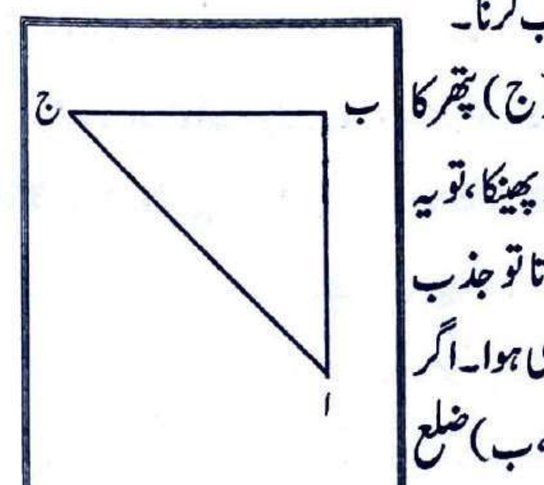
w سے مراد وزن ہے، M سے مراد ہے کمیت مادہ یا جسم اور G سے مراد ہے کشش ثقل (Force of gravity)

چوں کہ امام احمد رضا نے کشش ثقل کو تسلیم نہیں کیا ہے لہٰذا ان کے نظریہ سے یہ مساوات اس طرح ہے:

w=m یعنی وزن = کمیت مادہ یا کمیت جسم ہے۔ پتھر رسی میں باندھ کر اپنے گرد گھماؤ وہ چھوٹنا چاہے گا اور جتنے زور سے گھماؤ گے زیادہ زور کرے گا۔ اگر چھٹ گیا تو سیدھا چلا جائے گا اور جس قدر قوت سے گھماؤ تھا اتنی دور جا کر گرے گا۔ یہ مرکز سے پتھر کی نافریت ہے۔ (فوز مبین در رد حرکت زمین، ص:۳۲)

امام احمد رضا لکھتے ہیں:

''نافریت بے دلیل اور پتھر کی تمثیل نری علیل، پتھر کو انسانی مرکز سے نفرت نہ رغبت، جانب خلاف جو اس کا زور دیکھتے ہو تمہاری دافعہ کا اثر ہے، نہ کہ پتھر کی نفرت، تحقیق مقام کے لیے ہم ان قوتوں کو استخراج کریں، جو باعتبار حرکت کسی جسم میں قاسر کا اثر ڈالتی ہیں۔ وہ تقسیم اول میں دو ہیں۔ محرکہ، کہ حرکت پیدا کرے اور حاصرہ کہ حرکت کو بڑھنے نہ دے، مثلاً ڈھلکتے ہوئے پتھر کو ہاتھ سے روک لو، پھر کہ محرکہ دو قسم ہے۔ ''جاذبہ'' کہ متحرک کو قاصرہ کی سمت پر لائے، جیسے پتھر کو اپنی طرف پھینکے خواہ اس میں قاسر سے دور کرنا ہو کہ ظاہر ہے یا قریب کرنا۔



مثلاً اس شکل میں (الف) مقام انسان ہے (ج) پتھر کا موضع، آدمی نے لکڑی مار کر پتھر کو (ج) سے (ب) پر پھینکا، تو یہ جذب نہیں کہ انسان کی سمت خط (ا، ج) تھا اس پر لاتا تو جذب ہوتا، وہ خط (ب، ج) پر گیا کہ سمت غیر ہے لہٰذا دفع ہی ہوا۔ اگر چہ پتھر پہلے سے زیادہ انسان سے قریب ہو گیا کہ (ا، ب) ضلع

قائمہ (الف، ج) وتر سے چھوٹی ہے۔ پھر یہ دونوں باعتبار اتصال وانفصال زمین دو قسم ہیں۔
رافعہ۔ کہ حرکت میں زمین سے بلند ہی رکھے۔
ملصقہ۔ مثلاً پتھر کو زمین سے ملاملا اپنی طرف لاؤ یا آگے سرکاؤ اور باعتبار نقص وکمال دو قسم ہیں۔
۱۔ منہیہ۔ کہ متحرکہ کو منتہائے مقصد تک پہنچائے۔
۲۔ قاصرہ۔ کہ کمی رہے۔
اور باعتبار وحدت وتعدد خط حرکت دو قسم ہیں:
۱۔ مثبتہ۔ کہ ایک ہی خط پر رکھے۔
۲۔ نقالہ کہ حرکت کا خط بدل دے۔

مثلاً اس شکل میں:
پتھر ''ا'' سے ''ج'' کی طرف پھینکا، جب ''ب' پر پہونچا لکڑی مارکر ''ہ'' کی طرف پھیر دیا، یہ دافعہ ناقلہ ہوئی۔
(فوزمبین دررد حرکت زمین، ص:۳۲۔۳۳)

اس طرح امام احمد رضا نے حرکت کی ۱۳ر قسمیں بتائی ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں۔ ''یہاں جاذبہ کو اصلاً دخل نہیں۔ نہ پتھر میں کوئی نافرہ ہے بلکہ حاصرہ ودافعہ کام کررہی ہیں۔ جتنے زور سے گھماؤ گے اتنی ہی قوت کا دفع ہوگا۔ پتھر اتنی ہی طاقت سے چھوٹتا ہوا گمان کیا جائے گا۔ حالاں کہ یہ اس کا تقاضہ ہے۔ نہ اس کا زور بلکہ تمہارے دفع کی قوت ہے جسے نافہمی سے پتھر کی نافریت سمجھ رہے ہو۔ (ایضاً ص:۳۴)

اب امام احمد رضا بیک وقت ''مرکز گریز قوت'' اور ''، ''مرکز جو یا طاقت'' دونوں کی تردید ایک ہی اصول سے کرتے ہیں اور اس میں نافرہ وجاذبہ دونوں کی نفی کرتے ہیں۔

جب کوئی جسم دائرے میں ہو تو مرکز سے نافرہ اور مرکز کی طرف جاذبہ (ازآنجا کہ دونوں برابر ہوتی ہیں) مربع سرعت نصف قطر دائرہ کی نسبت سے بدلتی ہیں۔
''اء'' سرعت ہے یعنی وہ مسافت کہ جسم نے مثلاً ایک سکنڈ میں قطع کی نافرہ کی۔ دلیل

''اب'' ہے یعنی وہ اسے یہاں تک پھینکتی ہے تو سیدھا اسی طرح جاتا ہے، مگر جاذبہ ''ار'' نے اسے ''ی'' مرکز کی طرف کھینچا تو جسم ''اب'' سے ''اء'' کی طرف پھر گیا۔ چھوٹی قوس اور اس کے وتر میں فرق کم ہوتا ہے۔ لہٰذا قوس ''اء'' کی جگہ وتر ''اء'' کو اور جاذبہ کو ''ج'' اور سرعت کو ''س'' فرض کرو۔

:ار :اء: :اء یعنی ج: س : : س : قطر

یعنی ح = س۲ / قطر یعنی جاذبہ۔ س۲ / نصف قطر کی نسبت پر بدلے گی اور دائرے پر حرکت میں جاذبہ و نافرہ برابر ہوتی ہیں اور ایک دائرہ میں نصف قطر کی قیمت محفوظ ہے۔ لہٰذا جاذبہ و نافرہ مربع سرعت کی نسبت بدلیں گی۔ مثلاً ڈور میں گیند باندھ کر گھماؤ جب سرعت دو چند ہوگی ڈور پر زور چہار چند ہوگا، تو ڈور یعنی جاذبہ کی مضبوطی بھی چہار چند ہونی چاہیے۔ اقول یہ سب تلبیس و تدلیس ہے۔

اولاً۔ ''ار'' جاذبیت رکھی کہ سہم قوس ''اء'' ہے اور ''اب'' دافعیت کے مساوی ''رء'' جیب قوس مذکور ہے اور جیب سہم سوا ربع دور وسہ ربع دور کے کبھی مساوی نہیں ہو سکتے۔ ربع اول و چہارم میں ہمیشہ جیب بڑی ہوگی اور دوم و سوم میں ہمیشہ سہم اور بوجہ صغر قوس قلت تفاوت کا عذر مردود ہے۔

ثانیاً۔ ''اب'' دافعیت نہیں بلکہ وہ مسافت جس تک اس دفع کے اثر سے جاتا خود بھی اسے دلیل نافرہ کہا یہاں دافع کہا جب اتنا اثر ہے تو جاذبہ کے تجاذب سے اگر گھٹے نہیں تو بڑھنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ تو جسم یہاں اسی قدر مسافت پر جا سکتا ہے۔ وہ قوس ''اء'' رکھی پھر وتر ''اء'' تو واجب کہ ''اب'' و ''اء'' یعنی جیب دو وتر مساوی ہوں اور یہ قطعاً ہمیشہ محال ہے، ''ار'' قائم الزاویتین ''ا، و، ر'' دونوں قائمے ہوئے یا قائمہ مساوی حادہ اور عذر صغر پہلے رد ہو چکا۔

ثالثاً۔ ''ار'' سہم و ''اء'' وتر بھی مساوی ہوگئے اور یہ بھی محال ہے۔ اب مثلث ''ار'' قائم الزاویہ مختلف الاضلاع ہو گیا اور قائمہ ۶۰ درجے کا رہ گیا اور ایک ثانیہ ۱۸۰ / درجے ایک ثانیہ ہوا کہ ''ر، ء، ا''۔ ☆ (تو یہ نصف ثانیہ ہوا اور ''راء'' ۳۰۵۹۵۹۸۹ اور دونوں مساوی ہیں اور نسبت اضعاف

مثل نسبت انصاف ہے (اقلیدس ۵ مقالہ شکل ۱۵) تو ایک ثانیہ ۱۷۹۔۵۹۵۹ کے برابر ہوا یعنی ابرابر ۶۴۷۹۹۹:۶۴۷۹۹۸ یہ ہیں تحقیقات جدیدہ ۱۲ منہ غفرلہ۔

محیطیہ ایک ثانیہ پر پڑا ہے اور ''راء'' محیطیہ ایک ثانیہ کم نصف دور پر دونوں مساوی ہیں، کہ دونوں کے وتر مساوی ہیں (ماموئی) تو دونوں قوسیں مساوی ہیں، مقدار ۳ رشکل ۴۵ بالجملہ اس پر بیشمار استحالے ہیں۔

رابعاً۔ یہ ضرور ہے کہ مہندسین نہایت صغیر قوسوں میں ان کے وتر ان کی جگہ لے لیتے ہیں جسے اعمال کسوف وخسوف میں ٹکراتے ہیں۔ تو حکم عام دنیا ہے، ہر جگہ یہ ٹٹو کیسے چلے گا، دیکھو نصف دو ۱۸۰ ردرجے محیطیہ ہے اور اس کا وتر کہ قطر ہے صرف ۱۲۰ ردرجے وہ بھی قطریہ کہ محیطیہ کے ۱۱۵ ر(۱) سے بھی کم ہوئے۔ فرض کرو قوس ''اء'' ۶۰ درجے ہے تو درجات قطریہ سے ''ار'' سہم صرف ۳۰ ہے اور ''رء'' جیب تقریباً ۵۲ر۲ (۲) ''اقوس تقریباً ۶۳ (۳) مجنون ہے جو ان سب کو مساوی کہے۔

خامساً۔ تساوی قوتوں پر شکل وہ نہ ہوگی بلکہ یہ ''اب'' دلیل واقعہ ہے ''اء'' کو مرکز مان کر بعد ''ب'' پر قوس ''ب'' کھینچی جس نے محیط کو ''ء'' پر قطع کیا اور قطر کو ''ز'' پر تو ''اء'' مسافت واثر دافعیت ہوئی اور ''ار'' اثر جاذبیت اب ''ار'' سہم قوس ''اء'' نہیں بلکہ اس کا سہم ''اج'' ہے بحکم شکل مذکور، اقلیدس اح بحسب مربع 'اء' بدلے گا۔ نہ کہ جاذبیت ''ار''۔

سادساً۔ دعوے میں جاذبہ ونافرہ دونوں تھیں اور بفرض باطل اس دلیل سے ثابت ہوا تو جاذبہ کا بحسب مربع مسافت بدلنا جسے بادانی مربع سرعت کہا سرعت مسافت نہیں بلکہ مسافت مساویہ کو زمانہ اقل میں کرنا نافرہ کے

☆ تو یہ نصف ثانیہ ہوا اور 'راء' ۳۰۵۹۵۹۸۹، اور دونوں مساوی ہیں اور نسبت اضعاف مثل نسبت انصاف ہے (اقلیدس ۵ مقالہ شکل ۱۵) تو ایک ثانیہ ۱۷۹۔۵۹۵۹ کے برابر ہوا یعنی ابرابر ۶۴۷۹۹۹: ۶۴۷۹۹۸ یہ ہیں تحقیقات جدیدہ ۱۲ منہ غفرلہ

(۱) یعنی ۱۱۴ درجے ۳۵ دقیقے ۲۹ ثانئے ۳۶ ثالثے ۴۷ رابعے ۱۲ منہ غفرلہ

(۲) یعنی ۵۱ درجے ۵۷ دقیقے ۱۴ ثانئے ۲۹ ثالثے ۱۴ رابعے ۱۲ منہ غفرلہ

(۳) یعنی ۶۲ درجے ۴۹ دقیقے ۵۴ ثانئے ۴۰ ثالثے ۴۴ رابعے ۱۲ منہ غفرلہ

دعوے کو تساوی جاذبہ و نافرمانی پر حوالہ کیا اور اسے خود شکل میں بگاڑ دیا کہ جاذبہ سہم رکھی اور دافعیہ جیب بلکہ وتر قوس۔

اہل انصاف دیکھیں یہ حالت ہے ان کی اوہام پرستی کی اپنے باطل خیالات کو کیسا زبردستی برہان ہندسی کا لباس پہنا کر پیش کرتے ہیں۔(فوز مبین در رد حرکت زمین، ص:۴۳ تا)

نوٹ: ابھی تک امام احمد رضا اور طبعیات کے جن نظریات کا تقابل پیش کیا گیا ان کا تعلق جاذبہ و نافرہ سے ہی ہے اور اسی جاذبہ کے نظریہ کو لے کر ماہرین طبیعیات بالخصوص آئزک نیوٹن (Issac Newtan) نے کشش ثقل کا نظریہ پیش کیا۔

لہٰذا اب امام احمد رضا نے نیوٹن کا کس طرح رد و تعاقب فرمایا ہے، اسے پیش کرتے ہیں۔

جابہ و نافرہ کا رد (Refutation of Attraction & Repuision): امام احمد رضا نے نیوٹن کا کھلا رد کیا ہے۔انہوں نے نیوٹن کے جاذبہ و نافرہ کی تھیوریوں کا بھی رد فرمایا ہے۔

آئزک نیوٹن (Issac Newton): آئزک نیوٹن ۱۶۴۲ء میں وولس تھروپ (Wools thrope) انگلینڈ میں پیدا ہوا، اس نے ٹرینٹی کالج، کیمبرج (Trinity College, Cambridge) میں تعلیم حاصل کی، اس نے ایک پیڑ سے سیب گرتے ہوئے دیکھا تو نظریہ کشش ثقل (Law of Gravitation) دریافت کیا۔

اس نے حرکت کے تین بنیادی اصول (Newton's Law of motion) بھی پیش کیے۔ نیوٹن نے علم طبیعیات (Physics) کے تمام شاخوں، مکینکس (Machanics) حرارت (Heat)، نور، (Light)، صوت (Sound)، بجلی (Electricity) اور مقناطیسیت (Magnetism) پر کام کیا اور اپنے اصول و نظریہ پیش کیے۔ نیوٹن کو جدید سائنس کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔اس کی دو کتابیں۔

۱۔ پرنسپیا (Principia) لیٹن زبان میں، اور نور اور روشنی پر اس کی کتاب۔

۲۔ آپٹی سیزم (Opticism) بزبان انگریزی بہت مشہور ہیں، نیوٹن کو اس کے سائنسی کاموں کی وجہ سے ''سر'' (Sir) کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔

نیوٹن کے نظریات کا رد: امام احمد رضا نے نیوٹن کا کھل کر اور نام لے کر رد وتعاقب کیا ہے، اس سلسلے میں امام احمد رضا کی تصنیف ''فوز مبین در رد حرکت زمین'' دیکھنے کے لائق ہے۔

نیوٹن کا جذبہ جاذبہ: Newton's Universal Law of Gravitation

Every body in this universe attracts every other body with a force which is directily proportional to the product of their masses and universely proportional to the square of the distance between their centres.

یعنی کائنات میں ہر جسم ایک دوسرے کو ایک قوت کے ساتھ کھینچتی ہے جو دونوں اجسام کے مقدار کے ضرب کا بالواسطہ تناسب ہوتا ہے اور ان کے بیچ کی دوری کے مربع کو معکوس متناسب ہوتا ہے۔

اسی بات کو امام احمد رضا نیوٹن کے حوالے سے اس طرح لکھتے ہیں:

ہر جسم میں دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کی ایک قوت طبعی ہے جسے جاذبہ یا جاذبیت کہتے ہیں، اس کا پتہ نیوٹن کو ۱۶۶۵ء میں اس وقت چلا، جب وہ وبا سے بھاگ کر کسی گاؤں میں گیا، باغ میں تھا کہ درخت سے سیب ٹوٹا، اسے دیکھ کر سلسلۂ خیال چھوٹا جس سے قواعد کشش کا بھنبھوکا پھوٹا۔ (فوز مبین در رد حرکت زمین، ص:۳۱)

نوٹ: (۱) کے لیے حاشیہ میں امام احمد رضا نے نیوٹن کے نظریہ کے لیے کتاب ''اصول علم طبعی'' ص: ۵۷ کا حوالہ دیا ہے۔

امام احمد رضا نیوٹن کا رد وتعاقب اس طرح فرماتے ہیں:

''اقول: سیب گرنے اور جاذبیت کا آسیب جاگنے میں علاقہ بھی ایسا ہی تھا کہ وہ گرا اور یہ اچھلا، کیوں کہ اس کے سوا کوئی سبب ہوسکتا ہی نہ تھا۔ (فوز مبین در رد حرکت زمین، ص:۳۱)

آگے پھر تحریر کرتے ہیں:

اولاً: عقلائے عالم اثقال میں میل سفل مانتے ہیں کیا وہ میل اس کے گران کو کافی نہ تھا یا میل

نہ جانا، یوں نہ سمجھ سکتا تھا کہ ثقیل کے استقرار کو وہ محل چاہیے جو اس کا بوجھ سہارے۔ سیب وہی ٹوٹے گا جس کا علاقہ شاخ سے ضعیف ہو جائے، وہ...... تعلق اب اس کا بوجھ نہ سہار سکے ورنہ سبھی نہ ایک ساتھ ٹوٹ جائیں۔ ادھر تو ضعیف علاقہ کے سبب شاخ سے چھوٹا ادھر اس سے نرم تر ملا، ہوا کا ملاء اسے کیا سہارتی،...... اسے کثیف تر ملاء درکار ہوا کہ زمین ہو یا پانی، کیا اتنی سمجھ نہ تھی یا بطلان میل پر کوئی دلیل قائم کر لی اور جب کچھ نہیں تو جاذبیت کا خیال محض ایک خیال رہا۔ محتمل مشکوک بے ثبوت بات پر علوم کی بنا رکھنا کار خردمنداں نیست۔

ثانیاً: لطف یہ کہ یہی ہیأت جدیدہ والے جابجا ثقیل میں میل ثقل...... خفیف میں میل علو لکھ جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ میل جاذبیت کا سارا میل...... دے گا۔ جب ثقیل اپنے میل سے گرتا سیب کا ٹوٹنا جاذبیت پر کہاں دلالت کرتا ہے۔ یہ یقین واحتمال وطریق استدلال ومنصب مدعی سوال سے ان کی ناواقفی ہے۔ معلول کے لیے علت درکار ہے، جب ایک کافی ووافی علت موجود ہے اور تمہیں بھی مسلم تو اسے چھوڑ کر دوسری بے ثبوت کی طرف اسے منسوب کرنا کون سی عقل ہے۔ بالفرض اگر علت کافیہ معلوم نہ ہوتی تو بلا دلیل کسی شئی کو علت بتا دینا مردود ہوتا ہے۔ وہاں یہ کہنا تھا کہ علت ہمیں معلوم نہیں، نہ یہ کافی علت موجود ہوتے ہوئے اس سے فرار اور دوسری پر بے دلیل قرار۔ جاذبیت کے رد کو ایک یہی بس ہے۔ یہاں سے ظاہر ہوا کہ جاذبیت پر ایمان بالغیب انہیں مجبورانہ میل طبعی کے انکار پر لاتا ہے اگرچہ وہ نادانی سے کہیں مقر ہوں، اگرچہ وہ بے دلیل منکر ہوں اور میل طبعی کا ثبوت بلکہ احتمال ہی جاذبیت کو باطل کرتا ہے کہ جب میل ہے جاذبیت کی کیا حاجت اور اس کے وجود پر کیا دلیل؟ یہ تقریر بعض دلائل آئندہ میں ملحوظ خاطر ہے۔

ردسوم: اقول نمبر ۲۰۵۔ فرض کردم کہ سیب گرنے سے زمین پر جاذبیت کا آسیب آیا مگر اس سے شمس میں جاذبیت کیسے سمجھی گئی جس کے سبب گردش کا طومار باندھ دیا۔ کیا اس پر بھی کوئی سیب گرتے دیکھا یا یہ ضرور ہے کہ جو کچھ زمین کے لیے ثابت ہوا آفتاب میں بھی ہو۔ (فوز مبین در رد حرکت زمین، ص:۴۹۔۵۹)

تبصرہ: امام احمد رضا نے بڑے منطقیانہ انداز میں اسی اصول کی روشنی نیوٹن کے نظریہ کا رد کیا ہے جس اصول کو بنیاد بنا کر نیوٹن نے کشش زمین کا نظریہ پیش کیا ہے۔ چوں کہ آئزک نیوٹن نے

جاذبیت (Gravity) کے لیے نافریت (Repulsion) کو لازم قرار دیا ہے جیسا کہ اصول علم طبعی نامی کتاب میں مسٹر نیوٹن کا یہ قول مندرج ہے اور امام احمد رضا اس کا حوالہ اس طرح دیتے ہیں۔

ہر جسم بالطبع دوسرے کے جذب سے بھاگتا ہے اس قوت کا نام نافرہ، ہاربہ، دافعہ، محرکہ، نافریت ہے۔ (فوز مبین در رد حرکت زمین، ص:٣٢)

امام احمد رضا نے نافریت کا بھی رد فرمایا ہے، لکھتے ہیں:

جاذبہ تو سیب کے گرنے سے پہچانی یہ، کاہے سے جانی، شاید سیب گرنے گرتے نیچے دیکھا تو زمین تھی اس کا جذب خیال میں آیا، اوپر دیکھا تو سیب شاخ سے...... پایایوں نافرہ کا ذہن لڑایا، حالاں کہ نیچے لانے کو ان میں ایک کافی ہے دو کس لیے؟

حدائق النجوم میں کہا ہے کہ برابر سطح پر گولی پھینکیں تو بالطبع خط مستقیم پر ہے یہ نافرہ ہے۔ پھینکیں میں اس کا جواب ہے، آہستہ رکھ دیں کہ جنبش نہ ہو تو بالکل نہ سرکے گی۔ جہاں سطح پوری لیول میں نہ ہو تو ڈھال کی طرف ڈھلکے گی۔

پھر کہا کنکیا میں پتھر باندھ کر اڑائیں چھوٹ کر سیدھا زمین پر آئے گا،......نافرہ ہے۔ اقول یہی بات آگئی جو ہم نے ان کی دانش پر گمان کی تھی۔ نیچے دیکھا تو...... جذب سمجھے اوپر نگاہ اٹھائی تو اسے بھول گئے۔ فرار پر فرار ہوا۔ (فوز مبین در رد حرکت زمین، ص:)

تبصرہ: نافریت کے رد کے بعد امام احمد رضا تحریر کرتے ہیں:

تم جاذبیت کے لیے نافریت لازم مانتے ہو کہ وہ ہو اور یہ نہ ہو تو کھینچ کر وصل ہو جائے اور ہم نافریت باطل کر چکے تو جاذبیت خود ہی باطل ہو گئی کہ بطلان لازم بطلان ملزوم ہے۔ (فوز مبین در رد حرکت زمین، ص:٩٥)

امام احمد رضا نے جاذبیت (Gravity) کے رد میں متعدد دلیلیں دی ہیں ان دلائل میں منطق، ریاضی و ہیئت (Astronomy) کا بھی استعمال کیا ہے۔

آئزک نیوٹن نے اپنے نظریہ جاذبہ یا ثقل اضافی (Force of gravity) کے سلسلے میں مد و جزر کا نظریہ (view point of tide) بھی بطور تائید پیش کیا ہے۔ امام احمد رضا نے

کتاب "فوز مبین در رد حرکت زمین" مد و جزر کے نظریہ کو رد کیا ہے اور نیوٹن کا تعاقب فرمایا ہے۔

نیوٹن نے مد و جزر کا ہونا جذب قمر کو قرار دیا ہے۔ امام احمد رضا نیوٹن کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"ہر شبانہ روز میں دو بار سمندر میں مد و جزر ہوتا ہے، جسے جوار بھاٹا کہتے ہیں۔ یہ جذب قمر کا اثر ہے، ولہٰذا جب قمر نصف النہار پر آتا ہے، اس کے چند ساعت بعد حادث ہوتا ہے۔ آفتاب کو بھی اس میں دخل ہے ولہٰذا اجتماع و مقابلہ نیرین کے ڈیڑھ دن بعد سب سے بڑا مد ہوتا ہے، مگر اثر شمس بہت کم ہے۔

تبصرہ: نیوٹن کے مطابق ۲۴ گھنٹے ۵۰ منٹ کے وقفہ کے دوران ہر شبانہ روز دو بار سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے کیوں کہ ۲۴ گھنٹہ ۵۰ منٹ میں زمین ایک بار چاند کے گرد سے گھوم جاتی ہے۔ دو متواتر مدوں (جوار) کی بلندی میں عدم مساوات پائی جاتی ہے، لیکن یکے بعد دیگرے مدوں کی بلندی تقریباً برابر ہو جاتی ہے۔ یہ بھی قمر کے جدی (Tropic of Caprion) خط استوا (Equator) یا خط سرطان (Tropic of Canver) پر قمری یوم کے دوران ہونے کے مطابق ہے۔ مہینہ کے دوران دو سب سے بڑے مد ہوتے ہیں (ہر پونے پندرہ دن بعد) جن کی بلندی عام مد سے تقریباً ۲۰ فیصد زیادہ ہوتی ہے، یہ ماہ نو اور ماہ کامل (Full moon) سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اسی طرح دو سب سے چھوٹے جزر (بھاٹا) اس وقت ہوتے ہیں جب چاند اور سورج زمین کے لحاظ سے ۹۰ پر ہوں۔ قمری ماہ (Lunar Month) میں چاند ایک بار زمین کے نزدیک ترین ہوگا اور اس دن سب سے بڑا مد ہوگا اور اسی طرح ایک دن دور ترین ہوگا جس پر سب سے چھوٹا جزر ہوگا۔

اب دیکھیے امام احمد رضا اس کا رد کس طرح فرماتے ہیں:

(۱) چاند تو زمین کے ایک طرف ہوگا دوسری طرف پانی کس نے کھینچا، یہ تو جذب نہ ہوا رفع ہوا۔ (ص:۵۰)

(۲) کرہ زمین کو آب و خاک کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے اور جذب صرف آب پر ہوتا ہے جو گزشتہ بیان کی نفی ہے۔ (ص:۵۱)

مزید فرماتے ہیں، دیکھو تمہارے زعم میں جذب شمس سے زمین گھومتی ہے تو تینوں جز خاک و آب و باد کو ایک ساتھ یکساں متحرک مانتے ہو نہ کہ سب ایک دوسرے سے جدا ہو کر چلیں۔

(فوزِ مبین در ردِ حرکت زمین، ص:۵۱)

اسی طرح متعدد دلائل سے نیوٹن کے نظریہ مد و جزر اور جذب و کشش نظریات کا رد بلیغ کیا ہے۔

اسی مد و جزر کے سلسلے میں امام احمد رضا حساب لگا کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

قاعدہ نیوٹن اگر صحیح ہے تو قمر پر جاذبیت شمس بہ نسبت جاذبیت ارض ۱/۰۰..... ہوگی، یہ بھی بہت نادر۔ اکثر اوقات اس سے بھی کم، زمین سے قمر کا بعد البعد ۲۵۱۰۹۴۷ میل ہے...... شمس سے زمین کا بعد اقرب ۹۱۳۴۱۹۷۴ میل فرض کیجیے۔ شمس اپنے بعد اقرب...... ہے اور قمر اجتماع میں اپنے بعد البعد پر کہ شمس و ارض سے فاصلہ قمر میں سب سے زیادہ تفاوت کی صورت ہے۔ ص:۱۰۳

آخر میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

یعنی شمس اگر قمر کو اپنی طرف ایک میل کھینچتا ہے تو زمین اپنی طرف پانچ ہزار میل اور تقریر رد پنجم شامل کیے سے تو جذب زمین کے مقابل جذب شمس گویا صفر جائے گا اور زمین کا جذب المعارض و مزاحم کا کام فرمائے گا اور شک نہیں کہ یہ جذب ہزاروں برس سے جاری ہے اور ہو گیا ہے کہ قمر ابھی تک زمین پر گر نہ پڑا۔ اگر جاذبیت صحیح ہوتی ضرور کب کا گر چکا ہوتا تو جاذبیت محض مہمل خیالی ہے۔

(ص:۱۰۳،۱۰۴)

نیوٹن کے اس قول کی رد میں کہ ''اگر زمین کو اتنا دبایا جائے کہ مسام بالکل نہ رہتے تو اس کی مساحت ایک انچ مکعب سے زیادہ نہ ہوتی۔ (ص:۷۰)

امام احمد رضا تحریر کرتے ہیں:

اہل انصاف دیکھیں سردار ہیأت جدید نیوٹن نے کیسی صریح خارج از عقل بات کہی کرہ زمین اگر دب کر ایک انچ مکعب رہ جائے تو اولا یہ سارا کرہ جو کہ کھربوں میل میں پھیلا ہوا ہے۔ صرف ایک لاکھ دس ہزار پانچ سو بانوے (1,10,592) ذروں کا مجموعہ ہو۔ ہر ذرہ بال کی نوک کے برابر۔۔۔۔۔۔۔۔ پورے ساٹھ سمجھئے۔ بس یہ کائنات قطر زمین کی ہوتی اور اب ایک انچ طول کی خاک میں گن لیجیے اتنے ذرے فی الحال موجود ہیں تو باقی ۸ ہزار میل کا خط کہاں سے بنا۔ (ص:۷۱)

اسی طرح حساب لگا کر امام احمد رضا بتاتے ہیں:

جب قطر میں ساٹھ ہی ذرے ہوئے اور وہ ۱۲۰/درجے اور زمین کا درجہ قطریہ ٦٦ میل کے قریب ہے یعنی ۹۴۲۳ء۶۵ میل کے نصف قطر معدل ۳۹۵۶ء۵۳۴ میل ہے۔ تو سب اس سمٹنے کے بعد پھیل کر حالت موجود پر آئی، ہر ذرہ دوسرے سے ۱۳۲/میل کے فاصلے پر ہوتا تو زمین محسوس ہی نہ ہو سکتی۔ (ص:۷۱)

امام احمد رضا نے ریاضی کی روشنی میں نیوٹن کے نظریہ کا کیسا مدلل رد کیا ہے۔

فوز مبین میں نیوٹن کے اور نظریات کا رد کیا ہے اور زبردست تعاقب کیا ہے، امام احمد رضا کے رد و تعاقب کی خوبی یہ ہے کہ مخالف اپنے دعوے میں جس علم و فن کی کتب سے دلیلیں دیتا ہے وہ اسی علم و فن سے اس کا رد فرماتے ہیں۔

امام احمد رضا نے مادے کی عام خصوصیات (General Properties of Matter) کے سلسلے میں اور بھی نظریات پیش فرمائے ہیں۔ صرف چند تھیوریوں کی بابت ان کے خیالات پیش ہیں۔

○ ○ ○

پروفیسر عبدالمجید صدیقی
سابق پرنسپل سٹی کالج، مالیگاؤں

اعلیٰ حضرت اور زر کی بازار کاری

اسلامی معاشیات کے چند بنیادی اصول ذیل میں درج کیے جارہے ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

☆ اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی سودا تمہاری باہمی رضامندی کا ہو۔ (سورۂ نسا:۹۹ر کنز الایمان)

☆ اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں اور گردن چھڑانے میں۔ (سورۂ بقرہ:۱۷۷ر کنز الایمان)

☆ اور فضول نہ اڑا، بے شک اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ (سورۂ بنی اسرائیل:۲۶۔۲۷ر کنز الایمان)

☆ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو، جو باقی رہ گیا سود اگر مسلمان ہو۔ (سورہ البقرہ:۲۷۷ر کنز الایمان)

☆ پھر اگر ایسا نہ کرو، تو یقین کرلو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا اگر تم توبہ کرو، تو اپنا مال لے لو، نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ نہ تمہیں نقصان ہو۔ (سورۂ البقرہ:۲۷۸ر کنز الایمان)

☆ وہ جو سود کھاتے ہیں، قیامت کے دن نہ کھڑا ہوں گے، مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے، وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو، یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا بیع بھی تو سود ہی کے مانند ہے اور اللہ حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود، تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا، تو اسے حلال ہے، جو پہلے لے چکا اور اس کا کام

خدا کے سپرد ہے اور جواب ایسی حرکت کرے گا تو وہ دوزخی ہے، وہ اس میں مدتوں رہیں گے، اللہ ہلاک کرتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ کو پسند نہیں کوئی ناشکرا بڑا گنہ گار۔ (سورۃ البقرہ: ۲۷۴۔۲۷۵ / کنز الایمان)

☆ اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما (تمہارے وہ مال جن کو اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا۔

☆ وابتغوا من فضل اللہ (اور اللہ کا فضل تلاش کرو)

اس ضمن میں چند احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ملاحظہ فرمالیں:

☆ حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن بھیجا تو ارشاد فرمایا: دیکھنا! عیش پسند زندگی سے دور رہنا کیوں کہ اللہ کے بندے عیش پسندانہ زندگی نہیں گزارتے۔(احمد)

☆ میرے آقا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر آدم کے کسی بیٹے کی ملکیت میں سونے کے دو پہاڑ دے دیں تو وہ تیسرے پہاڑ کی تمنا کرے گا، صرف قبر کی مٹی ہی آدم کی اولاد کا پیٹ بھر سکتی ہے۔ (صحیح بخاری، باب ۸۱، حدیث ۶۴۳۶)

☆ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو یہ پروانہ ہوگی کہ جو مال وہ حاصل کر رہا ہے وہ حلال ہے یا حرام۔ (صحیح بخاری شریف)

☆ رسول اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آدمی اپنے اہل خانہ پر ثواب کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ خرچ کرنا اس کے حق میں صدقہ ہے۔ (بخاری عن ابن مسعود)

☆ جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑی روزی پر راضی رہے، تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی طرف سے تھوڑے عمل پر راضی ہو جاتا ہے۔ (بیہقی)

درج بالا قرآن واحادیث کے چند حوالوں سے کچھ ایسے اسلامی معاشی امور اخذ کیے جا سکتے ہیں، جن کا تعلق عصری معاشیات سے بھی ہے، ذیل میں مختصراً اس کی وضاحت کی جارہی ہے۔

(۱) آمدنی و دولت (Income and Wealth): کسی ذریعے سے حاصل ہونے والا

مال آمدنی ہے، اسے اللہ کا فضل قرار دیا گیا ہے اور جائز طریقوں سے اسے حاصل کرنے پر اکسایا گیا ہے، ناجائز طریقوں سے مال حاصل کرنے سے روکا گیا ہے۔

ایک شخص، جو رقم یا مال وقتاً فوقتاً حاصل کرتا رہتا ہے، وہ اس کی آمدنی ہے، اس آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ وہ اپنی مختلف ضروریات پر خرچ کرتا رہتا ہے، اس کے بعد جو حصہ بچ رہتا ہے، وہ اس کی دولت (Wealth) کی شکل میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ چناں چہ کسی ذریعہ سے حاصل ہونے والا مال آمدنی ہے، اس میں سے جو پس انداز ہو کر جمع ہو جائے وہ دولت ہے۔

(۲) صَرف (Consumption): اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی ضروریات کے پیش نظر بہت ساری چیزوں کو پیدا فرمایا، ان چیزوں نے انسانی زندگی کو بے شمار سہولیات بہم پہنچائی ہیں، ان ہی کے سبب ہمارا کھانا پینا، رہنا سہنا، لباس، ادویات اور حصول علم وغیرہ ممکن ہوئے ہیں، (تمہارے وہ مال جن کو اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے) حسبِ ضرورت اور حسبِ استطاعت ان چیزوں (اموال) کے استعمال کی ترغیب دی ہے، بہر حال فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی بتلا کر انسان کو اس سے روکنے کی ترغیب بھی دی، نیز اس بات کی بھی ترغیب دی کہ "لوگ اپنا مال اللہ کے بندوں کی خیر وفلاح میں بھی لگائیں"۔ چناں چہ اسلام نے فضول خرچی سے بچتے ہوئے اپنی ضرویات پر نیز اللہ کے بندوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔

(۳) بچت (Sacving): آمدنی کا وہ حصہ، جو خرچ نہ کیا گیا ہو، بچت کہلاتا ہے، اسلام فضول خرچی اور عیش پسندانہ زندگی گزارنے سے روکتا ہے، اسلام بچت کی ترغیب دیتا ہے، لیکن اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے دولت کی مرکوزیت اور ذخیرہ اندوزی (Hoarding) سے روکتا بھی ہے، جمع پانی کے مقابلے میں بہتا ہوا پانی معاشرہ کے لیے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ معیشت میں یہ بچت نہایت اہم رول ادا کرتی ہے، جس کی کارگزاری کا مشاہدہ زر بازار اور سرمایہ بازار میں ہم آگے کریں گے۔ اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ کسی بھی مقصد سے استعمال کے لیے اس بچت کو سود پر دینے کی اسلام شدت سے مخالفت کرتا ہے۔

(۴) روپیہ کاروبار میں لگانا (Investment): اس سے مراد وہ خرچ ہے، جو منافع کمانے کا سبب بنے۔ اس خرچ سے نقصان بھی ممکن ہے، کاروباری شخص اپنی خود کی بچت کے ساتھ مختلف ذریعوں سے وسائل حاصل کر کے منافع کی امید پر کاروبار میں لگاتا ہے، اللہ کا فضل تلاش کرنے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے، یہ کاروبار زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، وغیرہ میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد بھی ہوسکتا ہے۔

روپیہ کاروبار میں لگانے کے تعلق سے اسلام نے کچھ شرائط متعین کر رکھی ہیں، مثلاً سودی کاروبار نہ کریں، شراب جیسی حرام اشیا کی پیداوار اور تجارت سے مکمل احتراز کریں۔ مال روک کر بازار میں مصنوعی قلت پیدا نہ کریں۔ بعض لوگ اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، راہ گیروں، سائلوں اور گردن چھڑانے میں لگا دیتے ہیں اور آخرت میں کہیں بڑے اجر کے حق دار ہو جاتے ہیں۔ ناچیز اسے بھی investment ہی گردانتا ہے۔

درج بالا معاشی معاملات خواہ آمدنی ہو یا دولت یا صَرف (Consumption)، بچت (Saving) یا روپیہ کاروبار میں لگانا (Investment) ہو تمام ہی معاشی معاملات میں زر (Money) کا عمل دخل کلیدی ہے۔

آیئے ان مشمولات کے حوالے سے کچھ غور وفکر کرلیں!

اسلامی جدید معاشی نظام میں بعض قدر مشترک ہونے کے باوجود ان کے اندر بے پناہ بنیادی اختلافات بھی ہیں، ان میں سب سے بڑا اختلاف ہے جدید معاشی نظام کا ''سود''۔ سود ہی وہ بنیاد ہے جس پر سرمایہ دارانہ نظام کی عمارت کھڑی ہے۔ جس کے اوپری منزلے پر نہایت آرام وآسائش کے ساتھ دنیا کی ایک مخصوص اور محدود آبادی جام ومینا سے سرشار براجمان ہے۔ جب کہ نچلے منزلے پر ایک بہت بڑی آبادی نان شبینہ سے بھی محروم ومحتاج ہے۔ مسلمان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں، بلکہ مسلمانوں کی معاشی حالت تو اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔

مجدد علم معاشیات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو اس

خستہ حالی کو بہت پہلے محسوس کرلیا تھا اور آپ نے اس کا علاج بھی تجویز فرمادیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ان امور کے علاوہ، جن میں حکومت دخل انداز ہے مسلمان اپنے معاملات باہم فیصل کریں تا کہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپے خرچ ہورہے ہیں، پس انداز ہوسکیں۔

(۲) بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے بنک کھولیں۔

(۳) مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔

(۴) علم دین کی ترویج واشاعت کریں۔

(بحوالہ: امام احمد رضا کے معاشی نکات، تحریر: پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی، کوئنز یونی ورسٹی کنیڈا، ماخوذ: تدبیر فلاح ونجات واصلاح: از امام احمد رضا، ناشر نوری مشن مالیگاؤں)

جدید معاشی نظام کے حوالے سے بازارکاری (Marketing) میں زر (Money) کے رول کا جائزہ مذکورہ بالا چار نکات کی روشنی میں لینے سے قبل اعلیٰ حضرت کی ایک اور فقید المثال تحریر ''کرنسی نوٹ کے مسائل'' (کفل الفقیہ) سے بھی استفادہ میں ضروری سمجھتا ہوں ملاحظہ کریں:

۱۹۰۵ء/ ۱۳۲۴ھ میں اعلیٰ حضرت کے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران حنفی امام شیخ عبداللہ میر داد آپ کے سامنے کرنسی نوٹ سے متعلق ۱۲؍سوالات پیش کیے تھے، اس وقت وہاں کرنسی نوٹ ایک نئی چیز تھی، اعلیٰ حضرت نے ان سوالات کے جوابات مرحمت فرمائے۔ ان بارہ سوالات میں سے چند بنیادی اور متعلقہ سوالات اوران کے جوابات شامل مقالہ کررہا ہوں مثلاً:

(تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: ص ۱۰ تا ۱۲، کرنسی نوٹ کے مسائل، از امام احدم رضا، پیش کش الرضا پبلی کیشن ممبئی، ناشر رضا اکیڈمی ممبئی)

سوال ۱ کیا نوٹ مال ہے یا رسید؟

جواب نوٹ قیمتی مال ہے رسید نہیں۔

سوال ٦ کیا اسے درہموں دیناروں اور پیسے کے ساتھ بیچنا جائز ہے؟

ہے۔
جواب　ہاں جائز ہے، جیسے عام شہروں میں لوگوں کے درمیان معمول ہے۔
سوال ۷　اگر اسے کپڑے کے بدلے لیا جائے، تو بیع متفایضہ ہوگی یا مطلق بیع ؟
جواب　یہ اصطلاحی ثمن ہے، لہٰذا کپڑے کے بدلے اسے لینا بیع متفائضہ نہیں، بلکہ مطلق بیع ہوگی۔
سوال ۸　کیا اسے قرض میں دینا جائز ہے اور اگر جائز ہے، تو اس کے مثل کے ساتھ ادائیگی ہوگی یا دراہم کے ساتھ؟
جواب　ہاں اسے بطور قرض دینا جائز ہے اور ادائیگی صرف اس کے مثل کے ساتھ ہوگی۔
سوال ۹　کیا اسے بطور ادھار مقررہ مدت تک درہموں کے بدلے بیچنا جائز ہے؟
جواب　ہاں جائز ہے بشرطیکہ مجلس میں نوٹ پر قبضہ کرے تاکہ دین کے بدلے دین نہ ہو۔
سوال ۱۰　کیا اس میں بیع سلم جائز ہے، مثلاً ایسے نوٹ کے بدلے جس کی نوع اور صفت معلوم ہو ایک مہینہ پیشگی درہم دینا؟
جواب　ہاں نوٹ میں بیع سلم جائز ہے۔
سوال ۱۱　نوٹ میں لکھی ہوئی روپوں کی تعداد سے زائد کے بدلے اس کی بیع جائز ہے؟ مثلاً دس کا نوٹ ۱۲؍ یا ۲۰ روپے یا اس سے کم کے ساتھ بیچان کیسا ہے؟
جواب　ہاں اس سے کم یا زیادہ کے ساتھ جس طرح دونوں فریق راضی ہوں، سودا کرنا جائز ہے۔
سوال ۱۲　اگر یہ جائز ہے، تو کیا یہ بھی جائز ہے کہ جب زید، عمرو سے دس روپے بطور قرض لینا چاہے، تو عمرو کہے میرے پاس درہم نہیں البتہ میں دس کا نوٹ تم پر ۱۲؍ روپے میں بیچتا ہوں تم ہر مہینے ایک روپے ادا کرتے رہنا، کیا اسے سود کا حیلہ سمجھتے ہوئے اس سے روکا نہیں جائے گا؟ اور روکا نہ جائے تو اس میں اور سود میں کیا فرق ہے کہ یہ حلال ہے اور (وہ) حرام، حالاں کہ دونوں کا نتیجہ ایک ہے، یعنی زائد مال حاصل کرنا۔
جواب　ہاں جائز ہے اور واقعی سودے کی نیت کرے، قرض کی نہیں، اگر قرض ہوگا تو حرام اور سود

ہوگا کیوں کہ یہ ایک ایسا قرض ہے، جس کے ذریعے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا سوالات اوران کے جوابات زر(Money) کی بازارکاری(Marketing) میں زبردست رول ادا کرسکتے ہیں۔ نیز غیر سودی بنکاری اوراسٹاک ایکسچنج مارکیٹ کواسلامی انقلابی فکر سے مالا مال کرسکتے ہیں۔

مولوی امید علی صاحب (۱۳۱۸ھ/۱۸۹۹ء) میں موضع چرقاضی پورڈاک خانہ سوبگاچہ، ضلع پاپنا، ملک بنگالہ سے ایک استفتا اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ان الفاظ میں روانہ کیا کہ: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ روپیہ کمانا کس وقت فرض ہے، کس وقت مستحب، کس وقت مکروہ، کس وقت حرام اورسوال کرنا کب جائز ہےاور کب ناجائز؟

اس مختصر سے سوال کے جواب میں اعلیٰ حضرت نے ایک رسالہ بعنوان ''خیرالآمال'' تحریر فرمایا جسے الرضا پبلی کیشن کی پیش کش پر رضا اکیڈمی ممبئی نے ''تجارت کا جائز طریقہ'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس رسالے میں اعلیٰ حضرت نے وقت کے حوالے سے روپیہ کمانے کے ۹؍احکامات تحریر فرمائے ہیں۔ جواس طرح ہیں:

(۱) فرض (۲) واجب (۳) سنت (۴) مستحب (۵) مباح (۶) مکروہ تنزیہی (۷) اسائت (۸) مکروہ تحریمی (۹) حرام۔

اس رسالہ کے ص:۱۱؍ پر آپ تحریر فرماتے ہیں: احکام کسب کی طرف سے چلیے 'فاقول وباللہ التوفیق' ظاہر ہے کہ کسب یعنی تحصیل مال خواہ روپیہ ہو یا طعام یالباس یا کوئی شے سبب وغرض دونوں سے ناگزیر ہے اوراحکام نو۹؍گانہ میں پہلے چار جانب طلب ہیں، جن میں فرض وواجب دونوں کی طلب جازم ہے اورسنت ومستحب کی غیر جازم اورپچھلے چار جانب نہی ہیں، جن میں مکروہ تنزیہی واسائت سے نہیں ارشاد اورتحریمی وحرام سے حتمی اورمباح وطلب ونہی دونوں سے خالی ہے، اب اگر سبب وغرض دونوں اقسام تسعہ سے ایک ہی قسم کے ہیں جب تو ظاہر وہی حکم کسب پر ہوگا، مثلاً ذریعہ بھی فرض اورغرض بھی فرض، تو ایسا کسب دوہرا فرض ہوگا اوردونوں حرام تو دونا

حرام علیٰ ہذا القیاس۔ چناں چہ ذریعہ اور غرض یہ وہ دو عوامل ہیں جو کسب (روپیہ کمانے) کے عمل کو متعین کرتے ہیں کہ یہ عمل فرض ہے...... یا...... حرام، اس کی روشنی میں آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ کی کمائی کس زمرہ میں آتی ہے۔

فی زمانہ ''کمائی'' عموماً روپے پیسے کی شکل میں ہوتی ہے، جسے علم معاشیات میں ''زر'' (Money) کہا جاتا ہے، ماہرین معاشیات کہتے ہیں:

Money is a matter of functions four a medium, a measure, a standard a store.

(Monetary Economics, by Suray B.Gupta, Page3)

معیشت میں روپیہ چار کام انجام دیتا ہے: اول تبادلہ کا ذریعہ (Medium of Exchange) دوم قدر پیمائی (Measure of value) سوم بعد کی ادائیگی کا پیمانہ (Standard of deferred payment) چہار قدر کی ذخیرہ اندوزی (Store of Value)۔

ماہرین معاشیات اس پر متفق ہیں کہ ''قدر پیمائی'' ''تبادلہ کا ذریعہ'' کا پرتو ہے۔ اسی طرح ''بعد کی ادائیگی کا پیمانہ''، ''قدر کی ذخیرہ اندوزی'' کا پرتو ہے چناں چہ زر کے دو ہی کام ہیں، اول تبادلہ کا ذریعہ دوم قدر کی ذخیرہ اندوزی۔ زر کے ان افعال نے بازار کاری (Marketing) کے عمل کو آج بہت آسان بنا دیا ہے۔

بازار کاری ایک ایسا عمل ہے، جہاں خریدنے اور بیچنے والے اکٹھا ہو کر خرید و فروخت کا عمل انجام دیتے ہیں، اس کی بے شمار قسمیں بتائی جا سکتی ہیں، جتنی اشیا اتنے بازار، لیکن ان تمام بازاروں کو ہم درج ذیل بازاروں میں تقسیم کریں گے۔

(۱) صَرف بازار (Consumption Market) (۲) زر بازار (Money Market or Banking) (۳) سرمایہ بازار (Capital Market)۔

آیئے ان تینوں بازاروں میں زر یعنی Money کا کیا عمل دخل ہے، اس کا جائزہ لیں۔

(ا) صَرف بازار: اس بازار میں صارفین وہ اشیا خریدتے ہیں، جنہیں وہ خریدنا چاہتے ہیں یا انہیں خریدنا پڑ جاتا ہے، اس شے کی طلب اور رسد زر کی شکل میں اس کی قیمت متعین کرتے ہیں، اس قیمت پر خریدنے کا فیصلہ خریدار اس وقت کرتا ہے، جب اس شے سے ملنے والی افادیت (Utility) زر کی مقدار کے برابر ہوتی ہے۔ اگر خریدار کی نظر میں شے کی افادیت کم ہے، تو وہ کم خریدے گا یا نہیں خریدے گا اور افادیت زر سے زیادہ ہے، تو وہ زیادہ خریدے گا، اسی طرح سے تاجر بھی اپنے نفع ونقصان کے پیش نظر شے کے فروخت کا فیصلہ کرتا ہے۔

دنیاوی بازار میں دونوں فریق (خریدنے اور بیچنے والا) اپنے مفاد کا بھرپور خیال رکھتے ہیں، جس کے سبب تجارت میں حسب ضرورت دونوں جائز وناجائز دونوں طریقوں کا استعمال کرتے ہیں، جب کہ اسلامی صَرف بازار میں جائز طریقوں سے تجارت کی ترغیب دی گئی ہے۔ مثلاً جو کپڑا آپ فروخت کر رہے ہیں اگر اس میں کچھ نقص ہے، تو خریدار کو آپ نقص بتا کر فروخت کریں، اسی طرح سے وزن بڑھانے کے لیے نیچے کے گیہوں کو گیلا کر لیں اور اوپر خشک گیہوں رکھ کر اگر آپ بیچنا چاہتے ہیں، تو آخرت میں آپ کی گرفت یقینی ہے۔

اپنے رسالہ ''خیرالآمال'' (تجارت کا جائز طریقہ) میں (جس کا اوپر ذکر کیا گیا) اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے کسب یعنی تحصیل مال میں صرف روپیہ کا شمار نہیں فرمایا ہے، بلکہ طعام یا لباس یا کوئی شے بھی شامل فرمایا ہے، اگر کسی شے کے حصول کا ذریعہ اور اس کی غرض دونوں فرض ہیں تو ایسا کسب دوہرا فرض ہوگا، مثلاً ایک شخص نے حمالی کے ذریعہ کچھ روپیہ کمایا ہے اور اس کے بچے بھوکے ہیں، تو اس پر دوہرا فرض یہ کہ وہ اناج خریدے نہ کہ شراب۔ چناں چہ اعلیٰ حضرت کی تحریر کے مطابق صرف بازار میں اپنا روپیہ کیسے خرچ کرنا ہے اس کی پوری پوری رہنمائی صارف حاصل کرتا ہے۔

(اا) زر بازار (Money Market of Banking): زرِ بازار وہ بازار ہے، جہاں ''مستقبل میں زر (Money) کے استعمال'' خرید وفروخت ہوتی ہے، زر بیچنے والوں کو آپ قرض

دینے والا (Money Lender) سمجھ لیجیے، مثلاً ساہوکار یا بنک وغیرہ۔ اس کے برعکس زر خریدنے والے کو آپ قرض لینے والا (Borrower) سمجھ لیجیے، بالخصوص سرمایہ دارانہ نظام میں قرض دینے والے ایک خاص منافع پر اپنا زر (Money) قرض لینے والے کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ عام زبان میں اس عمل کو ہم قرض لینے دینے کا عمل کہتے ہیں، جو نقصان سے قطع نظر ایک خاص منافع کی شرط پہ منعقد ہوتا ہے، یہ خاص منافع ''سود'' ہے، چناں چہ اس بازار میں سود پر قرض کا لین دین ہوتا ہے، قرض لینے والا اس قرض کو جیسے خرچ کرنا چاہے، وہ اسے خرچ کرسکتا ہے، چاہے وہ اسے اپنے صرف (Consumption) پر خرچ کرے چاہے زراعت، تجارت یا صنعت وحرفت پر بہر حال اسے ''سود'' ادا کرنا ہوتا ہے۔

ہندوستان میں قرض مہیا کرنے والے روایتی ادارے بھی ہیں۔ (مثلاً ساہوکار، بنئے، وغیرہ وغیرہ) اور جدید ادارے بھی ہیں مثلاً بنک وغیرہ۔ روایتی ادارے عموماً بہت زیادہ شرح سود پر قرض دیتے ہیں، جبکہ جدید اداروں کی شرح سود نسبتاً کم ہوتی ہے، اس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات ہیں، جن کے سبب ساہوکاروں (روایتی اداروں) کے مقابلے میں بنک (جدید ادارے) کو قبول عام حاصل ہے۔ (ویسے اول الذکر ابھی بھی بازار زر میں ہیں) چناں چہ ہم اپنی بات بنک تک ہی محدود رکھیں گے۔

بنک کسے کہتے ہیں؟: بنک ایک ایسا ادارہ ہے، جو لوگوں سے ایسی امانت (Deposit) قبول کرتا ہے، جسے چیک کے ذریعہ واپس (Withdraw) لیا جاسکتا ہے اور جسے سود پر لوگوں کو بطور قرض دیا جاسکتا ہے۔

بنکاری نہایت قدیم کاروبار ہے۔ بابل اور روم کی قدیم تہذیبوں میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ اٹلی کی نشاۃ الثانیہ اور پھر ۱۷ ارویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں جدید خطوط پر بنک کی شروعات ہوئی۔ لفظ بنک غالباً اطلاوی لفظ BANCO سے ماخوذ ہے، جس کے معنی بینچ ہے۔ لندن کے لومبارڈ واسٹریٹ میں بینچ پر بیٹھ کر سونار، یہودی وغیرہ لوگوں سے امانت قبول کرتے اور اس

امانت کو سود پر حکومت، صناعوں، تاجروں اور دیگر ضرورت مندوں کو بطور قرض دیا کرتے تھے،
Lawrence S.Tiller اور William L.Silber اپنی کتاب Principles of Money, Banking and Financial Markets کے ساتویں ایڈیشن کے ص:۱۷۶ پر رقم طراز ہیں کہ (تجارتی) بنک ایک ایسا مالیاتی ادارہ ہے، جو کئی مختلف النوع خدمات پیش کرتا ہے جس میں چیکنگ حسابات اور کاروبار قرض شامل ہیں۔

بنک کی اہم خصوصیات یہ ہے کہ یہ مالیاتی ادارہ قصیر المدتی قرضے (Short term Loans) سود پر مہیا کرتا ہے۔

سودی بنکوں کی کارگزاریاں: (Functions) ذیل میں درج کی جارہی ہیں:

(۱) قبول امانت (Acceptance of Deposit): بنک چار قسم کی امانتیں قبول کرتا ہے، مثلاً:

(i) رواں حسابات (Current Accounts)

(ii) بچت حسابات (Saving Accounts)

(iii) معیادی حسابات (Fixed Accounts)

(iv) مراجعتی حسابات (Recurring Accounts)۔ جتنی طویل مدت کے لیے امانت رکھی جاتی ہے، اتنا ہی زیادہ سودی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

(۲) قرض کی پیش کش (Advancement of Loan): یہاں بھی بنک چار قسم کے قرضے سود پر قرض خواہوں کو فراہم کرتا ہے جو ذیل میں بالاختصار درج ہیں:

(i) نقد قرض (Cash Draft) (ii) زائد قرض (Over-Draft) یعنی زائد اجمع رقم بطور قرض نکالنا (iii) یک مشت قرض (Loan) (vi) ہنڈی توڑنا۔ (Disconting of Bill of Exchange) اسے آپ منہائی قرض بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۳) تخلیق زر کی کارگزاری (Credit Creation Function)

(۴) غیر بنک کاری کارگزاریاں: اس کی تین قسمیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) بطور گماشتہ/ ایجنٹ کارگزاریاں (Agency Function)

(ب) عمومی افادیتی خدمات (General Litility Cervices)

(ج) سماجی بنکاری خدمات (Social banking Services)

ان چار کارگزاریوں میں سوائے چوتھی کارگزاری کی بقیہ تمام کارگزاریوں میں بنک سودی کاروبار کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بنک بغیر سودی کاروبار کیے درج بالا تمام کارگزاریاں انجام دے سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ شریعت نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور بیع کو حلال، جدید بنکس کی شریانوں میں غلیظ سودی خون دوڑتا ہے، جب کہ اسلامی بنکوں کے پیکر میں منافع کا صالح خون گردش کرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے شریعت کے اس کلیدی ضابطے کا اظہار اپنی تحریر "تدبیر فلاح ونجات واصلاح" (ناشر: نوری مشن مالیگاؤں، ص:۱۲) میں یوں فرمایا ہے کہ: ثالثاً ممبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کے لیے بنک کھولے، سود شرع نے حرام قطعی فرمایا ہے مگر اور سو طریقے نفع لینے کے حلال فرمائے ہیں، جن کا بیان کتبِ فقہ میں مفصل ہے اور اس کا ایک نہایت آسان طریقہ کتاب "کفل الفقیہ الفاہم" میں چھپ چکا ہے۔

اعلیٰ حضرت کا یہ ارشاد علم معاشیات سے متصادم نہیں ہے، بلکہ اس کے متوازن ہے، شریعت نے "سو طریقے نفع لینے" کے جو بتلائے ہیں، اس پر ایک زمانے تک اسلامی معیشت کار بند رہی ہے۔ یہ ایسا درس تھا، جسے مسلمانوں کی سیاسی غلامی نے ذہنوں سے محو کر دیا تھا، اعلیٰ حضرت نے اس سبق کو پھر سے یاد دلایا ہے۔

قابلِ ذکر بات ہے کہ جب زر کا تبادلہ اشیا سے ہوتا ہے، تو منافع جنم لیتا ہے، عام بازاروں میں زر کے بدلے تاجر جب اپنی اشیا فروخت کرتا ہے، تو اسے منافع حاصل ہوتا ہے، جب کہ بنک ایک ایسا بازار ہے، جہاں زر کا تبادلہ زر سے ہوتا ہے۔ زر کے ذریعے ایک متعنیہ مدت کے لیے زر

قرض لینے کے نام پر خریدا جاتا ہے، زر کی یہ خرید وفروخت ایک متعنیہ شرح پر ہوتی ہے، جسے سود کہا جاتا ہے، مثلاً زید نے بکر کے ہاتھوں ۱۰ رفیصد شرح سود پر ایک سال کے لیے ایک لاکھ روپے فروخت کیا (یعنی بطور قرض دیا) سال بھر گزرنے پر بکر زید کو ایک لاکھ دس ہزار روپے دینے کا پابند ہے، یہ دس ہزار سود ہے، لیکن زر کی اس فروخت میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ بکر جو ایک لاکھ روپیہ سال بھر کے لیے حاصل کر کے کاروبار کرتا ہے، اس کے منافع میں سے زید دس ہزار کا حق دار تو بن گیا، لیکن اگر زید کو کاروبار میں نقصان ہوتا ہے، تو اس نقصان کا کیا؟ یہیں پر سودی بنکاری شریعت اسلامیہ سے متصادم ہے اسی سبب سے اعلیٰ حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ ''سود شرع نے حرام قطعی فرمایا ہے، مگر سو طریقے نفع لینے کے حلال فرمائے جن کا بیان کتبِ فقہ میں مفصل ہے۔''

آیئے دیکھتے ہیں کہ کتبِ فقہ میں نفع لینے کے حلال طریقے کون کون سے ہیں۔ ان حلال طریقوں کا ایک اجمالی خاکہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس بات کو ہم پہلے جان لیں کہ زر بذات خود زر پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، مثلاً زر آپ اپنی تجوری میں رکھیں یا بنک میں اگر استعمال میں نہ آئے تو عددی طور پر اس میں کوئی بھی اضافہ ناممکن ہے جب تک زر کے ساتھ انسانی محنت وصلاحیت روبہ عمل نہ ہو تو عددی طور پر اس میں نہ ہی کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کمی۔ چناں چہ زر بذات خود بانجھ ہے۔

کتب فقہ میں نفع لینے کے حلال طریقے: نفع لینے کے حلال طریقوں کا اجمالی خاکہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مضاربت: اس کے مطابق بنک غیر سودی بنیادوں پر سرمایہ فراہم کرے گا۔ کاروبار کرنے والا شخص بنک سے غیر سودی بنیادوں پر سرمایہ حاصل کر کے اپنے کاروبار میں لگائے گا اور جو نفع حاصل ہوگا وہ ایک متعینہ تناسب کے حساب سے بنک اور کاروباری شخص کے درمیان تقسیم ہوگا اور اگر کاروبار میں نقصان ہوا، تو طے شدہ معاہدے کے تحت بنک وہ نقصان اٹھائے گا۔

(۲) مشارکت: اس طریقہ کار میں دونوں فریق (بنک اور کاروباری شخص) سرمایہ کاری کریں گے اور

دونوں مل کر کاروبار کریں گے اور جو نفع حاصل ہوگا طے شدہ معاہدہ کے مطابق دونوں میں تقسیم ہوگا اور اگر نقصان ہوتا ہے تو ہر فریق اپنے اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے نقصان اٹھائے گا۔

(۳) مرابحہ: یہ طریقۂ کار بڑا سیدھا سا ہے، جو ایک مثال سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً زید کو اپنے کارخانے کے لیے ایک مشین درکار ہے، جس کی آج بازار میں قیمت دس لاکھ روپے ہے آج زید اتنی بڑی رقم یک مشت خرچ کر کے مشین خریدنے کی پوزیشن میں نہیں ہے، غیر سودی بنک آج دس لاکھ کی یہ مشین خرید کر زید کے ہاتھوں بارہ لاکھ روپے میں اس رعایت کے ساتھ فروخت کرتا ہے کہ وہ یہ بارہ لاکھ روپے سال بھر میں قسط وار ادا کرے، مثلاً ہر ماہ ایک لاکھ روپے۔ ایسا کرنے سے بنک نے دو لاکھ روپے کما لیا۔ غیر سودی بنک کا یہ طریقۂ کار سب طریقوں سے زیادہ مقبول طریقہ ہے۔

(۴) بیع موجل: اس طریقۂ کار میں اپنے خریدار زید کو تاخیر سے ادائیگی کی سہولت کے ساتھ بنک ایک سامان فروخت کرتا ہے۔ لیکن یہ ادائیگی قسطوں میں نہیں بلکہ یک مشت ہوتی ہے۔ مثلاً بنک دس لاکھ کی ایک مشین خرید کر زید کو بارہ لاکھ روپے میں ایک سال کی ادائیگی کی مہلت کے ساتھ فروخت کرتا ہے۔ سال کے گزرنے پر زید بارہ لاکھ روپے بنک کو ادا کرے گا، چناں چہ بنک نے دو لاکھ روپے کما لیا۔

مرابحہ اور بیع موجل میں ایک اور فرق ہے، مرابحہ میں فروخت کی گئی شے کی قیمت خریدار کو معلوم ہوتی ہے، جب کہ بیع موجل میں بنک کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی قیمت خرید سے خریدار کو آگاہ کرے۔

بعض فقہا نے بنک کے ذریعے کمائے گئے اس دو لاکھ روپیہ کو سود قرار دیا ہے، جب کہ فقہائے احناف نے اس بنیاد پر جائز قرار دیا ہے کہ فروخت کرنے والا شخص اپنا سامان جس قیمت پر چاہے فروخت کر سکتا ہے۔ یہ خرید و فروخت ویسی ہی ہے، جیسی کہ عام طور پر بازاروں میں کسی شے کا تبادلہ زر سے کر کے تاجر منافع کماتا ہے۔

یہاں یہ بتلانا دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ مضاربت اور مشارکت کے مقابلے میں مرابحہ اور بیع موجل بنکوں میں زیادہ منافع بخش اور مقبول طریقۂ کار رہے ہیں۔

(۵) بیع سلم: اس طریقۂ کار میں خریدار قیمت پہلے ادا کرتا ہے اور مال بعد میں طے شدہ متعینہ مدت پر بنک خریدار کو دیتا ہے، اس کی ایک صورت اور بھی ہے جسے بیع استسفاء کہتے ہیں، جس کے مطابق خریدار سامان کی قیمت کی پیشگی ادائیگی کرتا ہے اور فروخت کرنے والا اس سامان کو تیار کر کے خریدار کو بعد میں مہیا کرتا ہے۔

بیع سلم اور بیع موجل ایک دوسرے کی ضد ہیں، بیع سلم میں قیمت پہلے ادا کی جاتی ہے، سامان بعد میں ملتا ہے جب کہ بیع موجل میں سامان پہلے مل جاتا ہے، قیمت بعد میں ادا کی جاتی ہے۔

(۶) اجارہ: اس طریقۂ کار میں بنک اپنے مالکانہ حقوق کی ایک شے (مثلاً رہائشی مکان) کسی کو کرائے پر دے اور ساتھ ہی ساتھ اسے اسی شخص کے ہاتھوں میں فروخت بھی کر دے۔ لیکن اس شے کی قیمت قسطوں میں کرائے کے ساتھ وصول کرے۔

مثلاً ماضی میں بنک نے ایک مکان دس لاکھ روپے میں خریدا تھا اور آج زید کے ہاتھوں اسی مکان کو بارہ لاکھ روپے میں بنک سال بھر کی مدت ادائیگی کے ساتھ فروخت کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی سال بھر کے لیے زید کو ہی کرائے پر دینا بھی چاہتا ہے، اگر زید اس پر راضی ہے تو وہ ہر ماہ بنک کو (مکان کی قیمت کا ایک لاکھ روپیہ اور مکان کے کرائے کا دس ہزار روپیہ) ایک لاکھ دس ہزار روپے ادا کرے گا۔ سال بھر میں تمام ادائیگیوں کے بعد مکان کے مالکانہ حقوق بنک زید کے نام منتقل کر دے گا اس طرح بنک (مکان کی قیمت پر دو لاکھ روپے اور مکان کے کرائے کے نام پر ایک لاکھ بیس ہزار روپے) تین لاکھ بیس ہزار کما لیتا ہے۔

مضاربت اور مشاکرت کے مقابلے میں بقیہ تمام طریقۂ کار منافع کمانے کے لیے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اول الذکر دونوں طریقوں سے بہ مشکل پانچ فی صد منافع بنک کو ملتا ہے جب کہ تمام تر منافع دوسرے طریقۂ کار سے حاصل ہوتے ہیں۔

سودی بنک کے حصول زر کے ذرائع: اجمالاً انہیں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) جدید بنک شیئر فروخت کر کے زر کی فراہمی کرتا ہے، جسے وہ سودی کاروبار میں لگاتا ہے۔

(۲) سود کی لالچ دے کر مختلف حسابات (Accounts) کے نام پر (جیسا کہ اوپر درج کیا جاچکا ہے) امانتیں جمع کرتا ہے۔

(۳) حسبِ ضرورت دوسرے بنکس اور مالیاتی اداروں سے بھی قرض وغیرہ لے سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

بہر حال ان تمام ذرائع کا تعلق سودی کاروبار سے ہے، جو غیر سودی بنکوں کے لیے قطعی طور پر نا قابل قبول ہیں۔ غیر سودی بنک انہیں ذرائع سے زر کی فراہمی کرسکتا ہے، لیکن فرق صرف اتنا ہوگا کہ کسی بھی ذریعہ سے حاصل کیا گیا زر سود کی لالچ کے بجائے نفع اور نقصان میں حصہ داری کے نام پر ہوگا۔ چناں چہ کچھ مال دار حضرات (جیسا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے بنک کھولیں، نیز مقدمہ بازی، غیر پیداواری اخراجات پر لگا لگا کر) رقم پس انداز کریں۔ یہ رقم بنک کے شیئر خریدنے اور بنکوں میں بطور امانت (Deposit) رکھنے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے اسی طرح غیر سودی بنک دوسرے غیر سودی مالیاتی اداروں اور بنکوں سے زر کا حصول کرسکتا ہے، بہر حال ان حصول زر کی بنیاد سود کی بجائے نفع ونقصان میں حصہ داری پر ہوگی۔

اسی طرح سے غیر سودی بنک نفع ونقصان میں حصہ داری کی بنیاد پر تخلیق زر (Credit Creation Function) کی انجام دہی بھی کرسکتی ہے، (غیر سودی بنک کے اس کارگزاری پر گفتگو بہر کیف طوالت طلب ہے، اس عنوان پر پھر کبھی گفتگو کی جائے گی۔

غیر سودی بنک کی غیر بنکاری کارگزاریاں (Non-Banking Functions):

اپنے گاہکوں کی درخواست پر بنک یہ خدمات ادا کرتا ہے، ان کارگزاریوں کو درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) بطور گماشتہ/ایجنٹ کارگزاریاں (Agency Functions)

(ب) عمومی افادیتی خدمات (General Utility Services)

(ج) سماجی بنکاری خدمات (Social Banking Services)

آیئے غیر سودی بنکوں کی ان کارگزاریوں کا مختصراً جائزہ لیں:

(الف) بطور گماشتہ/ ایجنٹ کارگزاریاں: بنک بطور ایجنٹ بھی اپنی خدمات انجام دے سکتا ہے اوران کے عوض ''معاوضہ خدمت'' (service charge) وصول کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرسکتا ہے، اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ مالیاتی دستاویزات مثلاً چیک، ہنڈی وغیرہ جمع کرنا اوران کی ادائیگی کرنا اگر سودی لین دین نہیں ہے تو

☆ رقومات کی منتقلی بحوالہ مقام وافراد

☆ اپنے کھاتے داروں کے اکاؤنٹ سے قرض، بجلی کے بل وغیرہ کی ادائیگی۔

☆ بطور متولی یا ناظم وصیت ناموں کا نفاذ

☆ حصص (shares) وغیرہ کی خرید وفروخت اوران پر ملنے والے منافع کا اپنے گاہکوں کی جانب سے وصولیابی

(ب) عمومی افادیتی خدمات: ان خدمات کے صلے میں بھی معاوضہ خدمت (Service charge) حاصل کر کے بنک اپنی آمدنی میں اضافہ کرسکتا ہے۔ مثلاً

☆ اپنے گاہکوں کے نام پر ذاتی اور تجارتی خط اعتبار (Latter of Vredit) بنک جاری کرسکتا ہے تاکہ اس خط کی بنیاد پر گاہک بازار میں روپیوں کے بغیر بھی لین دین کر سکے۔

☆ اپنے گاہک کے لیے زرمبادلہ (Foreign Exchange) کی خرید وفروخت بنک کرسکتا ہے۔

☆ مناسب اجرت پر گاہک کو ''محفوظ تحویل'' (Safe Deposite) کی سہولت بہم پہنچا سکتا ہے۔

☆ کاروبار میں درکار تجارتی وصنعتی اعداد وشمار اور دیگر معلومات کاروباری شخص کو مہیا کرسکتا ہے۔

☆ سفری چیک جاری کرسکتا ہے۔
☆ عوامی اداروں کے ذریعہ لیے گئے قرضوں کی واپسی کی تحریری ضمانت بنک دے سکتا ہے، اگر یہ قرض غیر سودی ہو تو۔

(ج) سماجی بنکاری خدمات: فی زمانہ سماجی بنکاری خدمات نامی ایک نیا باب بنک کی کار گزاریوں میں شامل ہو گیا ہے۔ بنک کچھ خدمات ادا کر کے سماج سے اگر منافع کماتا ہے تو سماج کے لیے کچھ ایسی خدمات بھی اسے ادا کرنا چاہے جو منافع کے بغیر ہو۔ بنک اگرچہ ایک منافع کمانے کے مقصد سے قائم کیا گیا ایک کاروباری ادارہ ہے لیکن آج اس سے یہ توقع بھی رکھی جارہی ہے کہ منافع کے بغیر بھی یہ ادارہ سماج کو کچھ خدمات دے۔ ان خدمات کا کوئی عوض جدید بنکوں کو نہیں ملتا اس کے برعکس کچھ نہ کچھ اخراجات کا بوجھ بنک کے خزانے پر ضرور پڑتا ہے چناں چہ بادل نخواستہ جدید بنکوں کو اس کام کا بوجھ ڈھونا پڑتا ہے۔

اسلامی اصولوں پر اگر غیر سودی بنک اس کام کی انجام دہی کرے تو یہ کام اسے بوجھ نہیں معلوم ہوگا بلکہ اس کے کارندوں کے لیے اطمینان قلب کا سبب بنے نیز بنک کے خزانے پر بھی کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔

صاحب نصاب افراد پر اسلام نے زکوٰۃ فرض قرار دیا ہے، اسلام صدقات وخیرات کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ زکوٰۃ وصدقات وخیرات کی راہ سے اسلام دولت کی مساویانہ تقسیم کے بجائے منصفانہ وعادلانہ تقسیم کو ترجیح دیتا ہے غیر سودی بنک ان مدات میں آئی ہوئی رقومات سے ایک الگ شعبہ قائم کرسکتا ہے اور شریعت کی روشنی میں غریبوں، قلاشوں، یتیموں، بیواؤں، معذوروں، مسافروں اور دیگر مستحقین کی منظم طور پر مالی اعانت کرسکتا ہے۔

(III) سرمایہ بازار: یہ تیسرا اہم بازار ہیں جہاں عصری معیشت میں زر اپنا گراں قدر رول ادا کرتا ہے آیئے پہلے ہم نہایت اختصار کے ساتھ اس بازار کے معنی اور ہیئت کا جائزہ لیں۔

سرمایہ بازار یعنی کیا؟ عام فہم الفاظ میں سرمایہ بازار وہ بازار ہے، جہاں سرمائے کا لین دین ہوتا

ہے، اس لین دین میں عیاں خانوں کے ساتھ ساتھ نہاں خانوں میں بھی ''زر'' (Money) کی کرم فرمائی ہوتی ہے۔ زر بازار (Money Market) کاروبار وضروریات پر صرف کرنے کے لیے اگر قصیر المدتی (Short Term) صرفہ بشکل زر مہیا کرتا ہے، تو سرمایہ بازار کاروباری وتجارتی مقاصد کے لیے کثیر المدتی (Long Term) صرفہ بشکل زر فراہم کرتا ہے۔

Thomas Mayer, J.S.Duesunberry and Robert Z.Aliber نے اپنی کتاب Money, Banking and The Economy کے دوسرے ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۲۹ر پر تحریر فرماتے ہیں کہ (ترجمہ) ''سرمایہ بازار فاضل (آمدنی) رکھنے والی اکائیوں سے خسارہ (آمدنی) رکھنے والی اکائیوں کی طرف فنڈ کو بڑے پیمانے پر منتقل کرتا ہے۔''

L.R.Ritter and W.L.Silber اپنی کتاب Pricnciples of Money, Banking and Financial Markets کے ساتویں ایڈیشن کے صفحہ ۲۵ پر سرمایہ بازاری کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ (ترجمہ) ''مالیاتی (سرمایہ) بازار بچت کر کے قرض دینے والوں اور قرض لے کر خرچ کرنے والوں کے درمیان (سرمایہ) ارسال کرنے کی ترکیب ہے۔'' انہیں دونوں ماہرین کے مطابق سرمایہ بازار طویل مدتی تحفظات (Long Term Securities) اور زر بازار مختصر مدتی تحفظات (Short Term Securities) کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ سال بھر سے زائد مدت کو طویل مدت سمجھا جاتا ہے۔ اسٹاک مارکیٹ سرمایہ بازار کا نہایت اہم حصہ ہے۔

مشترک سرمایہ کمپنی (Joint Stock Company) اپنے جیسی بہت ساری اکائیوں میں سے ایک ہوتی ہے جو سرمایہ بازار سے حصول سرمائے کے لیے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔

ایک مشترک سرمایہ کمپنی سرمایہ بازار سے کس طرح سرمایہ حاصل کرتی ہے؟

یہ کمپنی سرمایہ بازار میں اپنے حصص (Shares) اور تمسکات (Debentures)

فروخت کر کے سرمایہ حاصل کرتی ہے، آیئے اس طریقۂ کار پر ایک نظر ڈالیں۔

حصص (Shares): مشترک سرمایہ کمپنی حصص فروخت کر کے سرمایہ حاصل کرتی ہے۔ یہ حصص دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اول، ترجیح حصص (Preferencial Shares) دوم۔ عام حصص (Equity Shares) آیئے ان دونوں حصص کا جائزہ لیں۔

اول ترجیحی حصص: مشترک سرمایہ کمپنی (Joint Stock Company) کے قیام کے لیے کچھ افراد آگے آتے ہیں۔ ابتدائی قانونی اور مالیاتی معاملات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر کمپنی قائم کرتے ہیں۔ یہ حجرات کمپنی کو جو رقم فراہم کرتے ہیں اس کے عوض میں کمپنی کے ترجیحی حصص (Preferencial Shares) کے حق دارہ و جاتے ہیں۔ کمپنی کو نفع ملے یا نقصان، ترجیحی حصص رکھنے والیحضرات مستقبل میں ہر سال ایک متعنیہ شرح کے مطابق کمپنی سے منافع حاصل کرتے ہیں اس منافع کو Dividend (منافع میں حصہ) کہا جاتا ہے۔

Dividend منافع میں ایک حصہ ہے لیکن اپنے اصل کے اعتبار سے یہ سود ہی ہے۔ کیوں کہ Dividend کا تعلق کمپنی کو ملنے والے منافع سے ہی ہوتا ہے لیکن کمپنی کے نقصان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کمپنی کو چاہے نفع ملے یا اسے نقصان اٹھانا پڑے ترجیحی حصص رکھنے والوں کو بہر حال ایک متعنیہ شرح کے مطابق Dividend ضرور ملتا ہے۔ سچ پوچھو تو شریعت کی روشنی میں Dividend کا لبادہ اوڑھے ہوئے یہ سود (Interest) ہی ہے۔

ترجیحی حصص رکھنے والوں کو Dividend نامی یہ خصوصی فائدہ کمپنی کیوں دیتی ہے؟ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً:

(الف) اسٹارک مارکٹ عام حصص کے فروخت سے پہلے بڑی مقدار میں کچھ حضرات اپنا سرمایہ کمپنی کے سپرد اس وقت کر دینے کا خطرہ (Risk) مول لیتے ہیں، جب یہ کمپنی رحم مادر سے نوزائدہ طفل کے درمیانی دور سے گزرنا شروع ہوتی ہے، وجود میں آنے کے بعد بھی یہ نوزائدہ طفل انتہائی نگہداشت کا مستحق ہوتا ہے اور وہ لوگ یہ ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔

(ب) ترجیحی حصص ایک طرح کا ''ترغیبی صلہ'' ہے، جو ان حضرات کو ملتا ہے، جو کمپنی کو قائم کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں۔ کمپنی کے قیام کے تعلق سے تمام ابتدائی کارروائیاں کرنا، قانونی معاملات کی تکمیل کرنا، کمپنی کے لیے دیگر مالیاتی اداروں کے سامنے فضا سازگار کرنا، کمپنی کے لیے عوام میں اعتبار اور خیر خواہی (Goodwil) پیدا کرنا، ایسے کئی اہم امور کی انجام دہی کی ذمہ داری کاروباری دنیا میں مالی منفعت کے بغیر متصور نہیں۔ چناں چہ نئی کمپنی کے قیام کے لیے لوگ آگے آئیں، اس لیے ترجیحی حصص کے نام سے یہ ''ترغیبی صلہ'' (Inducement Gift) ان حضرات کو میسر ہوتا ہے۔

اسے کوئی بھی نام دیا جائے، ترغیبی صلے کے نام پر ملنے والا یہ منافع شریعت کی نظر میں بہر حال ''سود'' ہے۔ کیوں کہ کمپنی کے نفع اور نقصان کے ساتھ یہ تغیر پذیر نہیں ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے ہونا تو یہ چاہیے کہ اگر کمپنی کا نفع بڑھتا ہے، تو اسی تناسب سے ان کا Dividend بڑھے اور اگر کمپنی نقصان اٹھاتی ہے، تو مضاربت، مشارکت کے اصول کے مطابق جس کا جتنا زیادہ سرمایہ، تناسب کے اعتبار سے نقصان میں اس کا اتنا ہی زیادہ حصہ ہو۔ یہاں فقہائے عظام سے میں ایک رہنمائی کا خواستگار ہوں۔ کیا شریعت میں ایسی کوئی گنجائش ہے کہ کمپنی کے قیام کے لیے پہل کرنے والوں کو (جنھیں آج ترغیبی صلہ مل رہا ہے) کوئی ایسا ترغیبی صلہ دیا جا سکتا ہے جو سود نہ ہو؟ میرا قیاس ہے کہ شریعت میں ایسی کچھ راہیں نکالی جا سکتی ہیں مثلاً کمپنی کو نفع ملنے کی صورت میں خصوصی مراعات، خصوصی نذرانے، خصوصی انعامات جیسی خصوصی نوازشات وغیرہ۔ اس سال یہ خصوصی نوازش موقوف قرار دی جائے، جس سال کمپنی نقصان سے دوچار ہوتی ہے۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

دوم عام حصص (Equity Shares): کمپنی سرمایہ بازار (Stock Exchange Market) میں اپنے حصص فروخت کرتی ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ایک حصہ (Share) کی قیمت کم سے کم رکھی جاتی ہے تا کہ کوئی بھی اسے خرید سکے۔ کبھی کبھی کمپنی

براہ راست سرمایہ بازار میں اپنے حصص فروخت کرتی ہے اور کبھی اسٹاک بروکرس/ ایجنٹس کے ذریعے فروخت کرواتی ہے۔ حصہ (Shares) خریدنے کے بعد خریدار کمپنی کا حصے دار (Shareholder) بن جاتا ہے اور اتنی رقم کمپنی میں کاروبار کرنے کے لیے جمع ہو جاتی ہے۔ اسٹاک بروکر کے پاس برائے فروخت رکھے ہوئے حصص میں سے کچھ مالیت کے حصص اگر غیر فروخت شدہ رہ جاتے ہیں، تو وہ اتنا سرمایہ کمپنی کو فراہم کر دیتا ہے اور مستقبل میں ان حصص کو فروخت کرتا رہتا ہے۔ بہر حال کمپنی سے جاری کیے گئے حصص کسی بھی صورت میں کمپنی واپس نہیں خریدتی سوائے اس کے کہ کمپنی کا دیوالیہ پٹ جائے۔

ایک حصے دار (Shareholder) جب تک چاہے حصص اپنے پاس رکھ سکتا ہے اور سالانہ Dividend (منافع میں حصہ) حاصل کر سکتا ہے اور جب چاہے بازار قیمت پر اپنے حصص فروخت کر کے اپنا سرمایہ بازار سے نکال سکتا ہے۔

اس بات کا احتمال ہے کہ کمپنی کسی سودی کاروبار میں ملوث ہو جائے (مثلاً کسی بنک یا انشورنس کمپنی سے اپنا اثاثہ بیمہ (Underwrite) کروائے) تو ایسی کمپنی کے حصص خریدنے کا مطلب ہے سودی کاروبار میں مدد کرنا، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس لیے ان کی کمپنیوں کے حصص نہیں خریدے جاسکتے۔ بصورت دیگر حصص خریدنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی کمپنی سودی کاروبار کے کانٹوں سے اپنا دامن فی زمانہ بچا سکتی ہے؟ یہ ایک امر محال محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہونا ناممکن بھی نظر نہیں آتا۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے اپنے رسالے ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدر آباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے بنک کھولیں۔'' اسی تجویز سے حوصلہ پا کر یہ مشورہ دینے کی یہ ناچیز جسارت کر رہا ہے کہ مسلمان مشترک سرمایہ کمپنی (Joint Stock Company) قائم کرنے کی انہیں خطوط پر کوشش کریں جن خطوط پر اعلیٰ حضرت نے بنک کھولنے کا مشورہ دیا ہے۔

۱۹ر جنوری ۲۰۱۱ء بروز بدھ ممبئی سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت اردو اخبار روزنامہ انقلاب کے صفحہ ۳ پر شائع ایک خبر علم معاشیات کے مجھ جیسے طالب علم کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ یہاں مفتیان وفقہائے کرام کی شرعی رہنمائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ خبر یہ ہے کہ پی۔ ڈبلیو۔ ایم (Pragmatic Wealth Management Pvt.ltd) نامی ادارے کی تحریک پر چند علمائے ہند نے (اپنے دعوے کے مطابق) شریعت کی روشنی میں سرمایہ کاری کے میدان میں کچھ اصول بنائے ہیں۔ ان کے مطابق ''یہ بات محسوس کی گئی کہ اسٹاک ایکسچینج کی موجودہ صورت حال میں بعض شرعی قباحتیں شامل ہوگئی ہیں، لیکن چوں کہ شیئرز کی خرید وفروخت بنیادی طور پر شرکت کی ایک جدید شکل ہے اور شرکت کو شریعت اسلامی نے نا صرف جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ نیز موجودہ بنکنگ نظام اور انشورنس نظام کے مقابلے شیئرز کی خرید وفروخت شرعی اصولوں سے قریب تر ہے۔ اس لیے بعض امور کی رعایت کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اگر چہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس معیار کی رعایت کے ساتھ شیئرز کی خرید وفروخت مکمل طور پر شریعت کے دائرے میں آجاتی ہے۔ لیکن چوں کہ سرمایہ کاری کی مروجہ دوسری صورتوں کے مقابلے یہ صورت نسبتاً بہتر ہے اور اس میں کم مفاسد پائے جاتے ہیں۔ نیز مسلمان اس وقت خود اپنا نظام قائم کرنے کے موقف میں نہیں ہیں، بلکہ وہ مروجہ نظام کا حصہ بننے پر ایک حد تک مجبور ہیں، اس لیے موجودہ حالت میں مخصوص شرائط کے ساتھ انہیں قبول کرتے ہوئے عزم بھی رکھنا چاہیے اور کوشش بھی کرنی چاہیے کہ ہم مستقبل میں تمام شرعی مفاسد سے پاک مالیاتی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ذیل میں وہ ضوابط ومعیار درج کیے جارہے ہیں۔

(۱) جس کمپنی کا شیئر خریدا جارہا ہو، اس کا بنیادی کاروبار حلال ہو۔

(۲) اگر اس کمپنی نے سودی قرض لے رکھا ہو، تو وہ بارہ مہینوں کے اور مارکیٹ کیپٹلائزیشن کا ۳۳ رفی صد سے زائد نہ ہو۔

(۳) شیئر خریدتے وقت کمپنی کا نقد (سیال) اثاثہ بارہ مہینوں کے اوسط مارکیٹ کیپٹلائزیشن کا

۳۳ رفی صد سے زائد نہ ہو۔
(۴) کمپنی کا دَین اگر واجب الوصول ہے، تو وہ بھی بارہ مہینوں کے اوسط مارکیٹ کیپٹلائزیشن کے ۳۳ رفی صد سے زائد نہ ہو۔
(۵) اگر کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال ہے، لیکن جزوی طور پر سود لینے یا اور کسی حرام کام میں ملوث ہو تو حاصل ہونے والی مجموعی آمدنی میں ان حرام ذرائع سے حاصل شدہ رقم پانچ فی صد سے زائد نہ ہو۔"

اپنے تبصرے میں ریٹائرڈ ڈائریکٹر آر بی آئے جناب محمد یعقوب خان نے کہا کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بہترین موقع ہے۔

انقلاب کے حوالے سے یہ خبر اس مقالے میں مَیں نے اس لیے شامل کیا ہے کہ ہمارے علمائے کرام، مفتیان عظام، اور فقیہان محترم اس بات کا مشاہدہ کریں کہ درج بالا پانچ تجاویز شریعت کے کس درجے میں قابل قبول ہیں۔ یا ان تجاویز سے بہتر کوئی اور حل ملت کی رہنمائی کے لے کیا پیش کیا جاسکتا ہے؟

تمسکات (Debentures): سرمایہ بازار میں سرمائے کی فراہمی کا تیسرا اہم ذریعہ تمسکات کی فروخت ہے۔ مشترک سرمایہ کمپنی جب بازار سے قرض حاصل کرنا چاہتی ہے تو تمسکات نامی دستاویز بازار میں فروخت کرتی ہے، اس کے ذریعے کمپنی قلیل مدتی قرضے حاصل کرتی ہے۔ عموماً کمرشیل بنکس، بیمہ کمپنیاں، افراد اور دیگر مالیاتی ادارے تمسکات خریدتے ہیں اور جب یہ تمسکات پختہ (Mature) ہوجاتے ہیں، یعنی اپنی مدت (مثلاً سال بھر) کو پہنچ جاتے ہیں، تو کمپنی اپنے تمسکات سود کی ادائیگی کے ساتھ واپس خرید کر قرض کے بوجھ سے سبک دوش ہوجاتی ہے۔ چناں چہ یہ سراسر سودی کاروبار ہے، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

کبھی کبھی کمپنی ایسے تمسکات بھی فروخت کرتی ہے (جس میں شرح سود کم ہوسکتا ہے) جس کی پختگی پر یہی تمسکات حصص میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہ دوسری قسم کے تمسکات پہلی قسم کے تمسکات کے مقابلے میں کم شرح سود پر یا کبھی کبھی بغیر کسی شرح سود کے سرمایہ بازار میں قابل فروخت ہوتے

ہیں، میری ناقص رائے میں ایسے تمسکات جن پر کوئی شرح سود نہیں ہوتا اور جن کی پختگی پر یہ تمسکات حصص میں متبدل ہو جاتے ہیں، شرعی طور ان میں سرمایہ کاری کے امکانات سود کے حوالے سے زیر بحث رکھا ہے لیکن اور کچھ عوامل ہیں جو اس میدان خارزار میں دامن گیر ہوتے ہیں، تھوڑی سی گفتگو ان پر بھی کر لی جائے۔

سرمایہ بازار میں سرمایہ کاری پر سود کے علاوہ اثر انداز ہونے والے عوامل: سرمایہ بازار میں سرمایہ کاری کرنے سے پہلے جہاں ہم سود سے بچنے کی فکر کرتے ہیں، وہیں کچھ اور عوامل بھی ہیں جن کا بہت دھیان رکھنا ہوگا، مثلاً

(۱) شریعت نے جن چیزوں کی پیداوار یا تجارت وغیرہ حرام و ناپسندیدہ قرار دیا ہے، مشترک سرمایہ کمپنی ایسا کاروبار تو نہیں کر رہی ہے، مثلاً شراب و دیگر نشہ آور اشیا کی خرید و فروخت۔

(۲) مشترک سرمایہ کمپنی کوئی ایسا کاروبار تو نہیں کر رہی ہے، جس کے تانے بانے وطن دشمنی سے جڑے ہوئے ہیں۔

(۳) کمپنی ایسے کاروبار میں تو نے نہیں لگی ہے جو غیر قانونی ہو مثلا کالا بازاری، سٹہ بازاری، اسمگلنگ، اشیا کی ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، ٹیکس چوری، گھپلے گھوٹالے وغیرہ۔

(۴) انسانیت دشمن سرگرمیاں، دھوکا دہی، رشوت ستانی وغیرہ۔

شرعی احکام کی روشنی اس فہرست کو مزید بڑھایا جا سکتا ہے۔

اہم نوٹ: سرمایہ بازار کے تعلق سے اکثر مقامات پر صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور جناب مفتی نظام الدین رضوی کی مایۂ ناز کتاب ''کمپنی کا نظام کار اور اس کی شرعی حیثیت'' سے ناچیز نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ برہان ملت مبارک پور اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے۔ میری رائے میں اپنے مواد کے اعتبار سے یہ نہایت ہی گراں قدر کتاب ہے، جو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے چاہنے والوں کا بھرم رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اس مضمون میں اس کتاب کے حوالے اتنے زیادہ ہیں کہ ان حوالہ جات کا اندراج کرنے کے بجائے ساری کتاب کے پڑھنے کی سفارش

کی جا سکتی ہے۔

اختتامیہ: اپنے اس مقالے کا اختتام عزیزم مولانا محمد صادق رضا مصباحی کے ان کلمات پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو اپنی معنوی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے مقالہ نگار کے دل کے کسی کونے میں تپ رہے ہیں اور سسک رہے ہیں ان کے یہ کلمات شاید آپ کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیں:

''پس ماندگی اور خستہ حالی مسلمانوں کو جہاں جہاں تک لے گئی امام احمد رضا کی تصوراتی آنکھوں نے وہاں تک اس کا تعاقب کیا اور مسلمانوں کو اس سے نجات کے لیے ایسا فکری نظام بتایا جو دراصل اہل سنت کی ترقی کا آئینہ خانہ ہے۔ لیکن افسوس آج اس سے شدید بے اعتنائی ہے۔ ان کے نام اور خدمات پر تو اہل سنت جان چھڑک رہے ہیں اور ان کی شخصیت کی سحر طرازی میں وہ اس طرح گم ہیں کہ ان کے افکار و تعلیمات کی انگلی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ وہ مسلک اعلیٰ حضرت کے نام پر دیوانہ وار ٹوٹے پڑ رہے ہیں لیکن یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں کہ آخر مسلک اعلیٰ حضرت کیا ہے؟......''

''امام احمد رضا قدس سرہ سے سچی محبت کا اظہار تو یوں تھا کہ ان کے فکری پہلوؤں پر بھی سنجیدگی سے عمل کیا جاتا......''

(ماخوذ: امام احمد رضا کا فکری نظام اور ہماری بے اعتنائی، از مولانا محمد صادق رضا مصباحی، سہ ماہی افکار رضا ممبئی، ۵۰واں خصوصی شمارہ، صفحہ ۱۹۶۔۱۹۷)

○ ○ ○

پروفیسر سعید احسن قادری
شعبۂ علم الادویہ زیڈ، وی ایم، یونانی میڈکل کالج، پونہ

امام احمد رضا اور فزیولوجی
(منافع الاعضاء Physiology)

وفورِ علم تو دیکھیے ابر کرم کی طرح جس سمت گیا، بنجر زمین بھی سرسبز و شاداب ہوگئی، جہانِ رضا کی وسعتوں کی پیمائش گہرائی و گیرائی کا ادراک ناممکن ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ حیرت واستعجاب تو اس وقت اور بڑھ جاتے ہیں، جب امامِ علم وفن کسی مخصوص فن میں متعدد اور مختلف فنون کا ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ فلسفۂ جدیدہ کے مزعوماتِ باطلہ واہیہ پر "**المقامع الحدید علیٰ خد المنطق الجدید**" میں علمِ طب کے اس شعبہ پر جسے فزیولوجی (منافع الاعضاء) کہا جاتا ہے، قلم کی جولانیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں جیسا کہ امام فرماتے ہیں:

> "ہر بدن میں اس کے کام، کہ غذا پہونچاتا ہے، پھر اسے روکتا ہے، پھر ہضم بخشتا ہے، پھر سہولتِ دفع کو پیاس دیتا ہے، پھر پانی پہونچاتا ہے، پھر اُس غلیظ کو رقیق، لزج کو منزلق کرتا ہے، پھر ثُفل کیلوس کو امعاء کی طرف پھینکتا ہے، پھر ماساریقا کی راہ سے خالص کو جگر میں لے جاتا ہے،

وہاں کیموس دیتا ہے، تلچھٹ کا سوداء، جھاگوں کا صفراء، کچے کا بلغم، پکے کا خون بناتا ہے، فضلہ کو مثانے کی طرف پھینکتا ہے، پھر انہیں باب الکبد کے راستے عرق میں بہاتا ہے، پھر وہاں جداول، جداول سے سواقی، سواقی سے باریک عرق، پیچ در پیچ، تنگ بر تنگ راہیں چلاتا ہوار گوں کے دہانوں سے اعضاء پر اُنڈیلتا ہے، پھر یہ مجال نہیں کہ ایک عضو کی غذا دوسرے پر گرے، جو جس کے مناسب ہے، اُسے پہونچاتا ہے، پھر ان اعضاء میں چوتھا طبخ دیتا ہے کہ اس صورت کو چھوڑ کر صورتِ عضویہ (قوتِ مشبہُ) لے لیں، ان حکمتوں سے بقاء شخص کو ما تحلل کا عوض بھیجتا ہے، جو حاجت سے بچتا ہے، اس سے بالیدگی دیتا ہے، پھر جو فضلہ رہا، اُسے منی بنا کر صُلب وترائب میں رکھتا ہے، عقد وانعقاد کی قوت دیتا ہے، زن ومرد میں تالیف کرتا ہے، عورت کو باوجودِ مشقت حمل وصعوبت وضع، شوق بخشتا ہے، حفظِ نوع کا سامان فراہم کرتا ہے، رحم کو اذنِ جذب دیتا ہے، پھر اس کے امساک کا حکم کرتا ہے، پھر اُسے پکا کر خون بناتا ہے، پھر طبخ دے کر گوشت کا ٹکڑا کرتا ہے، پھر اس میں کلیاں کنچھیاں نکالتا ہے، قسم قسم کی ہڈیاں، ہڈیوں پر گوشت، گوشت پر پوست، سیکڑوں رگیں، ہزاروں عجائب، پھر جیسی چاہے، تصویر بناتا ہے، (قوتِ مصورہ) پھر اپنی قدرت سے روح ڈالتا ہے، بے دست وپا کو ان ظلمتوں سے رزق پہونچاتا ہے، پھر قوت آنے کو ایک مدت تک روکے رہتا ہے، پھر وقتِ معین پر حرکت وخروج کا حکم دیتا ہے، اس کے لیے راہ آسان فرماتا ہے، مٹی کے مورت کو پیاری صورت، عقل کا پتلا، چمکتا تارا، چاند کا ٹکڑا کر دکھاتا ہے۔''

یہ تھی اعلیٰ حضرت کی عبارت جس میں ہر جملہ، ہر لفظ یونانی طبی نصابی کتابوں کے ایک

ایک چیپٹر کی نشاندہی کرتے ہیں، خصوصی طور پر فزیولوجی (منافع الاعضاء) اور علم القبالت چونکہ میرا موضوع ہی ہے ''امام احمد رضا اور فزیولوجی'' اس لیے صرف فزیولوجیکل آسپیکٹ پر اکتفا کروں گا، دراصل فزیولوجی جسم کے افعالِ طبعی سے بحث کرتی ہے۔ ہر خلیہ، ہر عضو، عروق وشرائین جسم میں بہنے والی رطوبت، اعضاء غرض کہ نظام ہائے جسمانی میں سارے نظام کا فعل اور اس کی افادیت کیا ہے، واضح کرتی ہے۔

مذکورہ عبارت کا تجزیہ کیا جائے، تو استحالہ کا مکمل چیپٹر، پھر اس کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیاں، نیز قوتِ طبعیہ، جس میں قوتِ شخصیہ شامل ہے، قوتِ نفسانیہ، جس میں قوتِ محرکہ شامل ہے، قوتِ حیوانیہ، قوتِ نامیہ، قوتِ غاذیہ، جس میں قوتِ جاذبہ، قوتِ ماسکہ، قوتِ ہاضمہ، قوتِ دافعہ، قوت تناسلیہ، پھر ہضوم میں ہضمِ معدی، ہضمِ کبدی، ہضمِ عُروقی، ہضمِ خلوی، ہضمِ عضوی جیسی مشکل ترین گتھیاں امام وقت نے چند آسان لفظوں میں بیان کر دیا اور یہ شہادت ہے کہ امام علم وفن منافع الاضاء کے اصول وضابطہ کا علم رکھتے تھے۔

خالص اصطلاحی لفظ ما یتحلل یعنی محصلہ، لزج یعنی ملصقہ، مشبہ یعنی مشابہ بنانے والی مزید یہ کہ ''کچا کو بلغم، پکے کو خون، تلچھٹ کو سوداء، جھاگ کو صفراء'' جس کی منافع الاعضائی وضاحت کر دی جائے، تو یہ رُخ اور واضح ہو جائے گا ''پکنے سے پہلے خام حالت میں بلغم خون ہی ہے'' جس کا فائدہ یہ ہے کہ جب خون کی قلت، جس میں لاحق ہو جاتی ہے، اس وقت بلغم خون بن کر جسم میں خون کی قلت کو دور کر کے تغذیہ فراہم کرتا ہے۔

صفراء: ''غلیظ کو رقیق'' یعنی صفراء خون کو لطیف اور تنگ راستوں میں نفوذ کی قوت فراہم کرتا ہے۔

سوداء: تغذیہ کا کام کرتا ہے، جو کہ خون کو گاڑھا کرتا ہے، تاکہ خون کسی ایک مقام پر ٹھہر کر ہضم وتغیر کے بعد عضو کو تغذیہ فراہم کر سکے۔

اور یہیں پر بس نہ کیا، بلکہ نظامِ تولید وتناسل یعنی علم القبالت پر چند جملوں نے امامِ

وقت کی دسترس کو تابندہ کردیا۔

وقت کی تنگی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ان سارے موضوعات پر بحث کی جائے، پھر موقع کا انتظار رہے گا، تاکہ مختلف نظام ہائے جسمانی کا بھرپور جائزہ لے کر بارگاہ رضاؔ میں خراجِ عقیدت پیش کرسکوں۔

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھادیئے ہیں

مخارج:

(۱) المقامع الحدید علیٰ خد المنطق الجدید، امام احمد رضا، رضا اکیڈمی ممبئی ۱۴۱۸ھ۔

(۲) کلیات عصری، پروفیسر اشتیاق احمد، ۱۹۸۳ء نیو پبلک پریس دہلی۔

(۳) کلیاتِ نفیسی، علامہ نفیس۔

(۴) منافع الاعضاء، حکیم کبیر الدین۔ (۵) علم القبالت۔

○ ○ ○

مولانا یٰسین اختر مصباحی
دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی

امام احمد رضا کی دینی وفکری بصیرت

فقیہِ اسلام امامِ اہلِ سنت حضرت مولانا الشاہ احمد رضا حنفی قادری برکاتی بریلوی (ولادت ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء/ وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) اپنے عہد کے ہی نہیں بلکہ صدی دوصدی پہلے کی تاریخ کے بھی عدیم النظیر فقیہِ جلیل اور شہرۂ آفاق عالم ومفکر ہیں۔ آپ کی شانِ تجدید واِحیاے دین اُن کتب ورسائلِ رضویہ سے صاف عیاں ہے جن کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار ہے اور جن کا مطالعہ کر کے معاصر علُما وفقہاے کرام سے دورِ حاضر تک کے علُماے ہند وپاک ومشائخِ عرب آپ کی مذہبی استقامت، علمی بصیرت اور فکری وسعت وجامعیت کے معترف ومداح ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کی تمام قدیم وجدید معروف دینی وعلمی شخصیات پر مدارس وجامعات اور علمی وتحقیقی مراکز میں جو تحقیقات ہو رہی ہیں ان کے درمیان آپ کے علم وفضل اور حیات وخدمات کے مختلف گوشوں پر اس وقت غالباً سب سے زیادہ لکھا جا رہا ہے اور مختلف زبانوں میں ایشیا سے یورپ تک کی بعض یونیورسٹیوں میں متعدد ریسرچ اسکالر ''رضویات'' کے موضوع پر اپنا مقالۂ ڈاکٹریت مکمل کر رہے ہیں اور کئی ایک مقالات مکمل ومطبوع ہو چکے ہیں۔ عالم اسلام کی سب سے قدیم وعظیم یونیورسٹی جامعہ ازہر قاہرہ، مصر کے کئی اساتذہ وطلبہ ''رضویات'' کے موضوع پر عربی زبان میں نہایت گراں قدر تحریریں پیش کر چکے ہیں۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ کا طریقہ تھا کہ وہ پیش آمدہ امور و معاملات اور علمی و معاشرتی و سیاسی مسائل پر اولین مرحلے میں غور و فکر کر کے شرعی و اصولی موقف قائم کرتے تھے اور اپنے موقف پر سطحیت و جذباتیت کو کسی قیمت پر کسی بھی پہلو سے حاوی بلکہ اثر انداز بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اِخلاص و اِصابت و اِستقامت آپ کا شیوہ اور طرۂ امتیاز تھا۔ اور یہ وہ عظیم صفات ہیں جو نایاب نہیں تو نادر اور کم یاب ضرور ہیں۔

آپ کی زندگی کے بالکل آخری دو تین سالوں (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۱ء) میں کئی تحریکوں، تنظیموں کا وجود اور عروج ہوا۔ کئی مسائل و مباحث عُلما اور قائدینِ ہند کے سامنے چیلنج کی حیثیت سے اُبھرے۔ جن میں (۱) ہندوستان دارالاسلام ہے یا دارالحرب؟ (۲) تحریکِ خلافت (۳) تحریکِ ترکِ موالات (۴) تحریکِ ھجرت نے متحدہ ہندوستان کو سب سے زیادہ متاثر اور مضطرب کیا۔

قارئین پر یہاں ایک نہایت اہم تاریخی حقیقت واضح رہے کہ

معمولات و مراسم اہلِ سنت اور اپنے پیر و مرشد حاجی امداداللہ چشتی صابری مہاجر مکی (وصال ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) کے مسلک کے خلاف بعض عُلمائے دیوبند کے خیالات و نظریات منظر عام پر آتے ہی حضرت مولانا عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری سہارن پوری (وصال ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) خلیفۂ حاجی امداداللہ مہاجر مکی نے ان کا تحریری تعاقب کیا اور ان کی مشہور کتاب ''انوارِ ساطعہ'' کی پہلی طباعت ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں ہوئی۔

عُلمائے دیوبند کے انحرافات اور بعض کفری عبارتوں کی گرفت واحتساب کی طرف عُلما و مشائخِ پنجاب (متحدہ ہند) نے خصوصی توجہ فرمائی۔ بلکہ عُلمائے سہارن پور سے سب سے پہلے عُلمائے پنجاب ہی نے میدانِ بھاول پور (پنجاب) میں معرکہ آرائی کی اور یہ کسے معلوم نہیں کہ پنجاب ہندوپاک (متحدہ ہندوستان) کا ''بازوئے شمشیرزن'' کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔

براہینِ قاطعہ مؤلفہ مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری ومصدقہ مولانا رشید احمد گنگوہی سہارن پوری میں ایک مقام پر حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محافلِ میلاد کو معاذ اللہ ''کنھیا کے جنم'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور ایک دوسرے مقام پر اسی براہین قاطعہ میں ہے کہ ابلیس لعین کی

وسعتِ علم نص سے ثابت ہے اور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وسعتِ علم کی کون سی نص وارد ہے؟ (معاذ اللّٰہ رب العلمین)

انوارِ ساطعہ کی کمپوزنگ کرا کے تحقیق وتقدیم وغیرہ کے ساتھ نئی طباعت ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء میں طلبۂ درجۂ فضیلت الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور (ضلع اعظم گڈھ، یوپی۔انڈیا) نے کردی ہے۔ تفصیل کے لئے اس کا مطالعہ کیا جائے۔مولانا فیض الحسن سہارن پوری (متوفی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء) وابو الحسنات مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی لکھنوی (م۱۳۰۴ھ) ومولانا رحمت اللہ کیرانوی (م ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء) ومفتی ارشاد حسین فاروقی مجددی رام پوری (م۱۳۱۱ھ) ومولانا غلام دستگیر قصوری لاہوری (م۱۳۱۵ھ) وحاجی امداد اللہ چشتی مہاجر مکی (م۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) ومولانا عبد القادر عثمانی بدایونی (م۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) ومولانا وکیل احمد سکندر پوری (م۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) ومولانا نذیر احمد رام پوری (م۱۳۲۷ھ) ومولانا محمد فاروق عباسی چریا کوٹی (م۱۳۲۷ھ) ومفتی محمد لطف اللہ علی گڑھی (متوفی ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) ودیگر علما ومشاہیرِ امت کی تحریری تصدیقات وتقریظات سے انوارِ ساطعہ مؤیّد ومزیّن ہے۔

سب سے پہلا تاریخی مناظرۂ بھاول پور حضرت مولانا غلام دست گیر ہاشمی قصوری (وصال ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) (قصور پنجاب) اور مؤلف براہینِ قاطعہ خلیل احمد انبیٹھوی کے درمیان ۱۳۰۶ھ/۸۹۔۱۸۸۸ء میں ہوا اور اس مناظرہ میں اہلِ سنت کی جانب سے حضرت خواجہ غلام فرید فاروقی چشتی (وصال ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) صدرِ مناظرہ تھے۔

مولانا محمد عبد الحکیم شرف قادری لاہوری نے حضرت مولانا غلام دست گیر قصوری (وصال ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) کے تذکرہ میں لکھا ہے:

''مناظرۂ بھاول پور وہ یادگار مناظرہ ہے جس میں آپ کو مولوی خلیل احمد انبیٹھوی کے مقابلے میں زبردست کامیابی ہوئی۔ یہ تاریخی مناظرہ شوال ۱۳۰۶ء میں براہین قاطعہ (مؤلفہ مولوی خلیل احمد انبیٹھوی) کی گستاخانہ عبارتوں پر ہوا تھا جس کے حَکَم نواب محمد صادق عباسی والیِ بھاول پور کے پیر ومرشد شیخ المشائخ حضرت خواجہ غلام فرید قدس سرہ تھے۔

حَکَمِ مناظرہ نے لکھ دیا کہ:

''دیوبندی علما کے عقائد ان وھابی علما سے ملتے ہیں جو برصغیر میں خلفشار کا باعث بنے ہوئے ہیں۔''

اس فیصلے کے بعد نواب مرحوم نے مولوی خلیل احمد کو ریاست سے نکل جانے کا حکم صادر فرمادیا۔

اس مناظرہ کی روداد ''تقدیس الوکیل'' کے نام سے چھپ چکی ہے جس کے آخر میں علمائے حرمین طیبین کی تصدیقات ثبت ہیں۔ شیخ الدلائل حضرت مولانا عبدالحق مہاجر مکی اور حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہما نے حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری کی تائید فرمائی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ (کیرانوی) مہاجر مکی رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ بانیِ مدرسہ صولتیہ (مکہ مکرمہ) نے بھی تقدیس الوکیل پر شاندار تقریظ لکھی اور تقریظ میں فرمایا:

''میں جناب مولوی رشید احمد کو رشید سمجھتا تھا مگر میرے گمان کے خلاف کچھ اور ہی نکلے۔''

(ص: ۴۱۵، تقدیس الوکیل، مطبوعہ نوری بک ڈپو، لاہور)

سلسلۂ نقش بندیہ میں ہزار ہا افراد آپ کے دستِ اقدس پر بیعت ہوئے، آپ نے تمام عمر تبلیغ وتلقین میں صرف فرمائی، ۔فرقِ باطلہ اور مذاہبِ فاسدہ کی تردید میں متعدد محققانہ کتابیں لکھیں اور شائع کر کے مفت تقسیم کیں۔ (ص: ۳۰۸، و ۳۰۹، تذکرۂ اکابر اہلِ سنت، مرتبہ محمد عبدالحکم شرف قادری، مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور۔ طبع دوم، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۳ء)

اہلِ سنت کی جانب سے مناظرۂ بھاول پور کے حَکَم حضرت خواجہ غلام فرید فاروقی چشتی (وصال ۱۳۱۹ھ/۱۹۱۰ء) کے بارے میں مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری لاہوری تحریر کرتے ہیں:

''حضرت خواجہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سرائیکی زبان کے مَلِکُ الشُّعَراء تھے۔آپ کے وجد آفریں کلام میں بلا کا سوز ہے۔آپ کی ''کافیاں'' آج بھی اثر آفرینی میں جواب نہیں رکھتیں۔عوام وخواص کے لئے کیف وسرور کا خزینہ اور عشق وعرفان کا سرچشمہ ہیں۔اسی لئے علامہ اقبال نے کہا تھا:

''جس قوم میں خواجہ فرید اوران کی شاعری موجود ہے، اس قوم میں عشق ومحبت کا موجود نہ ہونا تعجب انگیز ہے۔(ص:۵۴، التذکارُ السعید فی ذکرِ خواجہ غلام فرید ،فیض احمد اویسی، مطبوعہ مکتبہ اویسیہ، بھاول پور، پنجاب)

......شوال ۱۳۰۶ھ میں جب مولانا غلام دستگیر قصوری نے براہین قاطعہ کی بعض عبارات (جوخلافِ مسلکِ اہلِ سنت تھیں) پر گرفت کی اور مولوی خلیل احمد انبیٹھوی (مدرسِ اول جامعہ عباسیہ، بھاول پور) سے ان عبارات پر مناظرہ کیا تو اس مجلس کے حَکَم نواب بھاول پور نواب محمد صادق عباسی کے پیرومرشد حضرت خواجہ صاحب ہی تھے۔ آپ نے فیصلہ دیا تھا کہ متنازعہ فیہا عبارات وھابیت کی ترجمانی کرتی ہیں اور مسلکِ اہلِ سنت کے خلاف ہیں۔'' (ص،۳۲۳، تذکرۂ اکابراہلِ سنت، مؤلفہ مولانا شرف قادری، مطبوعہ مکتبہ قادریہ لاہور)

متحدہ ہندوستان کے اندر مذہب سَوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کے خلافِ تقویۃ الایمان وتحذیرالناس وحفظ الایمان وبراہینِ قاطعہ وغیرہ کے ذریعہ پیدا ہونے والے جدید افکار وخیالات مثلاً مسئلہ امکانِ کِذب باری تعالیٰ وامکانِ نظیرِ محمدی وتنقیصِ شانِ رسالت وغیرہ کے سلسلے میں عُلما ومشائخ اہلِ سنت کے لسانی وقلمی جہاد کی ایک طویل داستان ہے جو سیکڑوں کتب ورسائل میں مسطور ومذکور ہے۔ اسی طرح امامِ اہلِ سنت مولانا الشاہ احمد رضا حنفی قادری برکاتی بریلوی کی گراں قدر خدمات کا ایک روشن باب ہے جس سے برصغیر ہندو پاک کے خواص وعوام بخوبی واقف ہیں اس لئے ان کے ذکر واِعادہ سے یہاں صَرفِ نظر کیا جارہا ہے۔

زیرِ نظر تحریر میں چنداَہم امور ومسائل کو موضوعِ بحث بنا کر کچھ حقائق پیش کیے گیے ہیں اور امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی دینی فضیلت، علمی جلالت، فکری بصیرت، علمی استقامت کو واضح کیا گیا ہے۔ نگاہِ تحقیق وانصاف میں ان کو یقیناً اعتبار ووقار حاصل ہوگا اور بہت سے مخفی گوشے قارئین کی نظر کے سامنے آئیں گے جن کی روشنی میں بڑی آسانی کے ساتھ صحیح نتائج تک پہنچ سکیں گے۔ بیسویں صدی عیسویں کے یہ حقائق اکیسویں صدی عیسوی اور آنے والی صدیوں کے لئے بھی ہدایت ورہنمائی کا فریضہ انجام دیں گے۔ وَاللّٰہُ الھادِی اِلیٰ سواءِ السَّبیل وھُوَ المُعین

وَالمُستَعان وَعَلیہِ التُکلان۔

بہر حال! ایک استفتا کے جواب میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) نے ہندوستان کے دارالاسلام اور دارالحرب ہونے نہ ہونے کے تعلق سے تحقیقی بحث فرمائی جس کا نام اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام" (۱۳۰۶ھ۔ طبع اول ۱۹۲۷ء حسنی پریس بریلی) ہے۔ اس کے اندر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

"ہمارے امامِ اعظم رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ بلکہ عُلَمائے ثلثہ رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیھم کے مذہب پر ہندوستان دارالاسلام ہے، دارالحرب ہرگز نہیں ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہو جانے میں جو تین باتیں ہمارے امام اعظم امام الائمہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک درکار ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں احکامِ شرک علانیہ جاری ہوں اور شریعتِ اسلام کے احکام وشعائر مطلقاً جاری نہ ہونے پائیں۔ اور صاحبین کے نزدیک اسی قدر کافی ہے۔ مگر یہ بات بحمد اللہ یہاں قطعاً موجود نہیں۔

اہلِ اسلام جمعہ و عیدین واذان واقامت ونماز با جماعت وغیرھا شعائرِ شریعت بغیر مزاحمت علیٰ الاعلان ادا کرتے ہیں۔ فرائض، نکاح، رضاع، طلاق، عدت، رجعت، مہر، نفقات، حضانت، نسب، ھبہ، وقف، وصیت، شفعہ وغیرھا بہت معاملاتِ مسلمین ہماری شریعتِ غَرّاء بیضاء کی بنا پر فیصل ہوتے ہیں کہ ان امور میں حضراتِ عُلَما سے فتویٰ لینا اور اس پر عمل وحکم کرنا حکّامِ انگریزی کو بھی ضرور ہوتا ہے اگر چہ ہنود ومجوس ونصاریٰ ہوں۔ اور بحمد اللہ یہ بھی شوکت وجبروتِ شریعتِ علیہ عالیہ اسلامیہ اعلیٰ اللّٰہ تعالیٰ حِکمھا السامیہ ہے کہ مخالفین کو بھی اپنی تسلیم اتباع پر مجبور فرماتی ہے۔ وَ الحمدُلِلّٰہِ رَبِّ الغلمین۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں سراج وھاج سے نقل کیا۔

اِعْلَموا اَنَّ دارَالحرب تَصیرُ دارَالاسلام بِشرطٍ واحدٍ و ھو اِظھارُ حکمِ الاسلام فیھا.

جان لو کہ بے شک دار الحرب ایک ہی شرط سے دار الاسلام بن جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہاں اسلام کا حکم غالب ہو جائے۔ (ص:۱۰۵،۱۰۶۔ ج ۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

اس سے آگے متعدد قدیم فقہی کتب کے حوالہ جات سے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے اپنے موقف کو واضح و مدلل کیا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں ہندوستان کو دار الحرب کہہ کر یہاں سے مسلمانوں کی ہجرت کا جو علماء درس دے رہے تھے وہ درحقیقت ہندوستان سے اسلام کو الوداع کہنے کا شعوری یا غیر شعوری جرم کر رہے تھے۔ اور یہ وہی لوگ تھے جو تحریکِ ترکِ موالات کو ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ بنا کر شعائر و احکامِ اسلام کو کفر کی دہلیز پر قربان کر رہے تھے۔ تحریکِ ہجرت کی تاریخ اور ہندوستان سے افغانستان ہجرت کر کے پھر لٹے پٹے تباہ حال مسلمانوں کی ہندوستان واپسی کی المناک داستان سے واقف ہر انصاف پسند مؤرخ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہے۔

جس وقت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے ہندوستان کو دار الاسلام کہا اس وقت اور اس زمانہ میں ہندوستان کے کسی قابلِ ذکر عالم نے اسے دار الحرب کہا ہو تو یہ اس کا تفرّد ہے۔ جمہور عُلماء اسے دار الاسلام سمجھتے اور کہتے تھے۔ اُس زمانے میں ہندوستان کو دار الحرب کہہ کر مسلمانانِ ہند پر جہاد یا ہجرت کو واجب قرار دینا نہ اسلام کی خیر خواہی تھی نہ مسلمانوں کی، بلکہ یہ حکم کُند چھری سے مسلمانوں کو ذبح کرنے اور اسلام کو آزار پہنچانے کے مترادف تھا۔

ہندوستان کے دار الاسلام ہونے اور اسے دار الاسلام کہنے کا یہ مطلب تھا اور یہ مطلب ہے کہ اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ اپنے اسلامی اصول و احکام پر عمل کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند یہاں تھے اور یہیں رہیں گے۔ اپنا تشخص ہر حال میں قائم رکھیں گے اور اسی کے ساتھ اپنی زندگی گذاریں گے۔ یہ سرزمین ہماری ہے جس سے ہم کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہوں گے۔ اس کے چپے چپے اور اس کی وادی و کوہسار پر ہمارا پورا پورا حق ہے۔ اس لئے یہ اعلانِ عام ہے کہ:

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر

اِعلام الاعلام بأن ہندوستان دارالاسلام (۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء) جس کی پہلی طباعت بشکلِ رسالہ بماہِ مارچ ۱۹۲۷ء حسنی پریس بریلی سے ہوئی۔ اس میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کا اصولی اور جامع موقف آپ پڑھ چکے۔

۱۸۸۸ء میں امام احمد رضا بریلوی نے ایک استفتاء کے جواب میں ہندوستان کو دارالاسلام کہا اور اعلام الاعلام تحریر کیا جس کی طباعت آپ کے وصال (۱۹۲۱ء) کے تقریباً سات سال بعد ہوئی۔ اس کے اندر ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ یہاں احکام وشعائرِ اسلامیہ پر پابندی نہیں۔ نہ ہی انھیں پامال کر کے یہاں مسلمانوں پر اعلانیہ احکامِ شرک جاری ہیں۔ یہ اساسِ حکم ہے جو شریعتِ اسلامیہ واصولِ فقہ کے مطابق ہے۔ اسی طرح اس دور میں آپ کے وصال تک مسلمانانِ ہند پر حکمِ جہاد نہیں تھا کیوں کہ ان کے اندر قدرت و استطاعتِ جہاد نہیں تھی۔ یہ مسئلہ بھی عین مطابقِ شریعت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں علمائے ہند میں سے کسی قابلِ ذکر عالم وفقیہ و مفتی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے اور اس میں جہاد فرض ہونے کا فتویٰ شاید ہی دیا ہو۔ اور اگر دیا ہو تو وہ اصولاً صحیح نہیں اور نا قابلِ عمل بھی تھا اور مسلمانانِ ہند کے لئے سخت نقصان دہ وتباہ کُن۔

ان دونوں باتوں کو ایک ساتھ سمجھنے سمجھانے کے لئے آزاد ہندوستان کی یہ تاریخ سامنے رکھیے کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ ہزاروں مساجدِ پنجاب وغیرہ مشرکینِ ہند کے قبضے میں چلی گئیں۔ ہزاروں مسلمان عورتوں کی عصمت دری و آبروریزی ہوئی۔ اس دورِ وحشت اثر کے بعد بھی سالہا سال تک ہزاروں ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کی جان و مال کی تباہی اور ان کی عزت و ناموس کی بربادی ہوتی رہی۔ اور دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد ہندوستانی کورٹ و گورنمنٹ و پولیس وملٹری کی موجودگی میں شہید کی گئی اور ملک بھر میں مسلمانوں کا وحشیانہ قتل اور ان کی خوں ریزی ہوئی۔ مارچ ۲۰۰۲ء میں صرف صوبۂ گجرات کے

اندر حکومتِ گجرات کی شہ پر تین چار ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ ایسے سنگین ایام و اوقات میں بھی ہندوستان کے کس طبقہ کے علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور اس کے اندر جہاد فرض ہونے یا یہاں سے ہجرت کرنے کا فتویٰ دیا؟؟؟

حلقۂ دیوبند کے قطبُ الاقطاب و امامِ ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

''ہند کے دارالحرب ہونے میں اختلاف علماء کا ہے۔ بظاہر تحقیقِ حال بندہ کی خوب نہیں ہوئی۔ حسب اپنی تحقیق کے سب نے فرمایا ہے اور اصل میں کسی کو خلاف نہیں۔ اور بندہ کو بھی خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔ فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ص ۵۰۵۔ فتاویٰ رشیدیہ، مکتبہ تھانوی دیوبند)

''دارالحرب ہونا ہندوستان کا مختلف علمائے حال میں ہے۔ اکثر دارالاسلام کہتے ہیں اور بعض دارالحرب کہتے ہیں۔ بندہ اس میں فیصلہ نہیں کرتا۔ (ص: ۷۔ جلد اول۔ فتاویٰ رشیدیہ۔ کتب خانہ رحیمیہ دہلی)

دیوبندی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) گومگو اور تردد کی کیفیت میں ہیں۔ رجحان دارالحرب کی طرف ہے مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہجرت کے معاملے میں دارالحرب اور سود کے معاملے میں دارالاسلام قرار دینا چاہیے۔ (خلاصۂ مفہوم۔ ص: ۱۷۳ و ۳۶۲۔ از قاسم العلوم مطبوعہ لاہور)

دیوبندی حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲/ ۱۹۴۳ء) فرماتے ہیں:

''عموماً دارالحرب کا معنیٰ غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جہاں حرب واجب ہو۔ سو اس معنیٰ میں تو ہندوستان دارالحرب نہیں کیوں کہ یہاں بوجہ معاہدہ کے حرب درست نہیں۔ (ص: ۱۴۷۔ باب اول۔ ملفوظ ۶۱۴۔ کمالاتِ اشرفیہ، مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ، تھانہ بھون)

بینک سے لین دین کے منافع کو سود قرار دیتے ہوئے انیسویں صدی کے بالکل آخر میں

مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے ۱۸۸۷ء میں تحذیرُ الاخوان عَنِ الرِبوٰ فی الھندوستان (مسودہ صفر ۱۳۰۵ھ۔ مبیضہ رمضان ۱۳۰۷ھ) لکھا جو ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا اس کے اندر دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث کرتے ہوئے مولانا تھانوی لکھتے ہیں:

''اور ہندوستان نہ تو صاحبین کے قول پر دارالحرب ہے کیوں کہ اگر چہ احکام شرک کے اس میں علی الاعلان جاری ہیں لیکن احکامِ اسلام کے بھی بلا خوف وخطر مشتہر ہیں۔ اور دونوں کے باقی رہنے سے دارالحرب نہیں ہوتا۔ اور نہ امام صاحب کے قول پر دارالحرب ہے کیوں کہ اجرائے احکامِ کفر بہ تفسیرِ مذکور یہاں نہیں بلکہ بدستور احکامِ اسلام جاری ہیں اور ایسی صورت میں دارالحرب نہیں ہوتا۔'' (ص:۸۔ تحذیرُ الاخوان عَنِ الرِّبوٰ فی الھندوستان از مولانا اشرف علی تھانوی۔ اشرف المطابع، تھانہ بھون)

پھر انقلاب ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں ایک شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے مولانا تھانوی لکھتے ہیں:

''شاید کسی کو شبہ ہو کہ غدر سے تو امانِ اول باقی نہیں رہا بلکہ عہدِ ثانی کی ضرورت ہوئی۔ اول تو یہ بات غلط ہے۔ غدر میں صرف باغیوں کو اندیشہ تھا۔ عام رعایا سرکار سے بالکل مطمئن تھی۔ دوسری سلمنا غایت سے غایت یہ ہوگا کہ بعض کے لئے امانِ اول باقی ہے بعض کے لئے امانِ ثانی۔ یہ بھی مثل دونوں اِجراؤں یا دونوں اتصالوں کے ہوگا اور ترجیح دارالاسلام کو دی جائے گی۔

اور اگر بالفرض والتقدیر اس صورت میں دارالحرب بھی ہوگیا تب بھی دارالحرب اِجراے احکام اسلام مثلِ جمعہ وعید سے دارالاسلام ہو جاتا ہے۔ فی الدر المختار: وَ دارُالحرب تصیر دارالاسلام بِاجراءِ احکامِ اھلِ الاسلام فیھا کَجُمعةٍ و عِیدٍ۔ اِن بقی فیھا کَافِرٌ اَصلیٌ و اِن لم تَتَّصل بدارالاسلام۔

اس صورت میں بھی ہندوستان دارالاسلام ہوگا۔ (ص:۹۔ تحذیر الاخوان عن الربوٰ فی الھندوستان از مولانا اشرف علی تھانوی۔ اشرف المطابع، تھانہ بھون)

پس تعجب ہے کہ بعض اھلِ اسلام ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر آمدنیِ بینک کو حلال سمجھتے ہیں۔ اور بعض لوگ لے کر خود نہیں کھاتے، دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔ یہ ایک اعتبار سے پہلے

سے بُرا ہے۔'' (ص:۔۱۰۔تحذیر الاخوان از مولانا تھانوی)

ابوالحسنات مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی لکھنوی (متولد ذوالقعدہ ۱۲۶۴ھ/ اکتوبر ۱۸۴۸ء۔ متوفی ربیع الاول ۱۳۰۴ھ/ دسمبر ۱۸۸۶ء۔ فرزندِ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی متولد شعبان ۱۲۳۹ھ/ اپریل ۱۸۲۴ء۔ متوفی شعبان ۱۲۸۵ھ/ دسمبر ۱۸۶۸ء) لکھتے ہیں کہ:

''بلادِ ہند جو قبضۂ نصاریٰ میں ہیں دارالحرب نہیں ہیں۔ (ص ۳۰۲۔ جلد اول فتاویٰ عبدالحیٔ فرنگی محلی۔ مطبع یوسفی لکھنؤ)

واضح رہے کہ سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/ ۲۴۔۱۸۲۳ء) نے ہندوستان کے دارالاسلام و دارالحرب ہونے کے مسئلے پر فقہائے احناف کے تین اقوال تحریر کیے اور تیسرے قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا کہ:

''و ہمیں قولِ ثالث را محققین ترجیح دادہ اند و بریں تقدیر معمولۂ انگریزاں و اشباہ ایشاں لاشبہ دارالحرب است''۔ (ص:۱۱۰۔ جلد اول۔ فتاویٰ عزیزی۔ مطبع مجتبائی۔ دہلی)

اپنے وقت میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے برطانوی سامراج کے پنجۂ استبداد میں پھڑ پھڑاتے اور شعائرِ اسلام کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر ہندوستان کے دارالحرب ہونے کو ترجیح دی اور انہیں کے تلمیذِ رشید علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے ۱۸۵۷ء میں برطانوی سامراج اور غاصب و قابض انگریزوں کے خلاف جامع مسجد دہلی میں تقریر کی اور فتوائے جہاد دیا جس پر اس وقت کے مشہور علُما کی تحریری تصدیقات ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے اس وقت کے علُماء نے دو فتاویٰ اس کے علاوہ بھی جاری کیے۔ ایک فتویٰ پر حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) شاگردِ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا بھی دستخط ہے۔ مزید فتاویٰ بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زبانی و تحریری طور پر جاری ہوئے۔ علُمائے اہل سنت کے یہ فتاویٰ انقلاب ۱۸۵۷ء کے پیش نظر بالکل صحیح اور درست تھے۔

تاریخی ریکارڈ کے مطابق مجلسِ مذاکرۂ علمیہ کلکتہ بتاریخ ۲۳ر نومبر ۱۸۷۰ء میں مولانا کرامت علی جون پوری خلیفۂ سید احمد رائے بریلوی نے اپنی تقریر میں کہا:

’’مملکت ہندوستان بالفعل پادشاہ عیسائی مذہب کے قبضہ واقتدار میں ہے۔ مطابق فقہ حنفی کے دارالاسلام ہے اوراسی پر فتویٰ ہے۔‘‘(ص:۳۰۔اسلامی مذاکرۂ علمیہ کلکتہ مطبع نولکشور لکھنؤ)

علمائے حرمین سے بھی تقریباً ۱۸۷۰ء میں اسی سلسلے میں استفتاء ہوا جس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ محض غیر مسلم کے ہاتھ میں ملک کے چلے جانے سے نہیں بلکہ کل یا اکثر احکامِ اسلام کے اِجرااوران پر عمل کرنے میں خلل واقع ہونے سے کوئی دارالاسلام دارالحرب ہوتا ہے۔اسی طرح کا جواب شیخ جمال بن عبداللہ مفتی حنفیہ مکہ مکرمہ وشیخ احمد بن زینی دحلان مفتی شافعیہ مکہ مکرمہ نے دیا۔ (ص ۳۹۔مذاکرۂ علمیہ، کلکتہ)

جولائی ۱۸۷۰ء میں ایک فتویٰ دیا گیا کہ احکام اسلام پر عمل کی آزادی کی وجہ سے ہندوستان میں جہاد نا جائز ہے۔اس فتویٰ پر مندرجہ ذیل حضرات کے دستخط ومہر ثبت ہیں۔

مولوی محمد علی لکھنوی، مولوی عبدالحیٔ لکھنوی، مولوی فیض اللہ لکھنوی، مولوی محمد نعیم لکھنوی، مولوی قطب الدین لکھنوی، مفتی سعد اللہ لکھنوی، مولوی لطف اللہ رام پوری، مولوی غلام علی رام پوری۔ (ص:۲۱۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ ترجمہ صادق حسین۔ ناشر الکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی ۲۵۔مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

غیر مقلد محدث نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے بارے میں ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ:

انھوں نے ہندوستان کو کبھی دارالحرب نہ کہا۔(۱۳۴۔الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری۔ مکتبۂ شعیب، کراچی)

غیر مقلد عالم ومصنف نواب صدیق حسن بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) لکھتے ہیں:

’’پس فکر کرنا ان لوگوں کا جو اپنے حکم مذہبی سے جاہل ہیں اس امر میں کہ برٹش حکومت مٹ جاوے اور یہ امن وامان جو آج حاصل ہے فساد کے پردے میں جہاد کا نام لے کر اٹھادیا جائے، سخت نادانی وبے وقوفی کی بات ہے۔ بھلا ان عاقبت نا اندیشوں کا چاہا ہوگا یا اس پیغمبر صادق کا فرمایا ہوگا جس کا کہا ہوا آج ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اوراس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔(ص ۷۔ ترجمانِ

وھابیہ از نواب صدیق حسن بھوپالی۔ مطبع محمدی لاہور، مطبوعہ ۱۳۱۲ھ)

"حنفیہ جن سے یہ ملک بھرا پڑا ہے ان کے عالموں اور مجتہدوں کا تو یہی فتویٰ ہے کہ یہ دارالاسلام ہے اور جب یہ ملک دارالاسلام ہو تو پھر یہاں جہاد کرنا کیا معنی؟ بلکہ عزمِ جہاد ایسی جگہ ایک گناہ ہے بڑے گناہوں سے۔ (ص ۱۵۔ ترجمان وھابیہ از نواب صدیق حسن بھوپالی۔ مطبع محمدی لاہور)

"اس مقام پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہندوستان دارالحرب ہی ہو تو بھی حکامِ انگلشیہ کے ساتھ جو یہاں کے رئیسوں کا عہد اور صلح ہے اس کا توڑنا بڑا گناہ ہے۔ (ص ۲۶۔ حوالۂ مذکورہ)

لفظِ وھابی کی جگہ حکومتِ انگلشیہ سے اھلِ حدیث نام رجسٹرڈ کرانے والے معروف غیر مقلد وکیل مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) لکھتے ہیں:

"جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہو وہ شہر یا ملک دارالحرب نہیں کہلاتا۔ پھر اگر وہ دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہو اور اقوامِ غیر نے اس پر تغلب سے تسلط پالیا ہو تو جب تک اس میں ادائے شعائرِ اسلام کی آزادی ہے وہ بحکمِ حالتِ قدیم دارالاسلام کہلاتا ہے۔ (ص: ۱۹۔ الاقتصاد فی مسائل الجہاد از محمد حسین بٹالوی۔ وکٹوریہ پریس لاہور)

تحریک خلافت (۱۹۱۹ء) کے بانی حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال رجب ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) اپنے ایک خط مطبوعہ اخبار مشرق گورکھپور مورخہ ۶ر مئی ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ہم لوگ ہندوستان کو دارالاسلام سمجھتے ہیں اور اعزازِ دین واعلائے کلمۃ الحق کی نیت سے قیام کیے ہوئے ہیں اس واسطے ہجرت فرض نہیں جانتے مگر جب چارہ نہ ہو" الخ۔ (ص ۱۳۸۔ تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ طبع دوم ۱۹۹۷ء)

سلطنتِ عثمانیہ کے وارثین یعنی عثمانی سلاطین ترکی جب غفلت و سستی، خود غرضی و تنگ نظری اور حرصِ جاہ و مال کے ہاتھوں مجبور ہو کر دست بگریباں ہونے لگے اور دنیا کی نام نہاد متمدن حکومتوں بالخصوص برطانیہ کی نگاہیں ان کی طرف تیز ہونے لگیں تو رفتہ رفتہ ان پر گرفت مضبوط کر کے ظلم

واستبداد کے پہاڑ توڑے جانے لگے اور ان کی سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گیا جس کے نتیجہ میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں اور کروڑوں، اربوں روپے کی مالی و معاشی تباہی و بربادی ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں ترکوں نے پوری طاقت اور اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ حصہ لیا تھا اور ایک عالمگیر شورش برپا ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب انگریزوں کی سازش سے ترکی کے اندر خانہ جنگی کے حالات پیدا ہوئے تو ۱۹۱۹ء میں سلطنتِ عثمانیہ کی حمایت واعانت کے لئے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی رجب ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) نے ''تحریک خلافت'' کی داغ بیل ڈالی جس نے مسلمانانِ ہند کے درمیان عجیب و غریب جوش وخروش پیدا کر دیا تھا۔ اور ہر طرف اس تحریک کا شور و ہنگامہ نظر آنے لگا۔ چوں کہ مولانا محمد علی جوہر و مولانا حسرت موہانی اور مولانا عبدالماجد بدایونی و مولانا ثنا احمد کانپوری نیز مفتی کفایت اللہ دہلوی و ابوالکلام آزاد و حکیم اجمل خاں و ڈاکٹر مختار احمد انصاری و شوکت علی اور مختلف طبقات کے بہت سے عُلماء و مسلم قائدین بھی اس میں شامل ہو گئے اس لئے ان کے اثر سے تحریک خلافت نے کافی وسعت اور جذباتی شدت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں ایک سائل نے حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہ (ولادت ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء/ وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) سے یہ سوال کیا کہ:

''سلطنتِ عثمانیہ کی اعانت مسلمانوں پر لازم ہے یا نہیں؟ فرضیتِ اعانت کے لئے بھی سلطان کا قرشی ہونا شرط ہے یا صرف خلافتِ شرعیہ کے لئے یا کسی کے لئے نہیں؟

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خطبۂ صدارت میں اس سے متعلق چند سطور ہیں۔ اور مسٹر ابوالکلام آزاد نے رسالہ ''مسئلہ خلافت'' و ''جزیرۃ العرب'' میں ص ۳۲ سے ص ۷۰ تک حسبِ عادت اسے بہت پھیلا کر بیان کیا ہے۔ ان دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ ''خلافتِ شرعیہ میں بھی قرشیت شرط نہیں'' یہ صحیح ہے یا غلط؟ اور اس بارے میں مذہب اھل سنت کیا ہے؟

اس کے جواب میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی اولاً اجمالی طور پر اس طرح رقم طراز ہیں:

(امابعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلدِّینُ النَّصِیحۃُ لِلّٰہ ولِکتابہٖ وَلِرَسُولہٖ وَلائمَّۃِ المسلمین وَعَامَّتِہِ م۔رواہ احمد و مسلم وابوداؤد والنسائی عن تمیم الداری والترمذی والنسائی عن ابی ھریرۃ واحمد عن ابن عباس والطبرانی فی الاوسط عن ثوبان رضی اللہ تعالٰی عنہم۔

بیشک دین یہ ہے کہ اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول سے سچا دل رکھے اور سلاطین اسلام اور جملہ مسلمانوں کی خیر خواہی کرے۔

سلطنت علیہ عثمانیہ اَیَّدَھا اللّٰہ تعالی نہ صرف عثمانیہ ہر سلطنت، نہ صرف سلطنت ہر جماعتِ اسلام، نہ صرف جماعت ہر فردِ اسلام کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔اس میں شرطِ قرشیت کیا معنی؟

دل سے خیر خواہی مطلقاً فرض عین ہے اور وقتِ حاجت دُعا سے امداد واعانت بھی ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس سے کوئی عاجز نہیں۔اور مال یا اعمال سے اعانت فرضِ کفایہ ہے اور ہر فرض بقدرِ قدرت۔ہر حکم بشرطِ استطاعت۔ قال اللّٰہ تعالی:

لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفساً اِلَّاوُسْعَھَا.

وقال تعالی: فَاتَّقوااللّٰہَ مَااستَطَعتُم.

مفلس پر اعانتِ مال نہیں۔ بے دست وپا پر اعانتِ اعمال نہیں۔ولہذا مسلمانانِ ہند پر حکمِ جہاد وقتال نہیں۔

بادشاہِ اسلام اگر چہ غیر قریشی ہو اگر چہ کوئی غلامِ حبشی ہو، اُمورِ جائزہ میں اس کی اِطاعت تمام رعیت اور وقتِ حاجت اس کی اِعانت بقدرِ استطاعت سب اہلِ کفایت پر لازم ہے۔

البتہ اہل سنت کے مذہب میں خلافتِ شرعیہ کے لئے ضرور قرشیت شرط ہے۔اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر حدیثیں منقول ہیں۔اسی پر صحابہ کا اجماع، تابعین کا اجماع، اہل سنت کا اجماع ہے۔اس میں مخالف نہیں مگر خارجی یا کچھ معتزلی۔ کتبِ عقائد وکتبِ حدیث وکتب فقہ اس سے مالا مال ہیں۔

بادشاہ غیر قرشی کو سلطان، امام، امیر، والی، ملک کہیں گے۔ مگر شرعاً خلیفہ یا امیر المومنین کہ یہ

بھی عرفاً اسی کا مرادف ہے ہر بادشاہِ قرشی کو بھی نہیں کہہ سکتے سِوا اس کے جو ساتوں شرطِ خلافت۔ اسلام۔ بلوغ۔ عقل۔ حریت۔ ذکورت۔ قدرت۔ قرشیت۔ سب کا جامع ہو کر تمام مسلمانوں کا فرماں روائے اعظم ہو۔ (ص:۱۳تا۱۵- دوام العیش فی الائمة من قریش۔ (۱۳۳۹ھ) مطبوعہ حسنی پریس بریلی۔ وص:۱۷۴و۱۷۵،فتاویٰ رضویہ جلد۱۴۔رضا فاؤنڈیشن لاہور)

کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"زمانۂ صحابہ سے برابر علُمائے کرام خُلفا وملوک کوعلحدہ کرتے آئے حتی کہ خود سلاطین اسی کے پابندرہے۔اورآج تک ہیں۔بڑے بڑے جبار بادشاہ گذرے۔کبھی غیر قریش نے ترک ہوں یا مغل یا پٹھان یا کوئی،اپنے آپ کوخلیفہ نہ کہلوایا نہ خلافتِ مصطلحۂ شرعیہ کا دعویٰ کیا۔جب تک خلافتِ عباسیہ قائم رہی،خلیفہ ہی کی سرکار سے سلاطین کی تاج پوشی ہوتی۔سلطان دستِ خلیفہ پر بیعت کرتا اوراس منصبِ شرعی کا مستحق اسی کو جانتا اگرچہ زور وطاقت وسطوت میں اس سے کہیں زائد ہوتا۔(ص ۱۵۔دوام العیش فی الائمة من قریش۔ (۱۳۳۹ھ) مطبوعه حسنی پریس بریلی۔وص:۱۷۵،فتاویٰ رضویه ، جلد۱٤، مطبوعه لاهور)

سلاطینِ اسلام کے متعدد واقعاتِ بیعت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

" الحمد لِلّٰه ! کیسے روشن بیانوں سے ثابت ہوا کہ یہ سارے جلوے شرط قرشیت کے تھے۔تمام سلاطین کا خود یہی عقیدہ تھا کہ ہم بوجہ عدمِ قرشیت لائقِ خلافت نہیں۔قرشی کے سوا دوسرا شخص خلیفہ نہیں ہوسکتا۔کہ ہروقت وقرن کے عُلَماء انہیں یہی بتاتے رہے۔اورقطعاً یہی مذہب اہل سنت ہےاوراسی پراجماعِ صحابہ واجماعِ امت ہے۔اوراسی پر احادیثِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر شہادت ہے۔فماذا بعد الحقِ اِلّاالضَّلال؟

رہامسئلۂ اعانت! کیا آپ لوگوں کے زعم میں سلطانِ اسلام کی اعانت کچھ ضروری نہیں؟ صرف خلیفہ کی اعانت چاہیے؟ کہ مسلمانوں کواعانت پر ابھارنے کے لئے اِدعائے خلافت ضرور ہوا؟

یا سلطانِ مسلمین کی اعانت صرف قادروں پر ہے۔اور خلیفہ کی اطاعت بلاقدرت بھی فرض

ہے؟ یہ نصوصِ قطعیہ کے خلاف ہے۔

اور جب کوئی وجہ نہیں پھر کیا ضرورت تھی کہ سیدھی بات میں جھگڑا ڈالنے کے لئے جملہ عُلمائے کرام کی واضح تصریحاتِ متظافرہ اوراجماعِ صحابہ واجماع امت واحادیثِ متواترہ کے خلاف یہ تحریک لفظ خلافت سے شروع کر کے عقیدۂ اجماعیت کا خلاف کیا جائے؟ خارجیوں، معتزلیوں کا ساتھ دیا جائے۔ دوراَز کار تاویلوں، تبدیلیوں، تحریفوں، خیانتوں، عنادوں، مکابروں سے حق چھپانے اور باطل پھیلانے کا ٹھیکہ لیا جائے۔ والعیاذ بِاللّٰہ تعالی۔(ص:۱۸۳، فتاویٰ رضویہ ،ج ۱۴، مطبوعہ لاہور)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے تقریباً پچاس احادیثِ کریمہ اور کتبِ عقائد وتفسیر وحدیث وفقہ کی بانوے ۹۲ عبارتوں سے خلافت کے لئے قرشیت کا شرط ہونا ثابت کیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی رجب ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) جواس وقت تحریکِ خلافت کے بانی وقائد وقافلہ سالار تھے ان کا ایک خطبۂ صدارت جس میں ۱۵ سطریں اس موضوع سے متعلق تھیں اُس میں انہوں نے کہا کہ خلافت کے لئے شرطِ قرشیت صرف حضراتِ شوافع کے نزدیک ہے۔اور بعض احناف کا کلام بھی ہے۔اس میں بھی تصریح نہیں۔

۳۵ وجوہ سے حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے اس کا رد فرمایا اور آخر کلام میں لکھا ہے:

''آغاز میں کہا: اہل سنت مسلم متغلب یعنی فاقد الشرط کی اطاعت کو فرض اور امامت کو درست مانتے ہیں''۔

اس امامت سے مراد اگر خلافت ہے جیسا کہ یہی ظاہر ہے تو قطعاً مردود جس کا روشن بیان گذرا۔اور اگر سلطنت مقصود تو حق ہے۔

مگر گذارش یہ ہے کہ جب مسئلہ یوں تھا اور بیشک تھا کہ متغلب کی بھی سلطنت صحیح اور اطاعت واجب تو کیا ضرورت تھی کہ خواہی نخواہی مسئلۂ خلافت چھیڑا جائے اوراجماعِ صحابہ وامت اکھیڑا جائے۔ مذہب اہلسنت وجماعت ادھیڑا جائے......

ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اصل مقصود بغلامی ہنود سوراج کی چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کردی ہے۔ بھاری بھرکم خلافت کا نام لو۔ عوام بھڑیں۔ چندہ خوب ملے اور گنگا و جمنا کی مقدس زمین آزاد کرانے کا کام چلے۔

اے پس روِ مشرکاں بزمزم نہ رسی
کیں رہ کہ تو میروی بہ گنگ وجمن ست

نَسْئَلُ اللّٰہَ العفوَ والعافیۃ۔

ترکی سلاطین پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ وہ خود اہلسنت تھے اور ہیں۔ مخالفتِ مذہب انہیں کیوں کر گوارہ ہوتی؟ انہوں نے خود خلافتِ شرعیہ کا دعویٰ نہ فرمایا۔ اپنے کو سلطان ہی کہا۔ سلطان ہی کہلوایا۔ اس لحاظِ مذہب کی برکت نے انہیں وہ پیارا خطاب دلایا کہ امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین سے دلکشی میں کم نہ آیا۔ یعنی ''خادمُ الحرمین الشریفین''

کیا ان القاب سے کام نہ چلتا جب تک مذہب واجماعِ اہلسنت پاؤں کے نیچے نہ کچلتا؟ نعوذ باللّٰہ مما لا یرضاہ ۔(دوام العیش فی الائمۃ من قریش. از امام احمدرضا۔مطبوعہ حسنی پریس، بریلی۔وص:٢٢٤و٢٢٥،فتاویٰ رضویہ ،جلد١٤،مطبوعہ لاہور)

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) کی تحریر پر بھی چار حرف ملاحظہ فرمائیں۔ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے قلم برداشتہ ۲۵ طریقوں سے خلافت کے سلسلے میں ان کے موقف کا رد فرمایا ہے:

(۱) مسٹر آزاد نے بڑا زور اس پر دیا ہے کہ اسلام تو قومی امتیاز کو اٹھانے کے لئے آیا ہے پھر وہ خلافت کو قریش کے لئے کیسے خاص کر سکتا ہے؟

مقاصد وشرحِ مقاصد سے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ خارجیوں کا پرانا اعتراض ہے۔ اہلسنت کے نزدیک امام کا قریشی ہونا شرط ہے۔ اس لئے کہ مصالحِ سلطنت ودین میں شرفِ نسب کو ضرور دخل ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ سید

الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں میں سے ظہور فرمایا۔

(۲) بزورِ زبان بڑا زور اس پر دیا ہے (ص ٦٠) کہ خلافتِ قریش کی نسبت جس قدر روایات ہیں، سب پیشگوئی وخبر ہیں کہ قریشی ہی خلیفہ ہوں گے۔ نہ حکم کہ قریشی ہی خلیفہ ہوں۔

شرح عقائد نسفی، وقواعد العقائد امام حجۃ الاسلام، واتحاف سید زبیدی، ومسامرہ شرح مسایرہ۔ وتعلیقات علامہ قاسم، وطوالع الانوار علامہ بیضاوی، ومواقف علامہ قاضی عضد، وشرح مواقف علامہ سید شریف۔ ومقاصد وشرح مقاصد وشرح صحیح مسلم للامام النووی۔ وارشاد الساری ومرقاۃ قاری وشرح صحیح مسلم للقرطبی وابن المنیر وعمدہ القاری امام عینی وفتح الباری امام عسقلانی وشرح مشکوٰۃ علامہ طیبی وشرح مشکوہ علامہ سید شریف وامام اجل ابوبکر باقلانی واشعۃ اللمعات شیخ محقق (دہلوی) وغمز العیون سید حموی وحاشیہ الدر للسید الطحطاوی وللسید ابن عابدین وکواکب کرمانی ومجمع البحار وشرح فقہ اکبر بحر العلوم وغیرہا کی عباراتِ کثیرہ ابھی گذریں (دوامُ العیش میں) جو اس مجہلہ کے ردکو بَس ہیں۔

مسٹر آزاد اگرچہ اپنے نشے میں تمام ائمہ مجتہدین کرام سے اپنے آپ کو اعلیٰ جانتے ہیں۔ ان کے ارشادات کو ظنی اور اپنے توہمات کو وحی سے مکتسب قطعی مانتے ہیں۔ الخ (ص ٦٧و٦٨ دوام العیش فی الائمۃ من قریش۔ از امام احمد رضا۔ مطبوعہ بریلی، وص: ٢٣٠، فتاویٰ رضویہ، ج ١٤، مطبوعہ لاہور)

(۳) مسٹر آزاد نے اشد ظلم حدیثِ صحیحین "لایزال ھذا الامر فی قریش" پر کیا ہے۔ اس میں لفظ وہ لیے جو صحیح بخاری میں واقع ہوئے مابقی منھم اثنان اور کہہ دیا کہ اگر اس کا مطلب یہ قرار دیا جائے کہ جب تک دو انسان بھی قریش میں ہیں خلافت انہیں کے قبضے میں رہے گی تو یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر قریش میں دو بھی خلافت کے اہل ہوں گے تو کبھی خلافت سے یہ خاندان محروم نہ ہوگا۔

شوخ چشمی ہو تو اتنی ہو، نام صحیح مسلم کا بھی لیا اور کہا عمدہ طریق وہ ہیں جو بخاری نے اختیار کیے ہیں۔

اولاً۔ مسلم نے یہ حدیثیں خود انہیں استاذِ بخاری احمد بن عبداللہ یونس سے جن سے بخاری نے سنی، یوں روایت کی:

ولایزالُ ھذا الامرُ فی قریش مَابَقِی مِنَ النَّاس اِثنانِ.

ہمیشہ خلافت قریش ہی میں رہے گی جب تک دنیا میں دو آدمی بھی باقی رہیں گے۔

اسی طرح اسمٰعیلی نے مستخرج میں روایت کی:

مَابَقِیَ فِی النَّاس اِثنان.

جب تک آدمیوں میں دو بھی رہیں۔

یہ روایتیں روایت بخاری کی مفسر ہیں کہ:

منھم سے مراد من الناس ہے۔ لاجرم مرقاۃ علی قاری میں اس کی یہی تفسیر کردی:

(منھم)ای من الناس (اثنان)

جب تک ان میں سے یعنی آدمیوں میں سے دو بھی رہیں۔

ولہٰذا امام اجل ابوزکریا نووی نے اولاً مسلم کی روایتیں ذکر کیں۔ پھر فرمایا:

وفی روایۃِ البخاری مابقی منھم اثنان. ھذہ الاحادیثُ واشباھھا دلیلُ ظاھرُ اَنَّ الخِلافۃَ مختصۃ بقریش لا یجوزُ عقدُھا لاحدٍ مِن غیرِھم. الخ

ثانیاً۔ اگر تفسیر نہ مانو تعارض جانو۔ تو متعدد کی روایت کیوں نہ ارجح ہو؟ اور نہ سہی۔ معارض تو ہوگی؟ تو تمہاری سند کہ منھم ہے، ثابت نہ رہے گی۔

ثالثاً۔ کسی پرچہ اخبار کی ایڈیٹری اور چیز ہے اور حدیث وفقہ کا سمجھنا اور۔ وہ مِن کا ترجمہ ''سے ''اور اِلیٰ کا ترجمہ ''تک'' کرلینے سے نہیں آتا۔

اگر ضمیر قریش کی طرف ہوتی تو اثنان کی جگہ احد فرمایا جاتا۔ یعنی جب تک ایک قریشی بھی رہے۔ جس طرح ابھی امام قرطبی اور امام عینی وامام عسقلانی کے لفظ سن چکے۔

اس کی تاویل آپ حسب عادت کہ قرآن کریم میں اپنی طرف سے اضافے کرلیتے ہیں، حدیث میں یہ پخر بڑھاتے کہ یعنی جب تک کہ ایک قریش خلافت کا اہل رہے۔ دو کی اہلیت پر

موقوف فرمانا کیا معنی؟ کیا خلیفہ ایک وقت میں دو بھی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

ہاں! آدمیوں کی طرف ضمیر ہو تو ضرور دو کی ضرورت تھی۔ کہ خلافت حکومت ہے۔ اور حکومت کو کم سے کم دو درکار ایک حاکم ایک محکوم۔ اب تو آپ نے جانا کہ منھم کی ضمیر قریش کی طرف پھیرنا کیسی سخت جہالت تھی۔ الخ۔ (ص ۷۰. دوام العیش فی الائمۃ من قریش. از امام احمد رضا. مطبوعہ بریلی، وص: ۲۳۲، فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴، مطبوعہ لاہور)

(۴) مسٹر آزاد فرماتے ہیں: تاریخ شاہد ہے کہ دو قریش بھی حکمرانی کے اہل نہ رہے۔

کون سی تاریخ شاہد ہے؟ کہ سات سو یا بلحاظ خلافتِ مصری چار سو سولہ برس سے تمام روئے زمین پر کوئی دو قریشی دو ہاشمی دو سید ابن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم حکمرانی کے لائق پیدا ہی نہ ہوئے؟ فضلِ الٰہی قوم محمد صلی اللہ علیہ وسلم وخاندانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وآل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے صدہا سال سے اٹھالیا گیا اور این وآں کو بٹتا ہے اور بٹا کیا؟

آپ کے نزدیک مدارِ لیاقت وقوع پر ہے۔ جس نے حکمرانی نہ پائی نا اہل تھا؟ جس نے پائی اہل تھا؟ تو ضرور آپ پلید مرید خبیث عنید نجس یزید کو لائق بتائیں گے اور حضرت امام عرش مقام علیٰ جدہٖ وعلیہ الصلوۃ والسلام کو معاذ اللہ نالائق ٹھہرائیں گے۔ اور جب یہ معیار نہیں بلکہ صفاتِ ذاتیہ پر مدار ہے۔ تو کیا آپ نے سات سو چار برس سے آج تک کے تمام قریشیوں کی جانچ کر لی ہے کہ نالائق تھے؟ نعوذ باللہ۔

افسوس! آپ کا مبلغِ علم یہی تاریخی کہانیاں ہیں۔ ان پر بھی ایسا جیتا افترا جوڑا۔ تاریخیں ہزار بے تکی ہوں، ایسا پورے نشے کا ہذیان بکتے انہیں بھی عار آئے گی۔ (ص ۷۱، دوام العیش فی الائمۃ من قریش. از امام احمد رضا. مطبوعہ بریلی، وص: ۲۳۳، فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴، مطبوعہ لاہور)

(۵) مسٹر آزاد نے یوہیں دوسری حدیث الائمۃ من قریش سے تشریع اڑانے اور نری خبر بتانے کے لئے کیا کیا ڈوبتے سوار پکڑے ہیں۔ لکھتے ہیں: (ص ۶۳)

صحیح بخاری کے ترجمۂ باب سے صاف واضح ہے کہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے۔

انہوں نے باب باندھا (اَلْاُمَراءُ مِن قریش) قریش میں امارت واُمراء۔ اس مضمون کا باب نہ باندھا کہ امارت ہمیشہ قریش ہی میں ہونی چاہیے۔

سبحٰن اللہ! زہے مسٹری ولیڈری وایڈیٹری۔

امام بخاری کی عادت ہے کہ الفاظِ حدیث سے ترجمۂ باب کرتے ہیں نیز وہ الفاظ جوان کی شرط پر نہ ہوں ترجمہ سے ان کا پتہ دیتے ہیں۔ حدیث انہیں لفظوں سے تھی۔ انہیں سے باب باندھا۔ نیز یہ لفظ ان کی شرط پر نہ تھے۔ ترجمہ سے ان کا اِشعار کیا۔

اس سے یہ سمجھ لینا کہ امام بخاری کا مذہب یہ ہے اور اس پر یہ تحکم کہ "صاف واضح ہے" کس قدر جہل فاضح ہے۔ الخ۔ (ص ۷۲۔ دوام العیش فی الائمة من قریش۔ از امام احمد رضا۔ مطبوعه بریلی۔ وص: ۲۳۴، فتاویٰ رضویه، ج ۱۴، رضا فاؤنڈیشن لاهور)

اس طرح عُلمائے متجددین نے نصوص کو توڑ مروڑ کر احکام شریعت کی سراسر مخالفت کی۔ اور خلافت کے نام پر پورے ملک کے مسلمانوں میں عام طور پر حرارت وگرمی پیدا کر دی اور دوسری طرف انگریز حاکموں کے خلاف بھی ملک کے طول وعرض میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ جو تحریکِ خلافت کا اِستحصال کرنے والے سیاسی لیڈروں کا اصل مقصد تھا کہ مذہبی جذبات برانگیختہ کر کے ان سے اپنے سیاسی مقاصد وعزائم پورے کیے جائیں۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی اس تنبیہ وھدایت پر عُلمائے تحریک خلافت وترکِ موالات نے بھی توجہ دینا اور اس کے مطابق عمل کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی تو دیگر زُعما وحامیانِ تحریک سے کیا شکوہ؟ جب کہ آپ کا یہ شرعی واصولی موقف کتنا واضح وصریح اور مفید وصحیح تھا کہ:

"رہا مسئلۂ اعانت، کیا آپ لوگوں کے زعم میں سلطانِ اسلام کی اعانت کچھ ضرور نہیں؟ صرف خلیفہ کی اعانت جائز ہے کہ اِدّعائے خلافت ضرور ہوا؟

یا سلطانِ مسلمین کی اعانت صرف قادروں پر ہے اور خلیفہ کی اطاعت بلا قدرت بھی فرض ہے؟ یہ نصوصِ قطعیۂ قرآن کے خلاف ہے۔ اور جب کوئی وجہ نہیں پھر کیا ضرورت تھی کہ سیدھی بات

میں جھگڑا ڈالنے کے لئے جملہ علماے کرام کی واضح تصریحاتِ متظافرہ اور اجماعِ صحابہ واجماعِ امت واحادیثِ متواترہ کے خلاف یہ تحریک لفظ خلافت سے شروع کر کے عقیدۂ اجماعیہ اہل سنت کا خلاف کیا جائے۔ خارجیوں، معتزلیوں کا ساتھ دیا جائے، دوراَز کار تاویلوں، تبدیلوں، تحریفوں، خیانتوں، عنادوں، مکابروں سے حق چھپانے اور باطل پھیلانے کا ٹھیکہ لیا جائے؟ والعیاذ باللّٰہ تعالیٰ،
(دوام العیش مطبوعہ بریلی۔ وص: ۱۸۳، فتاویٰ رضویہ، جلد۱۴، رضا فاؤنڈیشن لاہور)
ترک سلاطینِ اسلام پر رحمتیں ہوں، وہ خود اہل سنت تھے اور ہیں، مخالفت انہیں کیوں کر گوارہ ہوتی؟ انہوں نے خود خلافتِ شرعیہ کا دعویٰ نہ فرمایا۔ اپنے آپ کو سلطان ہی کہا، سلطان ہی کہلوایا۔ اس لحاظِ مذہب کی برکت نے انہیں وہ پیارا خطاب دلایا کہ امیر المؤمنین وخلیفۃ المسلمین سے دل کشی میں کم نہ آیا یعنی **خادمُ الحرمین الشریفین**۔
کیا ان القاب سے کام نہ چلتا جب تک مذہب واِجماعِ اہلِ سنت پاؤں کے نیچے نہ کچلتا؟ **نعوذ باللّٰہ مِمّا لا یرضاہ، والصلوٰۃ والسلام علیٰ مصطفاہ وآلہٖ وصحبہٖ الا کارم الھُداۃ**، (دوام العیش، مطبوعہ بریلی۔ وص: ۲۲۵، فتاویٰ رضویہ، ج۱۴، رضا فاؤنڈیشن لاہور)
اپنے منصوبہ کے مطابق اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر گاندھی اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے نہ صرف یہ کہ کھل کر مسلم لیڈروں کا ساتھ دیا بلکہ کانگریس نے انہیں ایام میں ماہِ اگست ۱۹۲۰ھ میں ترک موالات کا اعلان کر کے اپنے اصل منصوبے کی طرف پیش قدمی کر دی۔
''ہندو مسلم اتحاد'' یعنی بالفاظِ دیگر مشرک نوازی کی ایک نئی فضا تیار کر کے تحریک خلافت اور'' نان کوآپریشن'' (ترک تعاون) کے جیالوں نے مخالفت ومقاطعتِ انگریز میں ایک دوسرے پر مسابقت شروع کر دی۔
تحریکِ ترکِ موالات کے چوٹی کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد نے یہاں تک کہہ دیا کہ:
'' حکومت سے ترکِ موالات اس طرح فرض ہے جس طرح نماز اور روزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام فرض ہیں۔'' (ص ۱۶۴۔ تبرکاتِ آزاد از غلام رسول مہر۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء)
اصل مقصدِ تحریک از تحریک خلافت تا تحریک ترک موالات کی نقاب کشائی کرتے ہوئے

مولانا آزاد کہتے ہیں کہ:

''کوشش اور لڑائی صرف اماکنِ مقدسہ اور خلافت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دلانے کے لئے ہے۔ اگر خلافت کا خاطر خواہ فیصلہ ہو بھی جائے تاہم جدوجہد جاری رہے گی اس وقت تک کہ ہم گنگا و جمنا کی مقدس سرزمین آزاد نہ کرالیں۔ (ص:۲۴۔ دوامغ الحمیر۔ مطبوعہ بریلی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۰ء)

عبدالقوی دسنوی اس دور کی اتحادی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۱۹ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا اس قدر زور تھا کہ کلکتہ اور دہلی کے مسلمانوں نے غیر مسلموں کو بھی جلسوں میں شریک ہونے کے لئے مسجدوں میں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ دہلی کے مسلمانوں نے شردھانند سے جامع مسجد میں تقریر کرائی۔'' (ص:۶۶۔ ابوالکلام آزاد۔ از عبدالقوی دسنوی۔ ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی۔ ۱۹۸۷ء)

استاذ العلماء حضرت مفتی لطف اللہ علی گڑھی (وصال ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) کے شاگرد اور پنجاب کے مشہور عالم و شیخِ طریقت حضرت سید مہر علی شاہ چشتی (گولڑہ شریف ضلع راولپنڈی، پنجاب۔ وصال ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۶ء) خلیفۂ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی چشتی (وصال ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء) فرماتے ہیں کہ:

''یہود اور مشرکین کی عداوت قرآن شریف میں صراحۃً مذکور ہے۔ پس ترکِ موالات ہندو اور انگریز اور یہود سب سے ہونی چاہیے۔ تفریق اور ترجیح بلا مرجّح ٹھیک نہیں۔'' (ص:۴۔۲۷۔ باب ۵، فصل ۷، مہرِ منیر۔ مؤلفہ مولانا فیض احمد چشتی۔ مطبوعہ پاک و ہند)

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) کے بطن سے تحریک ترک موالات (۱۹۲۰ء) پیدا ہوئی تھی۔ مسئلہ خلافت پر اس زمانے میں کافی علمی و قلمی معرکہ آرائی ہوئی۔ امام احمد رضا بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) خلافتِ شرعیہ اور خلیفۂ شرعی کے لئے شرائطِ سبعہ وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خلیفہ میں قریشی ہونے کی شرط جمیع علما کا مذہب ہے۔ اور بے شک اسی سے صدیق اکبر و فاروق اعظم نے روزِ سقیفہ انصار پر حجت فرمائی اور صحابہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہ کیا اور بے شک

علماء نے اسے مسائلِ اجماع میں گنا اور سلفِ صالح میں کوئی قول یا فعل اس کے خلاف منقول نہ ہوا۔ یوہیں تمام زمانوں میں علمائے مابعد سے۔ الخ (ص:۳۶۔دوام العیش فی الائمۃ من قریش۔مطبوعہ بریلی)

خلافتِ شرعیہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے تحقیق و تفصیل کے ساتھ احادیثِ کریمہ کی روشنی میں لکھا ہے کہ استحقاقِ خلافت کے لئے پدری نسب کے لحاظ سے قریشی ہونا شرط ہے۔ (دیکھیے شرائطِ استحقاقِ خلافت فصل اول در مقصد اول۔ اِزالۃُ الخفاء عن خلافۃِ الخُلفاء۔جلد اول۔مؤلفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ترجمہ اردو از عبد الشکور فاروقی، مطبوعہ حافظی بک ڈپو۔دیوبند، سہارن پور)

حضرت سید مہر علی چشتی (گولڑہ ضلع راولپنڈی) مسئلہ خلافت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''صحیح حدیث کی رُو سے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد صرف تیس برس تک اسلامی خلافت (راشدہ) قائم رہی۔ بعد ازاں سلطنت ہوگئی تھی جس کے لئے حدیث شریف میں ''عضوضیت'' اور جبر کا مفہوم آیا ہے۔ مذہب اسلام ایسی سلطنت کو خلافتِ جاریہ ضرور یہ قرار دیتے ہوئے اس کے جواز کی ذمہ داری قبول کرے تو یزید بن معاویہ اور منصور عباسی بھی سلاطینِ جابرہ کی بجائے خلفائے نبوی قرار پائیں گے۔ الخ۔ (ص:۲۷۰۔مہر منیر، مطبوعہ پاک و ہند)

بریلی کے اجلاسِ جمعیۃ العلمائے ہند مارچ ۱۹۲۱ء/ رجب ۱۳۳۹ھ میں جس طرح مولانا سید سلیمان اشرف سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) نے مولانا ابو الکلام آزاد و مفتی کفایت اللہ دہلوی وغیرہ کو مخاطب کرتے ہوئے واضح کیا کہ:

''ہمیں ترکی کی اسلامی سلطنت کی ہمدردی و اعانت سے انکار نہیں۔ یہ امداد و اعانت تمام مسلمانانِ عالم پر فرض ہے۔ نہ ہی ہم انگریزوں کی دوستی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ موالات ہر نصرانی و یہودی سے ہر حال میں حرام اور حرام قطعی ہے۔ ہمیں تو ہندو مسلم اتحاد اور اس اتحاد کی بنا پر کیے جانے والے غیر اسلامی افعال و اقوال سے اختلاف ہے۔'' (ص:۶۔روداد مناظرہ، مطبوعہ بریلی)

ٹھیک اسی طرح تحریک کے اندر پائی جانے والی غیر شرعی حرکات کی مخالفت کرتے ہوئے

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے خلفِ اکبر مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۶۲ ۱۳ھ/۱۹۴۳ء) نے اسی جمعیۃ العلمائے ہند کے اسٹیج سے اپنا یہ موقف واضح کیا کہ:

''حرمین شریفین و مقاماتِ مقدسہ وممالکِ اسلامیہ کی حفاظت وخدمت ہمارے نزدیک ہر مسلمان پر بقدرِ وسعت وطاقت فرض ہے۔ اس میں ہمیں خلاف نہ ہے نہ تھا۔ اسی طرح سلطانِ اسلام و جماعتِ اسلام کی خیر خواہی میں ہمیں کچھ کلام نہ ہے نہ تھا۔ تمام کفار و مشرکین ونصاریٰ و یہود و مرتدین وغیرھم سے ترکِ موالات ہم ہمیشہ سے ضروری وفرض جانتے ہیں۔'' (ص:۲۸۔ روداد مناظرہ، مطبوعہ بریلی)

اتحاد وموالاتِ مشرکین کے بارے میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

''مشرکین سے اتحاد و وداد، دوستی، موالات کہ سب کا حاصل ایک ہے بلکہ اتحاد سب میں زائد ہے، حرام قطعی وکبیرۂ شدیدہ ہے۔ (مکتوبات امام احمد رضا بریلوی بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی برائے ہدایتِ توبہ محررہ۔ شعبان ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء۔ مطبوعہ پاک وہند)

تحریک عدمِ اشتراکِ عمل اور عدم تعاون کو تحریکِ موالات و مؤدت بنانا، اور آیات واحادیث کی غلط تعبیر وتشریح کرنا اور کفار ومشرکین کے ساتھ وداد ومحبت کا رشتہ قائم کرنا، نیز شرعی اصول اور تقاضوں کو نظر انداز کرنا، علما وقائدینِ تحریک کی بنیادی اور زبردست غلطی تھی۔ اگر مسلمانوں کو سیاسی لحاظ سے یہ پیغام دے کر اس تحریک سے وابستہ کیا جاتا کہ انگریز اس ملک کے غاصب وقابض حکمراں ہیں۔ یہ ہمارے ملک کو غلام بنا رہے ہیں۔ ہندوستانیوں پر ظلم وستم کررہے ہیں۔ مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری بنا رہے ہیں اس لئے ان کے خلاف محاذ بنا کر انھیں ملک سے باہر کیا جائے۔ اس طرح کی باتیں ہوتیں تو بہت سے وہ علما ومشائخ بھی اس تحریک کا کسی نہ کسی انداز سے ضرور تعاون کرتے جو اس کی بے اصولی وبے اعتدالی وکج روی کی وجہ سے اس سے دور رہے۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

حضرات لیاڈر نے مسئلہ موالات میں سب سے بڑھ کر اُدھم مچائی، اوروں میں افراط یا تفریط ایک ہی پہلو پر گئے، اس میں دونوں کی رنگت رچائی، افراط وہ کہ نصاریٰ سے نری معاملت بھی حرام قطعی

اور تفریط یہ کہ ہندوؤں سے اتحاد بلکہ ان کی غلامی فرضِ شرعی۔(المحجۃ المؤتمنۃ، مطبوعہ بریلی، وص:۵۳۱، فتاویٰ رضویہ، جلد۱۴، مطبوعہ لاہور)

ہجرت کا غُل مچایا اور اپنے آپ ایک نہ سَرکا، جو بھارنے میں آگئے ان مصیبت زدوں پر جو گذری سوگذری، یہ سب اپنے جورو بچوں سے چین سے رہے، ہَرّ الگا نہ پھٹکری۔اور ترکِ تعاون میں بھی کیا کسی لیڈر یا مبلغ کے پاس زمینداری اور کسی قسم کی تجارت نہیں؟ نہ ان کا کوئی انگریزی یا ریاست میں ملازم ہے؟ پھر انہیں کیوں نہیں چھوڑتے؟(ص:۵۳۳، فتاویٰ رضویہ، جلد۱۴۔مطبوعہ لاہور)

اور ریل، ڈاک، تار کیا انگریزوں سے معاملت نہیں؟ اس میں تو سب چھوٹے بڑے مبتلا ہیں۔اگر کہو انہیں سہولت کے لئے رکھ چھوڑا ہے تو اعلان کردو کہ ہمارے یہاں سہولت کے لئے حرام روا ہے۔اگر کہو کہ زمینداری و تجارت چھوڑیں تو کھائیں گے کیا؟ تو ملازم اگر ملازمتیں چھوڑ دیں تو کھائیں کیا؟ جو جواب تمہارا ہے وہ سب کا ہے(ص:۵۳۵، فتاویٰ رضویہ، جلد۱۴، مطبوعہ لاہور)

اور بفرضِ غلط و بفرض باطل اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں، تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جگری خیر خواہ جملہ ہنود بھی ایسا ہی کریں گے؟ اور تمہاری ہی طرح ننگے بھوکے رہ جائیں گے؟ حاشا ہر گز نہیں، زنہار نہیں اور جو دعویٰ کرے اس سے بڑھ کر کاذب نہیں، مکار نہیں۔

اتحاد دوداد کے جھوٹے ٹھگڑوں پر بھولے ہو، منافقانہ میل پر پھولے ہو، سچے ہو تو موازنہ دکھاؤ کہ اگر ایک مسلمان نے ترک کی ہو تو ادھر پچاس ہندوؤں نے نوکری، تجارت، زمینداری چھوڑ دی ہو۔ کہ یہاں مالی نسبت یہی یا اس سے بھی کم ہے۔اگر نہیں دکھا سکتے تو کھُل گیا کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔

لاجرم نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ تمام اموال، کل دولتیں، دنیاوی جمیع اعزاز، جملہ وجاہتیں صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ جائیں گی اور مسلمان دانے دانے کو محتاج، بھیک مانگیں اور نہ پائیں۔ہندو اَب انہیں پکائے جاتے ہیں جب بے خوف وخطر کچا ہی چبائیں۔

یہ ہے لیڈر صاحبوں کی خیر خواہی، یہ ہے حمایتِ اسلام میں جاں کاہی، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم۔(ص ۵۳۵، فتاویٰ رضویہ، ج ۱۴، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

قرآن عظیم گواہ ہے اور اس سے بہتر کون گواہ؟ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیلا اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی؟ کہ مشرکین ہماری خیر خواہی نہ کریں گے۔ خیر خواہی در کنار بدخواہی میں گئی (کمی) نہ کریں گے۔ پھر انہیں یار و انصار بنانا، ان سے وداو داتحاد منانا، ان کے میل سے نفع کی امید رکھنا، صراحۃً قرآن عظیم کی تکذیب ہے یا نہیں؟ ہے اور ضرور ہے، ولکن لاتبصرون۔ (مگر تمہیں نگاہ نہیں)

آو! اب ہم تمہیں قرآن عظیم کی تصدیق دکھائیں اور ان کی طرف سے اس میل اور میل کا راز بتائیں۔

دشمن اپنے دشمن کے لئے تین باتیں چاہتا ہے۔

اول: اس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو، دوم: اس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔ سوم: یہ بھی نہ ہو سکے تو! خیر درجہ اس کی بے پری کہ عاجز بن کر رہے۔

مخالف نے ان پر تینوں درجے طے کر دیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، خیر خواہی سمجھے جاتے ہیں۔

اولاً: جہاد کے اشارے ہوئے۔ اس کا کھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا ہونا تھا۔

ثانیاً: جب یہ نہ بنی، ہجرت کا بھرا دیا کہ کسی طرح یہ دفع ہوں، ملک ہماری کبڈیاں کھیلنے کو رہ جائے، یہ اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں یا یوں ہی چھوڑ جائیں، بہر حال ہمارے ہاتھ آئیں۔

ثالثاً: جب یہ بھی نہ نبھی تو ترکِ موالات کا جھوٹا حیلہ کر کے ترکِ معاملت پر ابھارا ہے کہ نوکریاں چھوڑ دو، کسی کونسل، کمیٹی میں داخل نہ ہو، مال گزاری، ٹیکس نہ دو، خطابات واپس کر دو۔

امرِ اخیر تو صرف اس لئے ہے کہ ظاہری نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی مسلمان کے لئے نہ رہے، اور پہلے تین اس لئے کہ ہر صیغہ، ہر محکمہ میں صرف ہنود رہ جائیں۔ جہاں ہنود کا غلبہ ہوتا ہے، حقوقِ اسلام پر جو گذرتی ہے، ظاہر ہے۔ (ص: ۵۳۶، فتاویٰ رضویہ، ج ۱۴، مطبوعہ لاہور)

اس تحریک کے دوران مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور، اسلامیہ کالج پشاور، مدرسہ عالیہ کلکتہ وغیرہ پر موالاتی لیڈروں نے تعلیمی بائیکاٹ کے لئے دھاوا بولا مگر ہندوؤں کی کوئی تعلیم گاہ ان موالاتیوں کی زد میں نہیں آئی۔ بلکہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں طلبہ و اساتذہ کو خطاب کرنے اور تعلیمی بائیکاٹ کے لئے گاندھی کو پنڈت مدن موہن مالویہ نے گھسنے بھی نہیں دیا۔ یہ بھی اس تحریک

ترکِ موالات کا ایک حیرت انگیز پہلو ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) اس تحریک کے نمایاں لیڈر تھے۔ ان کے عزائم بلند تھے۔ انھوں نے ''امام الھند'' بننے کے لئے ''مسئلۂ امامت'' بھی چھیڑا مگر علما نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور کسی معروف عالم نے ان کی تائید نہ کی۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر ان کے حریف اور ان کی راہ کے سنگِ گراں نہیں بلکہ کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ اس لئے کچھ دنوں بعد مولانا آزاد نے مسئلۂ امامت کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ (خلاصۂ مفہوم: ص: ۱۳۰۔ تحریک خلافت از محمد عدیل عباسی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ نئی دہلی)

بانیِ تحریک خلافت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۹۲۶ء) نے اسی سلسلے میں ۲۶؍شوال ۱۳۳۹ھ کو حضرت سید مہر علی چشتی گولڑوی سے ایک استفتا کیا۔ جس کے جواب میں آپ نے لکھا......... ''خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانے میں علما کی کارروائی نہ خلافت ہے نہ امامت۔ الخ

(ص: ۴۵۱۔ مہر منیر۔ مطبوعہ پاک و ہند)

تحریک ترک موالات ہی نے تحریک ہجرت کی طرف پیش قدمی کی اور خلافتی لیڈروں نے مسلمانانِ ہند کو ہندوستان سے ہجرت کرنے کا حکم دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں مسلمان افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے اور بدحال و پریشاں حال ہوکر ہندوستان واپس آئے تو مفلس و قلاش ہو چکے تھے۔

ایک استفتا بسلسلۂ ہجرت کا جواب دیتے ہوئے فقیہِ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

ہجرت دو قسم ہے، عامہ و خاصہ

عامہ یہ کہ تمام اہلِ وطن ترکِ وطن کر کے چلے جائیں اور خاصہ یہ کہ خاص اشخاص۔

پہلی ہجرت دار الحرب سے ہر مسلمان پر فرض ہے جس کا بیان آیۂ کریمہ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ ۔الآیۃ (وہ لوگ کہ جن کی جان فرشتے نکالتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے) میں ہے۔ اس سے صرف عورتیں اور بچے اور عاجز مرد جو نہیں نکل سکتے،

مستثنیٰ ہیں۔ جس کا ذکر اس سے متصل دوسری آیۂ کریمہ الا المستضعفین ۔الآیۃ میں ہے۔ باقی سب پر فرض ہے۔ جو باوصف قدرت دارالحرب میں سکونت رکھے اور ہجرت نہ کرے مستحق عذاب ہے۔

رہا دارالاسلام، اس سے ہجرتِ عامہ حرام ہے کہ اس میں مساجد کی ویرانی و بے حرمتی، قبورِ مسلمین کی بربادی، عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کی تباہی ہوگی۔

اور ہجرتِ خاصہ میں تین صورتیں ہیں:

اگر کوئی شخص کسی وجہ خاص سے کسی مقام خاص میں اپنے فرائض دینیہ بجانہ لا سکے اور دوسری جگہ ممکن ہو، تو اگر یہ خاص اسی مکان میں ہے، اس پر فرض ہے کہ یہ مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں چلا جائے، اور اگر اس محلہ میں معذور ہو تو دوسرے محلہ میں اٹھ جائے، اور اس شہر میں مجبور ہو تو دوسرے شہر میں۔ وعلیٰ ھذا القیاس. کما بینہ فی مدارکِ التنزیل واستشھد بحدیث ۔ (جیسا کہ مدارک التنزیل میں اس کی تفصیل ہے اور اس پر ایک حدیث سے استشہاد کیا ہے)

دوسری وہ کہ یہاں اپنے فرائض مذہبی بجالانے سے عاجز نہیں اور اس کے ضعیف ماں یا باپ یا بیوی یا بچے جن کا نفقہ اس پر فرض ہے، وہ نہ جا سکیں گے یا نہ جائیں گے اور اس کے چلے جانے سے بے وسیلہ رہ جائیں گے تو اس کو دارالاسلام سے ہجرت کرنا حرام ہے،۔ حدیث میں ہے: کفیٰ بالمرء اثما ان یضیع من یقوت، کسی آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کردے جس کا نفقہ اس کے ذمہ تھا۔

یا وہ عالم جس سے بڑھ کر اس شہر میں عالم نہ ہو اسے بھی حرام ہے۔ وقد نص فی البزازو الدر المختار انہ لایجوز لہ السفر الطویل منہا فضلاً عن المہاجرۃ ۔ (بزازیہ اور درمختار میں تصریح ہے کہ ایسے آدمی کے لئے طویل سفر جائز نہیں، چہ جائے کہ وہ وہاں سے ہجرت کر جائے)۔

تیسری وہ کہ نہ وہ فرائض سے عاجز ہے نہ یہاں اس کی حاجت۔ اسے اختیار ہے کہ رہے یا

چلا جائے، جو اس کی مصلحت ہو۔ یہ تفصیل دار الاسلام میں ہے۔

اب آپ اپنی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کو ہجرت جائز یا واجب یا حرام ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ص ۱۳۱ و ۱۳۲، فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴۔ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

اس وقت کے ایک مشہور سیاسی لیڈر ظفر حسن ایبک شاگردِ مولانا عبید اللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) شاگردِ مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) اثرات و نتائج ہجرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے۔ افغانستان پر مالی بوجھ پڑا۔ ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ اگر کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ صرف انگریز تھے۔ (آپ بیتی حصہ اول از ظفر حسن ایبک۔ مطبوعہ لاہور)

اس موقعہ پر مسلمانوں کی زمین جائداد ہندوؤں نے خریدی اور ہزاروں مسلمان بے گھر بے در ہوئے۔ چنانچہ رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں:

''خریدنے والے زیادہ تر ہندو ہی تھے۔ ہزاروں مسلمان افغانستان ہجرت کر گئے۔ وہاں جگہ نہ ملی واپس کیسے گئے۔ کچھ مر کھپ گئے۔ جو واپس آئے تباہ حال، خستہ، درماندہ، مفلس، قلاش، تہی دست، بے نوا، بے یار و مددگار۔ اگر اسے ہلاکت نہیں کہتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟ (ص: ۱۰۸۔ حیاتِ محمد علی جناح از رئیس احمد جعفری ندوی، مطبوعہ تاج آفس ممبئی)

آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند جسے موالاتی لیڈروں نے دعوت دے کر جامع مسجد دہلی میں تقریر کرائی تھی، اس نے ۱۹۲۳ء میں علاقہ آگرہ وراجپوتانہ میں شدھی سنگٹھن کو متحرک کر کے ''ہندو مسلم اتحاد'' کی قلعی کھول دی اور لاکھوں مسلمانوں کو مرتد بنا دیا۔ ادھر ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۲ء میں سلطان ترکی کی معزولی اور ۱۹۲۴ء میں ترکی پارلیمنٹ میں خاتمۂ خلافت کا باضابطہ اعلان کر کے تحریک خلافت کو بے جان کر دیا۔ ساتھ ہی ۱۹۲۴ء ہی میں بیلگام کرناٹک میں گاندھی نے ترکِ موالات کی تحریک جو ۱۹۲۲ء میں ہی تقریباً مردہ ہو چکی تھی، اس کے خاتمہ کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ اس طرح وہ تحریک جسے خلافتی و موالاتی لیدر مذہبی بنیاد پر چلا رہے تھے وہ بالکل جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

حیرت انگیز اتفاق یہ ہے کہ بیلگام کرناٹک میں ۲۴/ دسمبر ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی صدارت میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۴ء کو اسی جگہ گاندھی کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اور

"بیلگام میں کانگریس ہی کے پنڈال میں ۲۷/ دسمبر ۱۹۲۴ء کو ہندو مہاسبھا کا اجلاس ہوا جس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالویہ نے کی۔ اس میں کانگریس کے لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ مالویہ جی نے دعویٰ کیا کہ ہندو مہاسبھا کوئی فرقہ وارانہ جماعت نہیں۔ بیلگام میں آخرکار گاندھی جی نے سپر ڈال دی اور گاندھی، نہرو، سی آر داس معاہدہ تیار ہوا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ کونسلوں کا داخلہ منظور کیا جائے اور چرخہ کاتنا ممبری کے لئے ضروری قرار دیا جائے۔ گاندھی جی نے ترکِ موالات کو خیرباد کہا اور اپنے آشرم واپس چلے گئے۔ (ص: ۲۵۳۔ تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی۔ قومی کونسل، برائے فروغ اردو، نئی دہلی)

"مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تو ان کو "باپو" کہتے تھے اور کراچی کے مقدمہ میں سزا پانے کے بعد جب وہ راہ میں تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ تحریک کا کیا حال ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ میں تو جیل میں ہوں البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ رسول کے بعد میرے اوپر مہاتما گاندھی کا حکم نافذ ہے۔

مولانا آزاد سبحانی گاندھی کے آشرم میں چلے گئے تھے اور ایک لباس پہن لیا تھا جو صرف گھٹنا اور کہنی بند تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد قولاً و عملاً گاندھی جی کے ہمنوا تھے۔ (ص: ۸۰۔ تحریک خلافت از عدیل عباسی، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی)

خلافت فنڈ کا جو حشر ہوا اس کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے دستِ راست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ندوی لکھتے ہیں:

"ایک قلیل رقم ترکوں تک پہنچی، باقی روپے کو مردے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اس زمانے میں خود میں اپنی آنکھ سے دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بے دردی سے قومی روپے اپنی ذات پر اڑا رہے ہیں۔ (ص: ۳۸۸۔ ذکر آزاد۔ مطبوعہ دہلی)

خود مولانا محمد علی جوہر نے ۲۵/دسمبر ۱۹۲۷ء کے پشاور اجلاس میں جو انکشاف کیا وہ چشمِ عبرت سے پڑھنے لائق ہے:

''ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما گاندھی نے دورے کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے لیے۔ حتیٰ کہ کانگریس کے لئے ایک کروڑ روپے جمع کرنے کے لئے آپ کے دورانِ سفر کے مصارف بھی خلافت نے ادا کیے۔'' (ص:۱۰۵۔ حیات محمد علی جناح از رئیس احمد جعفری ندوی۔ مطبوعہ ممبئی)

مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی کا دورانِ تحریک خلافت و ترک موالات ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ تنہا یا وفد کے ساتھ بعض مشاہیر علماے ہند سے ملاقات کر کے انھیں اپنا ہم خیال و ہم نوا بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک وفد کے ہمراہ ایک بار گاندھی مونگیر بہار پہنچے اور مولانا محمد علی مونگیری (وفات ربیع الاول ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) سے ملاقات کی۔ گاندھی نے اپنے مطالعۂ سیرت کا حوالہ دے کر قرآن حکیم اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعریف و توصیف کی۔

''مولانا مونگیری، گاندھی جی کی ان باتوں کو خاموشی سے سنتے رہے۔ اور جب گاندھی جی اپنی بات کہہ چکے تو مولانا نے پوچھا:

مجھے تو آپ اسلام کی وہ بات بتایئے جو آپ کو پسند نہیں آئی؟ اور آں حضرت ﷺ کے اس پہلو سے آگاہ کیجیے جسے آپ نے اچھا نہیں سمجھا؟

گاندھی جی اس سوال کے لئے تیار نہیں تھے۔ کچھ چونکے اور فوراً بولے: ایسا تو کوئی پہلو میری نظر میں نہیں آیا۔

اس پر مولانا مونگیری نے سوال کیا۔ تو پھر آپ نے ابھی تک اسلام کیوں قبول نہیں کیا؟ گاندھی جی کے پاس جواب نہیں تھا۔ مولانا خفا ہو گئے۔ اور فرمایا کہ آپ نے جو کچھ کہا غلط ہے۔ آپ ہمیں صرف پھانسنا چاہتے ہیں۔ صیاد بھی پرندوں کو پکڑنے کے لئے انھیں کی بولیاں بولتا ہے۔

(مسٹر احسان بی اے کی آپ بیتی۔ بحوالہ ص: ۲۷۳ مہر منیر مطبوعہ پاک و ہند)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے تلمیذ و خلیفہ اور سوانح نگار مولانا محمد ظفر الدین قادری

رضوی (وصال ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) سابق پرنسپل شمس الہدیٰ پٹنہ لکھتے ہیں:

اس سلسلے میں مسٹر گاندھی مشاہیر علما و مشائخ سے جا کر ملتے اور سب کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ خانقاہِ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ پہنچے اور جناب سجادہ نشین مولانا شاہ بدر الدین صاحب سے خلوت میں دیر تک گفتگو کی، اور اس کی شہرت تمام اخباروں میں دھوم دھامی طریقے پر ہوئی۔

''اسی زمانہ میں مسٹر گاندھی بریلی شریف پہنچے اور اعلیٰ حضرت (امام احمد رضا بریلوی) سے ملنے کے متمنی ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے قبول نہ فرمایا اور انکار فرما دیا۔ یہاں تک کہ بعض حضراتِ اہل سنت مخلصینِ اعلیٰ حضرت نے بھی سفارش کی اور اسی کو قرینِ مصلحت سمجھا کہ اعلیٰ حضرت ان کی اِستدعا کو رد نہ فرمائیں اور ملاقات کا تھوڑا سا وقت مسٹر گاندھی کو دے دیں۔

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ: وہ مجھ سے دینی امور میں گفتگو کریں گے یا دنیوی بہبود کے متعلق؟ دینی امور میں گفتگو کر نہیں سکتے کہ وہ ہمارے دین سے واقف نہیں۔ رہا دنیوی بہبود کے متعلق تو جب میں نے اپنی دنیوی بہبود کی طرف توجہ نہ کی تو دوسروں کی دنیا سنوارنے کی فکر میں کس طرح اپنا وقت ضایع کر سکتا ہوں؟

آپ حضرات جانتے ہیں کہ خداوندِ عالم کی دی ہوئی نعمت ترکۂ آبائی سے میری کافی معیشت ہے مگر میں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ (بھائی) حسن میاں رحمۃ اللہ علیہ انتظام کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد (بھائی محمد رضا خاں) ننھے میاں سلّمہٗ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ (ص: ۴۳۴۔ حیات اعلیٰ حضرت (سال تصنیف ۱۹۳۸ء) مطبوعہ مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور۔ ۲۰۰۳ء)

مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی کی امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی سے ملاقات و گفتگو کا ایک اہم واقعہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

''تحریکِ آزادی کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی آپ کی خدمت میں بریلی حاضر ہوئے اور عرض کی کہ: آپ ایک وسیع حلقے کے روحانی پیشوا ہیں۔ آپ تحریکِ آزادیِ ہند

کے سلسلے میں کانگریس کا ساتھ دیں تو آپ کی شخصیت حالات پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ: مولانا! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں اور میں مخالف ہوں۔

علی برادران باہر جب جا چکے تو مولانا محمد علی جوہؔر مولانا شوکت علی سے کہنے لگے کہ: مولانا احمد رضا خشک ہیں۔

آپ صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ فوراً کشف سے ان کے احوال پر مطلع ہوئے اور مولانا محمد علی جوہؔر کو بلایا اور کہا کہ: مولانا! میں خشک نہیں ہوں۔ ملک آزاد کرانا ہے تو مسلمانوں کی اپنی علیحدہ تنظیم بنائیں اور ہندوؤں سے بالکل علیحدہ ہو جائیں۔

مولانا جوہؔر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دست بوسی کی اور حضرت کے موقف سے آگاہ ہوئے۔ (ص:۲۔ روزنامہ کوہستان لاہور وملتان۔ شمارہ، ۸/ مئی ۱۹۶۹ء)

یہ "ہندو مسلم اتحاد" جس نے مسلمانانِ ہند کے زُعما اور ان کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد کو مذہبی وملّی غیرت وحمیت سے بے گانہ اور بے نیاز کر دیا تھا اس اتحاد کی کوئی شرعاً کوئی گنجائش نہیں اور اسی ہندو مسلم اتحاد کی علمائے اہل سنت نے مخالفت کی اور بجا مخالفت کی۔ اگر صرف ملکی مفادات کے تحفظ کے لئے اپنے تشخص وشناخت کے ساتھ محتاط کوشش ہوتی تو اس کی بات جُدا تھی۔ چنانچہ اس مسئلہ پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے حضرت سید سلیمان اشرف سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ کالج علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) اپنے رسالہ الرشاد (مطبوعہ مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ/۲۱-۱۹۲۰ء) میں رقم طراز ہیں:

"شریعتِ مطہرہ ہر حال میں ہم سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہے، اور یہی وہ خصوصیتِ حیاتِ مسلم ہے جس میں کسی دوسری قوم کا حصہ نہیں، اسی نکتہ کو سابقاً عرضِ خدمت کر چکا ہوں۔

مسلم کا اضطرار بھی للہ رب العلمین کے محور سے نہیں ہٹتا۔ اس کی بے چینی، اس کی بے قراری سب اللہ ہی کے لئے ہے، اور اسی کی طرف ہے۔ برادرانِ اسلام! کیا اس موجودہ ہنگامۂ اضطرار میں آپ اوس مرکزِ خصوصی سے متجاوز نہیں ہو گئے، ؟ کیا اس بے چینی میں آپ نے اہلِ ہنود کا اس طرح

دامن نہیں پکڑا جس سے آپ کا مذہب آپ سے فریادی ہو گیا؟

کیا اس اتحاد و اتفاق میں وہ اصولِ حکیمانہ جس سے اتحاد کی جڑ فی الحقیقت مضبوط ہو جاتی آپ سے نظر انداز نہیں ہو گیا؟

آپ کو اختیار ہے کہ ان سوالوں کا جواب ایجاب میں دیں یا سلب میں لیکن اصل جواب تو وہی ہے جس پر واقعات وحقائق شاہد ہوں۔ ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ سے فقیر کی گزارش سنیے۔

اتحاد و اتفاق یا عناد و اختلاف کی دو قسمیں ہیں: ایک عرضی اور دوسرے ذاتی۔ یعنی ایک شی جب دوسری شی کے مخالف تو اس کی علت یا کوئی امرِ خارجی ہو گا یا ذاتی۔

اب جس جگہ دونوں کی حقیقت اور قوامِ ذات میں اتفاق ہو اور پھر دونوں میں اختلاف پایا جائے تو منشائے اختلاف کوئی ایسا امر ہو گا جو حقیقتِ ذات سے خارج ہے اور اسے عارض ہے اسی کو اختلاف عرضی کہتے ہیں۔ ایسے دو مختلف موجود میں اتفاق کی صورت یہ ہے کہ وہ امرِ خارج جو اوسے عارض ہے، زائل ہو جائے یا زائل کر دیا جائے۔ جوں ہی امرِ خارج کا اندفاع ہو گا، ذاتی اتفاق ایک کو دوسرے سے متحد بنا لے گا۔

لیکن اگر دو چیزوں میں اختلاف باعتبار ذات اور قوام حقیقت پایا جاتا ہے تو جب تک ان دونوں کی ذات قائم ہے، اوس اختلاف کا مٹنا ناممکن ہے۔ دو متغائرُ فی الذات کبھی اپنی حقیقت اور لوازم میں متحد نہیں ہو سکتے۔ تضاد و تغائر ذاتی کا یہی اقتضا ہے۔

ہاں! ان دونوں کا اتحاد اگر ہو گا بھی تو منشا اس کی ذات نہ ہو گی بلکہ کوئی امر خارج از ذات ہو گا۔ جب تک وہ امر خارج ان دونوں میں موجود ہے دونوں متفق و متحد ہیں اور جہاں وہ خارج زائل ہوا یا زائل کیا گیا، پھر ذات اپنی مقتضیات ولوازم کی طرف رجوع کر جائے گی۔ غرض اختلاف عرضی میں اس خارج کا اور عارض کا زوال اتفاق کا موجب ہے، اور اختلاف ذاتی میں اس امر خارج اور عارض کا بقا اتفاق کا موجب ہے، الخ (ص: ۵و۶، الرشاد، مؤلفہ مولانا سید سلیمان اشرف، مطبوعہ مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ۔ ۱۳۳۹ھ/۲۱۔۱۹۲۰ء))

مسٹر گاندھی کے ایما پر شروع ہونے والی تحریک ترک موالات کے قوم پرست ہندو مسلم زعماء اور

تحریک خلافت کے داعی عُلماء مسلمانانِ ہند کے مذہبی جذبات مشتعل کرنے کی حکمت عملی میں کامیاب ہونے اور اپنی بے بصیرتی سے گاندھی کو زمامِ قیادت سپرد کرنے کے بعد سرزمین ہند پہ قابض و حاکم انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئے اور پھر زور وشور کے ساتھ تحریکِ آزادیِ ہند شروع ہوگئی کیوں کہ ان کے خیال و پروگرام کے مطابق دونوں تحریکوں (خلافت وترک موالات) کی مشترکہ اساس ہی ''انگریز دشمنی'' تھی اور اپنے نشانے تک پہنچنے کے لئے آیاتِ قرآن واحادیثِ رسول واحکام فقہ کا جس طرح سیاسی استعمال ہوا اور ہندو مسلم اتحاد کے نام پر جس طرح شعائرِ اسلام و مسلمین کی توہین ہوئی وہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا ایک سیاہ اور شرمناک باب ہے۔

دینی فکر وبصیرت رکھنے والے عُلمائے کرام سمجھ رہے تھے کہ سیاسی وجوہ سے انگریزوں کے خلاف چلائی جانے والی تحریک عدمِ اشتراکِ عمل تو ملک وملت کے لئے نفع بخش اور نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔اور تمام مسلمانوں کو اس میں بیش از بیش حصہ لے کر ان سفید فام حاکموں سے ملک کو آزاد کرایا جاسکتا ہے۔اور کرایا جانا چاہیے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اہلِ وطن کی اکثریت کے ساتھ یہ اتحاد خدانہ کردہ اِدغام و اِنضمام کی صورت اختیار کر لے اور اس کا بھی امکان ہے کہ اگر تحریک میں شامل عُلما و مسلم قائدین کی ہندونوازی اور ان کی اطاعت گذاری کا یہی جذبہ اور ماحول برقرار رہا تو انگریزوں سے انتقالِ اقتدار کے وقت مسلمان منہ دیکھتے رہ جائیں گے اور سب کچھ ہندو لیڈر اُڑا لے جائیں گے۔ اس لئے مسلم شناخت اور مسلم مفاد کا تحفظ ہر لمحہ ضروری ہے اور اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مسلمان اول و آخر مسلمان اور صرف مسلمان ہے اس کے ساتھ یا اس کے بعد پھر کچھ اور ہے۔اور اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان بیک وقت مسلمان اور ہندی یا چینی یا ایرانی یا عربی ہے۔

لیکن یہاں رنگ کچھ اور ہی تھا۔مولانا عبدالباری فرنگی محلی ۔مولانا حسرت موہانی ۔مولانا محمد علی جوہر۔مولانا شوکت علی۔حکیم اجمل خان۔ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔مولانا حسین احمد مدنی ،مفتی کفایت اللہ دہلوی ،مولانا ظفر علی خان وغیرہم سب اسی دھارے میں بہے جارہے تھے جس کی طرف گاندھی کا اشارہ ہوتا تھا۔افراط وتفریط کا عجب عالم تھا۔مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی جنوری ۱۹۲۶ء) ان عُلما اور لیڈروں کے قائد تھے۔جن کا حال یہ ہوگیا تھا کہ

اپنے ایک مشہور و مطبوع خط میں لکھتے ہیں:
''فقیر نان کوآپریشن کے مسئلہ میں بالکل پس رَو گاندھی کا ہے۔ کیوں کہ اس طریق کار کا واقف نہیں ہے۔ ان کو اپنا رہنما بنالیا ہے۔ جو وہ کہتے ہیں وہی مانتا ہوں۔ میرا حال تو سرِ دست اس شعر کے موافق ہے۔

عمرے کہ بآیات واحادیث گذشت
رفتی و نثارِ بت پرستی کردی''

تحریک خلافت و ترک موالات کے بیشتر علُما اور تقریباً سبھی قائدین نے مسلمانانِ ہند کو جذباتی سیلاب میں بہایا اور شرعی حدود کو تجاوز کیا۔ اس وقت اس طرح کے فتاویٰ جاری ہو رہے تھے کہ ان کے حامی و ہم نوا مسلمان ہندو مسلم اتحاد کی رو میں بہتے گئے اور لیڈرانِ قوم ان کا استحصال کرتے چلے گئے۔ اس پوری تحریک کی قیادت گاندھی نے کی اور دو تین سال کے اندر ہی ۱۹۲۲ء میں گاندھی کی حکمتِ عملی جب تبدیل ہوئی اور ۱۹۲۴ء میں انھوں نے نان کوآپریشن موومنٹ/تحریک عدم تعاون ختم کرنے کا باضابطہ اعلان کیا تو پھر علُما و زُعمائے خلافت و ترک موالات کے مذہبی فتاویٰ بھی سرد خانے کی امانت بن گئے۔

اجتناب از نقضِ امن و اتباعِ شریعت کی شرط کے ساتھ (شیخ الھند) مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) نے ۳/ذوالقعدہ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء میں یہ فتویٰ جاری کیا:

''اعدائے اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً اور عملاً ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابلِ انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہ ہی اقتضاء ہونا چاہیے کہ وہ:

(۱) سرکاری اِعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے (۳) صرف اپنی ملکی اشیا اور مصنوعات کا استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔ (ص:۳۱۶۔ حصہ دوم نقش حیات از

مولانا حسین احمد مدنی۔مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

یہی فتویٰ جمعیۃ علماء ہند کے متفقہ فتویٰ کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شایع کیا گیا۔(ص:۳۱۷۔حصہ دوم نقش حیات)

مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:

''ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی رائے قبولیتِ عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترکِ موالات کے متعلق طلبائے یونیورسٹی (علی گڑھ) نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلبائے مسلم یونیورسٹی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔

گورنمنٹ سے قطعِ تعلق کر لیں اور تمام کالج اور اسکول کی گورنمنٹی امداد چھوڑ دیں۔ اور اگر کالجوں اور اسکولوں کے زعماء ایڈ نہ چھوڑیں تو طلبہ ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل جائیں۔ نیز ملازمانِ حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ (ص:۳۱۴۔حصہ دوم۔نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی)

۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے تاسیسی اجلاس منعقدہ دہلی کا خطبہ صدارت مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) کی جانب سے انھیں کے حکم پر مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی نے لکھا اور چھپوایا جسے مولانا شبیر احمد عثانی دیوبندی نے اجلاس میں پڑھ کر سنایا۔ علمائے حق از مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیۃ العلما کے حوالہ سے مولانا حسین احمد مدنی اسی خطبہ صدارت از مولانا محمود حسن دیوبندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ کا خطبہ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا مگر علمائے ملت اور ملی سیاست کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا۔

حضرت شیخ الھند کے اس خطبہ صدارت نے علمائے ملت کو مندرجہ ذیل اصول ونظریات کی ہدایت فرمائی۔

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترکِ موالات فرض ہے۔

(۲) تحفظِ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن ہم دردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحقِ شکریہ ہیں۔

(۳) استخلاصِ وطن کے لئے برادرانِ وطن سے اشتراکِ عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

(۴) اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعتِ اعداء کے لئے جائز ہوسکتا ہے باوجودیکہ قرونِ اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی تأمل نہ ہوگا۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں ہیں، یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔

(صفحہ ۱۶۔ خطبۂ صدارت۔ مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

حضرت شیخ الھند کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی اس کے چند جملے بلفظہٖ درج ذیل ہیں:

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ جلّ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول کے لئے مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتحاد و اتفاق کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہیں اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حال اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دے گی۔ (ص: ۳۲۲ حصہ دوم، نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

تحریک خلافت و ترکِ موالات و ہجرت کے اثرات و نتائج کے بارے میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"جنگ کے بعد جب ۱۹۱۹ء کے وسط میں خلافت کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی اور نومبر میں

اس کا عام اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو ہندوستانی مسلم قیادت نے بڑی سمجھداری سے اس کا صدر مہاتما گاندھی کو بنادیا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف جدوجہد میں مسلمانوں نے پورے خلوص سے اور موثر طور پر حصہ لیا تھا اور عدم تعاون کی تحریک میں دل وجان سے شامل ہوکر دونوں ملتوں نے اتحاد کے رشتے مضبوط کیے تھے۔ (ص ۶۲۳۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ نئی دہلی ۱۹۹۸ء)

''قوم پرور علماء نے جمعیۃ العلماے ہند قائم کی اور اس تنظیم کا پہلا پبلک اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں منعقد ہوا............اس کے بعد کے سال میں ایک ایسی تباہ کن غلطی ہوئی جس نے بتادیا کہ بے روک ٹوک مذہبی جوش وخروش کہاں لے جاسکتا ہے؟ یہ خیال پیش کیا گیا کہ اگر انگریزوں نے ترکی کے سلطان کے ساتھ جو خلیفہ بھی تھا انصاف نہ کیا تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ہجرت کر کے قریب ترین دارالامن یعنی افغانستان چلے جائیں۔ اس ہوش رُبا تجویز کو تسلیم کرلیا گیا اور مولانا عبدالباری نے ہجرت کی حمایت میں فتویٰ جاری کردیا۔

کوئی اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے ہجرت کا فیصلہ کر کے اپنی ساری جمع پونجی فروخت کرڈالی۔ ابھی اور لوگ بھی ہجرت کے لئے کمر باندھ رہے تھے کہ افغانستان حکومت نے مہاجرین کے داخلے پر پابندی عاید کردی۔ اٹھارہ ہزار خاندان تو گویا بالکل تباہ ہوگئے۔ جو لوگ یہ مصائب جھیل کر اپنے گھروں کو واپس آنے میں کامیاب ہوگئے ان کی تکلیفیں کم کرنے کے لئے خلافتیوں نے حتی الوسع کوشش کی لیکن یہ واقعہ یہ سبق نہ دے پایا کہ مذہبی ولولے کو سنجیدہ سوچ کی بھٹی میں تپانا ضروری ہوتا ہے۔ (ص ۵۷۳۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب)

''عدم تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء میں واپس لی گئی۔ اس سے کتنی بدظنی پھیلی اور انتشار پیدا ہوا اس کا اندازہ فسادات کی اس تعداد سے ہوسکتا ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں پھوٹ پڑے۔ ۱۹۲۳ء میں گیارہ۔ ۱۹۲۴ء میں آٹھ۔ ۱۹۲۵ء میں سولہ۔ ۱۹۲۶ء میں ۳۵۔ (ص ۶۲۶۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب)

''عدم تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء میں واپس لی گئی تو ان سب کو اس سے زبردست صدمہ پہنچا جو اس میں شریک تھے۔ مسلمانوں کے لئے خاص طور پر یہ بات بہت تباہ کن ثابت ہوئی۔ انھوں نے مذہبی بنیاد پر غیر مشروط فیصلے کیے تھے اور ان کی طرف سے رہنماؤں نے تحریک کی واپسی کے جو اعلان کیے ان میں کوئی مذہبی وجوہ نہیں تھے۔ (ص: ۶۲۴۔ ہندوستانی مسلمان)

''ایک دور ایسا تھا جب اسٹیج پر مولانا محمد علی چھائے ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں وہ مہاتما گاندھی کے اتنے قریب تھے جتنے اور کوئی سیاسی رہنما کسی وقت ہو سکتے تھے۔ لیکن جب ۱۹۲۳ء میں وہ جیل سے باہر آئے اور ملک کی صورتِ حال کا مطالعہ کیا تو انھیں مجبوراً مہاتما گاندھی کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ انھوں نے ہندوؤں کی جارحیت اور لڑاکا پن کے خلاف مسلمانوں کے غم وغصہ کی نمائندگی شروع کر دی۔ (ص ۶۲۷۔ ہندوستانی مسلمان)

''۱۹۲۳ء کے بعد جب مولانا محمد علی مہاتما گاندھی سے دور ہونے لگے تو صرف ایک ملت کے ایسے لیڈر ہو کر رہ گئے جن کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کل کیا کریں گے؟ اور جو ہر قسم کے اختلافی معاملے میں شامل ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان کی قوتِ عمل برقرار تھی لیکن اب بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ (ص ۷۷۵۔ ہندوستانی مسلمان)

''برطانوی حکومت پر براہِ راست عمل کے ذریعہ دباؤ ڈالنے کی غرض سے مہاتما گاندھی نے مارچ ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ شروع کی۔ یہ اس بات کا فیصلہ تھا کہ سب سے پہلی شرط ہے آزادی کا حصول۔ دوسرے مسائل آزادی کے بعد ہی حل ہو سکیں گے۔

چنانچہ سوال یہ اٹھا کہ کیا مستقبل میں اپنے مقام اور حقوق کی ضمانت حاصل کیے بغیر مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیں؟ اس میں کتنوں نے حصہ نہیں لیا اس پر اختلاف ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شرکت خاصی تعداد میں ہوئی۔

اپریل ۱۹۳۰ء میں بمبئی میں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس ہوئی اس میں مولانا محمد علی نے اعلان کیا

کہ مسلمان برطانوی غلبہ نہیں چاہتے لیکن وہ ہندو غلبہ بھی نہیں چاہتے۔ اور وہ مسٹر گاندھی کی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے کیوں کہ اس تحریک کا مقصد ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو مہا سبھا کا غلام بنانا ہے۔

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہی محسوس کرتی تھی اس لئے انھوں نے مولانا محمد علی کی خوب خوب تعریف کی کہ انھوں نے ان جذبات کو پوری وضاحت اور شدومد کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔ لیکن انصاف کا تقاضہ یہ کہنے پر مجبور بھی کرتا ہے کہ دوسری طرف ایسے رجعت پسند ہندو بھی تھے جو قومی اِحیا کا مطلب ہی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو دبایا جائے۔ (ص ۶۲۸۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب۔ قومی کونسل، برائے فروغِ اردو نئی دہلی)

مولانا نذیر احمد خجندی میرٹھی کے استفتا محررہ محرم الحرام ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء مرسلہ از ممبئی کے جواب میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

ہر سلطنتِ اسلام نہ صرف سلطنت ہر جماعتِ اسلام نہ صرف جماعت ہر فردِ اسلام کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم : اَلدینُ النُصحُ لِکلِ، مسلم۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! دین اسلام ہر مسلمان کی خیر خواہی کا نام ہے۔

مگر ہر تکلیف بقدرِ استطاعت اور ہر فرض بقدرِ قدرت ہے۔ نامقدور بات پر مسلمان کو ابھارنا جو نہ ہو سکے اور ضرر دے اور اسے فرض ٹھہرانا شریعت پر افترا اور مسلمانوں کی بدخواہی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: لایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفسًا اِلَّا وُسعَھَا.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر۔

و قال اللہ تعالیٰ: فَاتَّقوا اللّٰہ مَا استَطَعتُم.

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔

پھر خیر خواہی اسلام حدودِ اسلام میں رہ کر ہے۔ مشرکین سے اتحاد و موالات اور ان کے راضی

کرنے کو شعائرِ اسلام کی بندش، مشرک لیڈروں کو اپنے دین کا ہادی و رہبر بنانا، مشرک لیکچرر کو مسلمانوں کا واعظ ٹھہرانا، اسے مسجد میں لے جا کر جماعتِ مسلمین سے اونچا کھڑا کر کے لیکچر دلوانا، اپنے ماتھے پر مشرکوں سے قشقے لگوانا، مشرکوں کے مجمع میں مشرک لیڈروں کی جے پکارنا، مشرک لیڈروں کی ٹِکٹی اپنے کندھوں پر اٹھا کر مَرگھٹ میں لے جانا، مساجد کو مشرک کا ماتم گاہ بنانا، اس کے ماتم کے لئے مساجد میں سر برہنہ ہونا، اس کے لئے نماز و دعائے مغفرت کا اشتہار دینا، قرآنِ مجید اور رامائن کو ایک ڈولے میں رکھ کر دونوں کی پوجا کراتے ہوئے مندر میں لے جانا،......

صاف لکھ دینا کہ ہم نے قرآن وحدیث کی تمام عمر بت پرستی پر نثار کردی، صاف لکھ دینا کہ اگر آج تم نے ہندو بھائیوں کو راضی کرلیا تو اپنے خدا کو راضی کرلیا۔ صاف لکھ دینا کہ ہماری جماعت ایک ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہے جو کفر و اسلام کا امتیاز اٹھادے گا۔ صاف لکھ دینا کہ ہم ایسا مذہب بنانا چاہتے ہیں جو سنگم و پریاگ کو مقدس مقام ٹھہرائے گا۔

یہ امور خیر خواہیِ اسلام نہیں کُند چھری سے اسلام کو ذبح کرنا ہے۔ یہ سب افعال واقوال ضلالِ بعید و کفرِ شدید ہیں اور ان کے فاعل و قائل و قابل اعدائے دین حمید و دشمنانِ رب مجید ہیں۔

اِتَّخذوا دینَهم لهواً و لعباً — بَدَّلُوا نعمةَ اللّٰه کفراً — وَسَیَعلمُ الذینَ ظَلَمُوا اَیَّ مُنْقَلبٍ یَنْقَلِبُون.

جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنالیا — اللہ کی نعمت ناشکری سے بدل دی — اور اب جاننا چاہتے ہیں ظالم کہ کس کروٹ پر پلٹا کھائیں گے۔

(ص: ۱۳۳۔۱۳۴۔ جلد ۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

''جو شخص حفاظتِ اسلام وسلطنتِ اسلام واماکنِ مقدسہ کی استطاعت رکھتا ہے اور کاہلی سے نہ کرے مرتکب کبیرہ ہے یا کفار کی خوشامد وخوشنودی کے لئے تو مستوجبِ لعنت ہے یا دل سے ضررِ اسلام پسند کرنے کے سبب تو کافر ہے۔ اور جو استطاعت نہیں رکھتا معذور ہے۔ شریعت اس کام کا حکم

فرماتی ہے جو شرعاً جائز اور عادۃً ممکن اور عقلاً مفید ہو۔ حرام یا ناممکن یا عبث افعال حکم شرع نہیں ہو سکتے۔ (ص:۴۱۶۔ جلد۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم مطبوعہ لاہور)

مولانا ابوالکلام آزاد نے طلبہ یونین علی گڑھ کو خطاب کرتے ہوئے طلبہ کو کچھ ہدایت کی۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے غور سے پڑھیں اور سمجھیں۔

''دوسرے دن پھر اجتماع ہوا تو لڑکوں نے کہا کہ ہم آپ ہی کو ہندوستان کا سب سے بڑا مجتہد اور عالم سمجھتے ہیں۔ تب مولانا نے کہا کہ جب مجھ کو تم لوگ مجاز سمجھتے ہو اور مجھ سے سوال کرتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ:

حکومت سے عدم تعاون اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام فرض ہیں۔ اور میں تم کو پکارتا ہوں کہ کالج کی چہار دیواری سے باہر نکلو اور کالج کی تعلیم کا بائیکاٹ کرو۔ (ص:۱۷۰۔ تحریک خلافت۔ از قاضی محمد عدیل عباسی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ طبعِ دوم ۱۹۹۷ء)

''حکومت سے ترکِ موالات اس طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام فرض ہیں۔ (ص:۱۶۴۔ تبرکاتِ آزاد۔ از غلام رسول مہر۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء)

احمد سعید ملیح آبادی ایڈیٹر روزنامہ آزاد ہند، کلکتہ لکھتے ہیں:

''مدرسہ اسلامیہ کا افتتاح مسجد ناخدا (کلکتہ) میں مہاتما گاندھی نے ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء میں کیا۔ اس وقت مولانا (عبدالرزاق) ملیح آبادی اور مولانا (حسین احمد) مدنی میں ایسا رشتۂ رفاقت واخوت قائم ہوا کہ مرتے دم تک باقی رہا۔'' (ص۵۔ بعنوان اکابر کی روایتوں کا امین۔ فدائے ملت نمبر، روزنامہ ہندوستان اکسپریس، دریا گنج، نئی دہلی۔ شمارہ ۲۳ر اپریل ۲۰۰۷ء)

حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی سے ۱۹۲۰ء میں اسی سلسلے میں دو سوالات استفتا کی شکل میں کیے گئے جس کا تفصیلی جواب آپ نے کتابی صورت میں دیا اور احکامِ موالات ومعاملات کو محققانہ طور پر تحریر فرما کر " المحجۃُ المؤتمنہ فی آیۃِ الممتحنۃ (۱۳۳۹ھ/

۱۹۲۰ء) تاریخی نام رکھا۔ جس میں اس افراط وتفریط کے بارے میں آپ لکھتے ہیں:

"غرض ترکِ موالات میں افراط کی تو وہ کہ مجرد معاملت حرامِ قطعی۔ اور تفریط کی تو یہ کہ ہندوؤں سے وَداد واتحاد واجب بلکہ ان کی غلامی وانقیاد فرض بلکہ مدارِ ایمان۔ فسبحٰن مقلب القلوب والابصار۔ اول میں تحریم حلال کی دوم میں تحلیل حرام۔ بلکہ افتراضِ حرام اوران دونوں کے حکم ظاہر وطشت ازبام۔

لِلّٰہ انصاف! کیا یہاں اہل حق نے انگریزوں کو خوش کرنے کو معاذ اللہ مسلمانوں کو تباہ کرنے والا مسئلہ نکالا؟۔ یا ان اہل باطل نے مشرکین کو خوش کرنے کو صراحۃً کلام اللہ واحکام اللہ کو پاؤں کے نیچے مَل ڈالا؟

مسلمانوں کو خدا لگتی کہنی چاہیے۔ ہندوؤں کی غلامی سے چھڑانے کو جو فتاویٰ اہلسنت نے دیئے۔ کلام الٰہی واحکام الٰہی بیان کیے۔ یہ توان کے دھرم میں انگریزوں کے خوش کرنے کو ہوئے۔

وہ جو پیرِ نیچر کے دور میں نصرانیت کی غلامی اوپچی تھی۔ جسے اب آدھی صدی کے بعد لیڈر رونے بیٹھے ہیں۔ کیا اس کا ردعُلمائے اہل سنت نے نہ کیا؟ وہ کس کو خوش کرنے کو تھا؟ بکثرت رسائل ومسائل ان کے رد میں نہ لکھے گئے؟ (ص ٤٦، ٤٧۔ المحجة الموتمنه۔۔مطبوعه بريلى)

کافروں، مشرکوں اور بدمذہبوں سے موالات اور اتحاد وداد کے خلاف امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے بڑی شدت کے ساتھ تنبیہ اور تہدید فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

"عام مشرکین، ہندو کو لم يقاتلوكم فى الدين کا مصداق ماننا ایمان کی آنکھ پر ٹھیکری رکھنا ہے۔ کیا وہ ہم سے دین پر نہ لڑے؟ کیا قربانیٔ گاؤ پر ان کے سخت ظالمانہ فساد پرانے پڑ گئے؟ کیا کٹا رپور آرہ اور کہاں کہاں کے ناپاک وہولناک مظالم جو ابھی تازے ہیں، دلوں سے محو ہو گئے؟

بے گناہ مسلمان نہایت سختی سے ذبح کیے گئے۔ مٹی کا تیل ڈال کر جلائے گئے۔ ناپاکوں نے پاک مسجدیں ڈھائیں۔ قرآن کریم کے پاک اوراق پھاڑے۔ جلائے۔ اور ایسی ہی وہ باتیں جن کا نام لیے کلیجہ منہ کو آئے۔۔

اَلا لعنةُ اللّٰه علىٰ الظّٰلمين ٥ اَلالعنةُ اللّٰه علىٰ الظّٰلمين ٥ اَلالعنةُ اللّٰه علىٰ الظٰلمين ٥

اب کوئی درد رسیدہ مسلمان ان لیڈروں سے یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ اے اسٹیجوں پر مسلمان بننے والو! ہمدردیِ اسلام کا ظاہری تانا تننے والو! کچھ حیا کا نام باقی ہے تو ہندوؤں کی گنگا میں ڈوب مرو۔ اسلام و مسلمین و مساجد و قرآن پر یہ ظلم توڑنے والے کیا یہی تمہارے بھائی، تمہارے چہیتے، تمہارے پیارے، تمہارے سردار، تمہارے پیشوا، تمہارے مددگار، تمہارے غمگسار، مشرکینِ ہند نہیں جن کے ہاتھ آج بکے جاتے ہو جن کی جے مناتے ہو۔ جن کی غلامی کے گیت گاتے ہو؟ اُف۔ اف۔اف۔تُف۔تف۔تف—اِن اللہ جامعُ المنٰفقین والکٰفرین فی جھنم جمیعا۔

اور بے ایمان پکا بے ایمان ہوگا وہ جو واحدِ قہار کو یکسر پیٹھ دے کر کہے کہ یہ ملعون مظالم تو بعض بعض شہر کے بعض بعض کفار نے کیے۔ اس سے سب تو قاتلوکم فی الدین نہیں ہوگئے؟

کوئی قوم ساری کی ساری نہیں لڑتی۔ کفارِ زمانۂ رسالت جن کی نسبت حکم ہوا۔

"فاقتلوھم حیث ثقفتموھم" انہیں جہاں پاؤ قتل کرو۔

اور حکم ہوا۔ "وقاتلوا المشرکین کافۃً کما یقاتلونکم کافۃً"۔

سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب تم سے لڑتے ہیں۔

کیا ان کا ہر ہر فرد میدانِ جنگ میں آیا تھا؟

لڑائی دیکھی جاتی ہے اگر جو لڑے ان کی خاص کوئی ذاتی غرض ہے جس میں ساری قوم شریک نہیں تو وہ لڑائی خاص انہیں کی طرف منسوب ہوگی جو اس کے مرتکب ہوئے۔ مثلاً کسی گاؤں کے دُھرے مینڈھے پر بعض لوگوں سے جنگ ہو تو وہ انہیں کی ہے، نہ تمام قوم کی۔

اور اگر لڑائی مذہبی ہے تو ان سب اہل مذہب کی ہے۔ کہ باقی دامے، درمے، قلمے، قدمے، معین ہوں گے۔ اور کچھ نہ ہو تو راضی ہوں گے اور اپنے مذہب کی فتح پر تو خوش ہوں گے اور دوسرے کی ہو تو رنجیدہ ہوں گے۔ قال اللہ تعالی:

ان تمسسکم حسنۃ تسؤھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بھا.

تو وہ سب محاربین بالفعل ہیں۔ خواہ زبان سے یا دل سے ....

محاربۂ مذہبی ہر قوم کا اس بات پر ہوتا ہے جسے وہ اپنے دین کی رو سے زِشت و منکر جانے۔

اسی کے اِزالہ کے لئے لڑائی ہوتی ہے۔ اور ازالۂ منکر تین قسم ہے۔ موقعہ ہو تو ہاتھ سے۔ ورنہ زبان سے۔ ورنہ دل سے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَن رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ. فان لم یستطع فبلسانہٖ. فان لم یستطع فبقلبہٖ.

یہ تینوں صورتیں ازالہ وتغییر کی ہیں۔ اور یہ سب اہل محاربہ سے محاربہ ہی ہیں۔ بالفعل ہتھیار اٹھانا شرط نہیں۔ جس کا ثبوت اوپر گذرا۔

اور اگر یہی ٹھہری کہ اگر چہ لڑائی سر تاج قوم اور تمام افراد قوم کی رضا سے ہو مگر قاتلو کم فی الدین میں صرف وہی داخل ہوں گے جنھوں نے میدان میں ہتھیار اٹھائے۔ تو ذرا انگریزوں کے ساتھ اپنے بائیکاٹ کا مزاج پوچھ لیجیے۔ کیا ہر انگریز ترکوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ لاکھوں یا شاید کروروں ہوں جنھوں نے اس میدان کی صورت تک نہ دیکھی۔ خصوصاً ہندوستان میں سِول کے انگریز۔ تو یہ سب لم یقاتلوکم فی الدین ہوئے۔ اور تمہارا یہ ترک تعاون کا عام مسئلہ تمہارے ہی منہ سخت جھوٹا اور شریعت پر افترا ٹھہرا۔ مقاطعہ کرو تو انہیں معدود سے کرو جو میدان میں ترکوں سے لڑے۔ غرض

نے فروعت محکم آمد نے اصول
شرم بادت از خدا واز رسول

(ملخصاً المحجۃ۔ ص ۲۷ تا ۲۹، مطبوعہ بریلی۔ وص: ۴۵۲ تا ص: ۴۵۵، فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

☆☆☆☆

ایک استفتا میں اس وقت کے حالات اور پھر حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا شرعی فیصلہ ملاحظہ فرمائیں۔

کیا فرماتے ہیں عُلمائے دین اس مسئلہ میں کہ تبلیغ خلافت کی غرض سے جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا جس میں ہنود بھی شریک ہوئے۔ دوران تقریر مسلمانوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور ہنود نے وندے ماترم۔ مہاتما گاندھی کی جے۔ تلک مہاراج کی جے۔ کے نعرے لگائے۔

کیا ہنود کو مساجد میں اس قسم کے نعرے لگانا جائز ہے؟ اور اگر بعض مسلمانوں نے خود اپنی زبان سے اسی مقام پر دورانِ تقریر اہل ہنود کے ساتھ یا خود پیش قدمی کرتے ہوئے اس قسم کی جے کی آوازیں بلند کی ہوں تو ان کا کیا حکم ہے؟ بینوا بالدلیل توجروا من الرب الجلیل۔ (مسئولہ محمد مجتبیٰ خاں۔ کوٹھی سید محمد حسین صاحب بیرسٹر میرٹھ۔ ۱۵ر ذی الحجہ ۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء)

الجواب: ۔ مشرکین کی جے پکارنا ان کی تعظیم ہے اور کافر کی تعظیم کفر ہے۔ فتاویٰ ظہیریہ واشباہ ودرمختار میں ہے۔ تَبجیلُ الکافرِ کفرٌ۔ ایسے کلمہ گویوں پر لازم ہے کہ نئے سرے سے اسلام لائیں۔ پھر اپنی عورتیں رکھنا چاہیں تو ان سے از سرِ نو نکاح کریں۔

بلکہ ایسے جلسوں میں جو مضامین باطلہ ومخالفِ شرع ہوتے ہیں ان پر بہ نیتِ تحسین اللہ اکبر کہنا بھی حرام قطعی ہے کہ ذِکرِ الٰہی کی توہین ہے۔ مشرکوں کو مسجدوں میں اس طرح لے جانا اور ان کا اپنے کلماتِ کفر بالاعلان کہنا۔ اور مسلمان کہلانے والوں کا اس پر راضی ہونا باجماعِ امت حرام ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔:

اِنَّما بنیت المَسَاجِدُلما بنیتُ له. وَفِی اخری. لِلذکرِ والصلوةِ وقرأةِ القرآن .

مسجدیں تو صرف اس لئے بنیں جس لئے بنیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز اور تلاوت کے لئے بنیں۔

یہاں تک کہ صحیح حدیثوں میں فرمایا: جو مسجد میں اپنی کسی گمی چیز کو پوچھے اس سے کہو لا ردَّ اللّٰہُ علیك ضالَّتك۔ اللہ تیری گمی چیز تجھے نہ ملائے۔ مسجدیں اس لئے نہ بنیں۔

نہ کافروں کو لے جانے اور مشرکوں کی جے پکروانے کے لئے۔ مگر کیا کیجیے کہ ان لوگوں کے دل مسخ ہو گئے۔ انہوں نے مشرک کے غلام ہو کر اللہ ورسول کے سب احکام منسوخ کر دیے۔

احمق بے عقل جاہلوں کی کیا گنتی؟ ساری کمیٹی میں سب سے بڑے عالم کہلانے والے مولوی عبد الباری فرنگی محلی ہیں۔ جنہوں نے جلسۂ مدراس میں اپنے منہ اپنے آپ کو نہ صرف عالم بلکہ بہت بڑا مجدد کہا۔ وہ اقرار لکھ رہے ہیں کہ وہ بالکل پس رو گاندھی کے ہیں۔ اس کو اپنا رہنما لیا ہے جو وہ کہتا ہے وہی مانتے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہ واِنّا الیه راجعون۔

اس کا نام دین ہے؟ اس کا نام اسلام ہے؟ حالاں کہ رب عزوجل فرماتا ہے: اگر تم نے

کافروں کا کہا مانا تو ضرور تم بھی مشرک ہو۔

ولکن الظٰلمین بایٰت الله یجحدون. وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون. والله تعالی اعلم (ص ۳۰۵-فتاویٰ رضویہ۔جلد ششم۔ مطبوعہ مبارکپو، ضلع اعظم گڑھ، یوپی)

گاندھی کی قیادت میں چلنے والی تحریکِ خلافت کا اصل مقصد واضح کرتے ہوئے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی اپنی کتاب "دوامُ العیش فی الائمة من قریش" (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

"ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اصل مقصود بغلامیِ ہنود سوراج کی چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کر دی ہے۔ بھاری بھرکم خلافت کا نام لو۔ عوام بھڑیں، چندہ خوب ملے اور گنگا و جمنا کی مقدس زمین آزاد کرانے کا کام چلے۔

اے پس روِ مشرکاں بزمزم نہ رسی
کیں رہ کہ تو می روی بہ گنگ وجمن ست

(ص: ۲۲۵۔ جلد ۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

بہر حال! مجموعی طور پر تحریک خلافت جس رخ پر جارہی تھی اور تحریک ترک موالات نے جو رنگ اختیار کر لیا تھا اس میں جوش وجذبہ نے اتنا ہیجانی ماحول پیدا کر دیا تھا کہ ہوش وحواس اور مستقبل بینی سے قائدینِ تحریک عام طور پر غافل اور بے نیاز ہو گئے تھے۔ شرعی اصول وضوابط سے بے پروا ہو کر طرح طرح کی جذباتی باتیں کہی جارہی تھیں۔ انگریز دشمنی کے ساتھ مشرک دوستی کے نظارے عام تھے۔ سیاسی عزائم کے سامنے سب کچھ یا بہت کچھ جائز کر دیا گیا تھا جس کا قصہ طویل اور اس وقت کے اخبارات ورسائل میں مذکور ومسطور ہے۔

حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی اپنی ایک تحریر میں سلطنتِ اسلامیہ کی اعانت وحمایت اور خادم الحرمین کی امداد ونصرت مسلمانوں پر فرض قرار دینے کے ساتھ تحریک خلافت کے ایک نہایت اہم پہلو کی نشان دہی کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر اتنا ہی ہوتا کہ مسلمان مطالبہ کرتے اور ہندوان کے ساتھ متفق ہوکر ''بجا ہے'' درست ہے'' پکارتے ـــــ مسلمان آگے ہوتے اور ہندوان کے ساتھ ہوکر ان کی موافقت کرتے تو بے جانہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندو امام بنے ہوئے آگے آگے ہیں اور مسلمان آمین کہنے والے کی طرح ان کی ہر صدا کے ساتھ موافقت کرر ہے ہیں۔

پہلے ''مہاتما گاندھی'' کا حکم ہوتا ہے اس کے بعد ''مولوی عبدالباری'' کا فتویٰ مقلد کی طرح سرِ نیاز خم کرتا چلا جاتا ہے۔ ہندو آگے بڑھتے ہیں اور مسلمان ان کے پیچھے پیچھے اپنا دین و مذہب ان پر نثار کرتے چلے جاتے ہیں۔ (ماہنامہ السوادالاعظم مرادآباد۔ شمارہ ماہ شوال ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا سارا اختلاف یہ تھا کہ مسئلہ خلافت و مسئلہ موالات جو خالص شرعی مسائل ہیں انھیں استعمال کرنے اور ان کی صورت مسخ کرنے کی کوشش کیوں جارہی ہے؟ شریعت مخالف عمل اور بیان کا سلسلہ کیوں جاری کیا گیا ہے؟ اور شرعی مسئلہ کی باگ ڈور کسی کافرو مشرک یا کسی یہودی و نصرانی کے ہاتھ میں دینا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ برطانیہ سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے سیدھے سیدھے تحریک آزادی چلا کر عوام کو بیدار کیا جائے اور کسی بھی مرحلے میں ہندو مسلم اتحاد کے نام پر کفار و مشرکین کی خوشنودی حاصل کرتے ہوئے احکامِ شریعت کو پامال نہ کیا جائے اور مشرکینِ ہند کی قیادت مسلمانانِ ہند پر مسلط نہ کی جائے نہ اس تحریک کو ان کے حوالہ کیا جائے جیسا کہ اس وقت یہ سب کچھ ہورہا ہے۔

یہ موقف شرعی اصول پر مبنی اور بالکل درست تھا اور ہے جس کی شہادت بعد کے حالات نے بھی فراہم کردی۔ اور تاریخ ہند نے بھی امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے موقف کو صدفی صد درست قرار دیا۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے فرزند اکبر حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے قائدینِ خلافت و موالات کو مخاطب کرتے ہوئے صاف صاف فرمایا تھا کہ:

''یہ لوگ موالات کو حکم شریعت سمجھ کر نہیں مانتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کو اپنے موافق کرنے کے لئے آیتیں تلاوت کرتے ہیں۔ مانتے تو ہیں گاندھی کا حکم سمجھ کر۔ یہی وجہ ہے کہ ترک موالات کے ساتھ ہنود سے موالات فرض سمجھتے ہیں۔ آج تمام ہندوستان جانتا ہے کہ خلافت کمیٹی صرف ترک موالات بتاتی ہے اور ہنود سے موالات نہ تنہا موالات بلکہ ان کی رضا میں فنا ہو جانا ضروری قرار دیتی ہے۔ (ص:۵۵۔ دوامغ الحمیر۔ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی۔۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء)

ترک معاملت و ترک موالات سے مشرکین ہند کو مستثنیٰ کر کے صرف انگریزوں سے ترک موالات بحکم گاندھی ۱۹۲۴ء تک باضابطہ مذہبی فرض قرار دیا گیا کیوں کہ تحریکِ ترکِ تعاون/ نان کوآپریشن موومنٹ جیسے ہی ۱۹۲۴ء میں گاندھی نے واپس لینے کا اعلان کیا ویسے ہی سارے کانگریسی علُما و خلافتی لیڈر ترکِ موالات کا یہ مذہبی فرض بھول گئے۔ ورنہ مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) نے اپنی ایک تقریر میں اپنی اسلامی بصیرت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا:

''میں بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے جسے خدا کے فضل سے شریعتِ اسلامی کی کچھ بصیرت دی گئی ہے، کہتا ہوں کہ ایک مسلمان پر حبِ وطن کے لحاظ سے، مذہب کے اعتبار سے، اخلاق کے لحاظ سے فرض ہے کہ ترک موالات کرے۔'' (ص:۳۔ روزنامہ زمیندار لاہور۔ ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔

''مسلمانوں کے لئے یہ قریب قریب کفر ہو گیا ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت اور اطاعت کا کوئی تعلق رکھیں۔ اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھیں گے تو ایک منٹ کے لئے بھی ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔ (ص:۳۷۔ خطبات آزاد۔ اردو کتاب گھر دہلی۔ ۱۹۵۹ء)

تاج العلُما مولانا سید محمد اولادِ رسول میاں قادری برکاتی مارہروی (وصال ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء) امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی عملی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' — — آج (۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) سے برسوں پہلے جنگ بلقان (۱۲۔۱۹۱۱ء) کے موقعہ پر انہوں (مولانا احمد رضا) نے سلطنت اسلامی و مظلومین مسلمین کی اعانت و امداد کی مناسب و صحیح شرعی تدابیر لوگوں کو بتائیں۔ عام طور پر شائع کیں۔ قولاً و

عملاً ان کی تائید کی۔ خود چندہ دے کر عوام کو اس طرف رغبت دلائی اور اب بھی لوگوں کو صحیح مفید شرعی طریقے اعانت اسلام و مسلمین کے بتاتے رہے۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب جو عملی کوششیں کر سکتے تھے انھوں نے کیں۔ خود چندہ دیا اور اپنے زیرِ اثر لوگوں سے دلوایا۔ مسلمانوں کو اسلامی سلطنت کی امداد و اعانت پر توجہ و رغبت دلائی۔ تحفظ سلطنت اسلامی کی مفید و کارگر تدابیر بتائیں۔ یہ عملی کوشش نہیں تو کیا ہے؟ (برکات مارہرہ و مہمانانِ بدایوں (۱۳۴۰ھ) مطبوعہ حسنی پریس بریلی۔ ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۲ء)

''اس سے زیادہ اور کون سے پہلے دن سے مولانا احمد رضا خاں صاحب کوشش کرتے کہ خلافت کمیٹی والے تو آج حمایتِ خلافت و حفاظت سلطنتِ اسلامی کا نام لینے بیٹھے ہیں۔ جب کہ سلطنتِ اسلامی کا خاتمہ ہو چکا۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اس وقت سے کوشش کی جب اس موجودہ مصیبتِ عظمیٰ کا خیال بھی دلوں سے دور تھا۔ اور جنگ بلقان (جو بلحاظ حالاتِ مابعد اس مصیبتِ عظمیٰ کی تمہید و ابتدا ثابت ہوئی) کے ہی زمانہ سے حمایت و اعانت سلطنت اسلامی میں اپنی رائے و مسلک قولاً و عملاً ظاہر کر دیا۔

عوام کو رغبت دلانے کے لئے بریلی میں جلسۂ عام میں خود چندہ دیا۔ حمایتِ سلطنتِ اسلامی و اعانتِ مظلومینِ تُرک کی نافع و مفید تدابیر آگاہی عام کے لئے شائع کیں۔ (ایضاً۔ ص ۱۲۔۱۳)

۲۲ / تا ۲۴ / مارچ ۱۹۲۱ء جمعیۃ العلماء ہند کا ایک اہم اجلاس بریلی میں منعقد ہوا۔ جس میں خلافت و ترکِ موالات سے متعلق گفتگو کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہ کو ایک خط تحریر کیا۔ چنانچہ حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صاحب سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) نے اس اجلاسِ بریلی میں وفدِ علمائے اہل سنت کی نمائندگی و ترجمانی کی، جن کی شخصیت و خطابت کی تصویر کشی کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی دہلوی نے لکھا ہے:

گورا رنگ، مضبوط جسم، گنجان داڑھی، تیز و چمک دار آنکھیں، عمر پچاس کے قریب، بہار میں مکان ہے، علی گڑھ کالج میں دینیات کے پروفیسر ہیں، صوفیانہ مشرب رکھتے ہیں، کئی کتابوں

کے مصنف ہیں۔

تقریر ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں جیسے ای آئی آر کی ڈاک گاڑی۔ دورانِ تقریر صرف درود شریف پڑھنے کے لئے تھوڑی دیر میں وقفہ ہوتا ہے ورنہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالہ کی چوٹی سے گنگا کی دھار انکلی ہے جو ہَری دُوار تک کہیں رکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لے گی۔

بیان کی ایسی روانی آج کل ہندوستان کے کسی عالم میں نہیں ہے۔ تقریر میں محض الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور علمیت کا انداز ہوتا ہے۔" (درویش جنتری ۱۹۲۳ء از خواجہ حسن نظامی، بحوالہ کتابی دنیا، کراچی، شمارہ جنوری، فروری ۱۹۶۷ء)

"آپ ملکی مفاد اور بہبود کے لئے مل کر کوشش کیجیے مگر جہاں سے مذہبی حدود آئیں۔ مسلمان الگ۔ اور ہندو الگ۔ ہم اپنے "مذہب میں" ہندوؤں سے اتحاد نہیں کر سکتے۔

غرض مقاماتِ مقدسہ و خلافت اسلامیہ کے مسائل میں ہمیں اختلاف نہیں۔ ہندوستان کے مفاد کی کوشش کیجیے۔ اس سے ہمیں خلاف نہیں۔ خلاف ان حرکات سے ہے جو آپ لوگ منافی و مخالفِ دین کر رہے ہیں۔ ان حرکات کو دور کر دیجیے ان سے باز آجائیے۔ ان کی روک تھام کیجیے۔ عوام کو ان سے باز رکھیے، تو خلافت اسلامیہ و ممالک مقدسہ کی حفاظت، ہندوستان کے ملکی مفاد کی کوششیں، ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر کرنے کو تیار ہیں۔ (ص ۷۔۸۔ روداد مناظرہ۔ بہادری پریس بریلی)

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی عینی شاہد کے طور پر لکھتے ہیں:

......خطیب مولانا سلیمان اشرف تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ موصوف کی تقریر نے جو بڑی لمبی تھی۔ کانفرنس کو ہلا ڈالا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب اور کچھ کہنا ممکن نہیں۔ (ذکر آزاد۔ و ہفت روزہ چٹان لاہور۔ ۶/ مارچ ۱۹۶۱ء)

اتنے اہم مسائل پر اتنی برجستہ اور جامع تقریر سن کر ارکان جمعیۃ العلماء مبہوت ہو کر رہ گئے اور آزاد صاحب کا یہ حال تھا کہ:

"مولانا سلیمان اشرف کی جادو بیانی مولانا (آزاد) سن رہے تھے اور ان کے کندھے مولانا

سلیمان اشرف مرحوم کی جادو بیانی سن کر نمایاں طور پر پھڑک رہے تھے۔(ایضاً)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا قادری بریلوی (وصال ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) خلفِ اکبر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی یہ تقریر بھی تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

''حرمین شریفین و مقاماتِ مقدسہ و ممالک اسلامیہ کی حفاظت و خدمت ہمارے نزدیک ہر مسلمان پر بقدرِ وسعت و طاقت فرض ہے۔اس میں ہمیں کچھ کلام نہ ہے نہ تھا۔تمام کفار و مشرکین و نصاریٰ و یہود و مرتدین و غیرہم سے ترک موالات ہم ہمیشہ کے لئے ضروری و فرض جانتے ہیں۔

ہمیں خلاف آپ کی ان خلافِ شرع و خلافِ اسلام حرکات سے ہے جن میں سے کچھ مولوی سید سلیمان اشرف صاحب نے بیان کیں اور جن کے متعلق جماعت (رضائے مصطفیٰ بریلی) کے ستر (۷۰) سوالات بنام ''اِتمام حجت تامہ'' آپ کو پہونچے ہوئے ہیں۔ان کے جواب دیجیے۔ جب تک آپ ان تمام حرکات سے اپنا رجوع نہ شائع کر دیں گے اور ان سے عہدہ برآ نہ ہولیں گے، ہم آپ سے علیحدہ ہیں۔

اور اس کے بعد خدمت و حفاظت حرمین شریفین و مقاماتِ مقدسہ و ممالکِ اسلامیہ میں آپ کے ساتھ مل کر جائز کوشش کرنے کو تیار ہیں۔الخ (۱۰۔۱۱۔روداد مناظرہ۔ مطبوعہ بریلی)

تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند کے اس دورِ افراط و تفریط میں ۲۲؍۲۳؍۲۴؍شعبان ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء کو اہل سنت و جماعت کی تنظیم ''انصار الاسلام'' کی طرف سے بریلی میں شان دار اجلاس ہوئے۔جن میں اماکنِ مقدسہ کی حفاظت اور ترکوں کی مدد کے لئے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی۔مندرجہ ذیل حضرات نے ان جلسوں میں خطاب فرمایا۔

(۱) مولانا سید شاہ اولاد رسول محمد میاں قادری برکاتی (مارہروی)
(۲) مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی بہاری،(خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی)
(۳) مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی //
(۴) پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاری //
(۵) مولانا سید دیدار علی شاہ اَلوری //

ان حضرات نے ترکوں کی مدد، اماکن مقدسہ کی حفاظت اور ترک موالات کے موضوع پر مدلل تقریریں فرمائیں۔ لیکن ان کا مطمح نظر سیاسی نہیں بلکہ شرعی تھا اس لئے مخالفین کی طرف سے ان جلسوں کو درہم برہم کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ اس جذباتی دور میں معقولیت اور شریعت کی بات سننے کے لئے بہت کم لوگ تیار تھے۔ کیوں کہ سوءِ اتفاق کہ مخالفین کے رہبر بھی از قسم علماء ہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ کفار و مشرکین کے ساتھ تھے اور یہ علیحدہ۔ اور یہی بہت بڑا فرق تھا جو اس وقت محسوس نہیں کیا گیا۔

اجلاس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) علمائے حق اہل سنت اور مسلمانانِ بریلی کا یہ عظیم الشان جلسہ گورنمنٹ برطانیہ سے زور کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اور تمام اتحادیوں کا اثر جزیرۃ العرب سے اٹھا کر مسلمانوں کو مذہبی دست اندازی کی تکلیف سے باز رکھے۔

(۲) یہ جلسہ گورنمنٹ سے زبردست مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مظلومینِ سمرنا وغیرہ کی مالی اعانت وارسالِ زر کے قابل اطمینان ذرائع ہمارے لئے بہم پہونچائے۔

(۳) یہ جلسہ ترک و عرب میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک وفد بھیجنا تجویز کرتا ہے اور گورنمنٹ سے زور کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے کہ عرب میں (اہل عرب کی امداد و اعانت کرنے کے لئے) ہمارے وفد کی ذمہ داری قبول کرے۔

(۴) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ ان مطالبات کے لئے گورنمنٹ کے پاس وفد بھیجا جائے۔

(۵) یہ جلسہ مسلمانوں کو پورے زور کے ساتھ ترغیب دیتا ہے کہ اپنے تمام مقدمات جن کو وہ آپس میں طے کرنے کے مجاز ہیں مطابق شرع شریف فیصل کرلیں اور کچہریوں کی مقدمہ بازی سے کہ فریقین کے لئے تباہ کن ہوتی ہیں، بچیں۔

(۶) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ گورنمنٹ جو قانون ایسا بنائے جس سے کسی اسلامی مسئلے کو مضرت پہنچے یا پہنچنے کا اندیشہ ہو، اس کی ضرور ترمیم چاہی جائے اور اس کی جائز کوشش انتہا تک پہنچائی جائے۔

(۷) یہ جلسہ اپنے مسلمان بھائیوں کو خاص اپنی تجارت بڑھانے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے ذرائع کی توسیع اور حتی الامکاں ان صورتوں کے بہم پہنچانے پر توجہ دلاتا ہے جن سے مسلمان کبھی کسی غیر مسلم تجارت کے محتاج نہ رہیں۔

(۸) یہ جلسہ اپنے مسلمان بھائیوں کو اسلامی بینک کھولنے پر توجہ دلاتا ہے تاکہ مسلمان غیر مسلموں کے دست برد سے بچیں۔

(۹) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ تُجّار اور رؤسا سے ایک اسلامی خزانہ قائم کرنے کی تحریک کی جائے جس میں ماہ بماہ سال بہ سال کچھ رقم جمع ہوتی رہے کہ وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی تجارت کی توسیع کی ضرورتوں اور نیز اعانتِ سلطنت اسلام وضروریاتِ اسلام میں کام آئے۔

(۱۰) یہ جلسہ مسلمانوں کو علم دین و مذہب اہل سنت و جماعت کے مطابق عقائد عُلَماے حرمین شریفین کی اشاعت پر نہایت تاکید سے توجہ دلاتا ہے۔

(۱۱) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ جو غلط طریقے، ناجائز راستے، مضر وطیرے بغلط لباس شرعی پہنائے گئے ہیں، ان کی شناخت پر مسلمانوں کو تحریراً تقریراً مطلع کرے۔(ماھنامه السواد الاعظم مراد آباد۔ شعبان ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء)

اکثر عُلَماے اہل سنت بھی اسی نظریہ کی تائید میں تھے جس کی ترجمانی حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے فرمائی۔ چنانچہ پروفیسر محمد مسعود احمد مجددی (کراچی) فرزندِ حضرت مفتی مظہر اللہ خطیب وامام شاہی مسجد فتح پوری (متوفی ۱۹۶۶ء) رقم طراز ہیں:

''حضرت مفتی اعظم محمد مظہر اللہ مجددی دہلوی قدس سرہ بھی تحریک آزادیِ ہند سے الگ تھلگ نہیں رہے۔ البتہ سیاسی معاملات میں ہمیشہ شریعت کو پیش نظر رکھا۔ تحریک خلافت کے آغاز (۱۹۱۹ء) میں کچھ عرصہ شریک رہے لیکن جب تحریک ترکِ موالات (۱۹۲۰ء) کا آغاز ہوا تو اس سے علیحدہ ہو گئے اور ہندو مسلم اتحاد کے خلاف فتویٰ دیا۔ اس فتویٰ کی بنیاد سیاسی نہ تھی بلکہ خالصۃً شرعی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی سے حضرت (مفتی مظہر اللہ دہلوی) کے مخلصانہ

تعلقات تھے۔ یہ حضرات حضرت کے پاس آتے جاتے تھے۔ چنانچہ مولانا منور حسین سیف الاسلام تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی صاحبان بھی حضرت مفتی اعظم (دہلی) سے ملتے تھے مگر حضوری کے بعد یہی کہتے تھے کہ:

"مفتی صاحب اٹل ہیں۔ وہ مشرکوں کے ساتھ کسی صورت میں اشتراک کو جائز نہیں سمجھتے۔"

حضرت (مفتی مظہر اللہ دہلوی) نے ہمیشہ سیاسی معاملات کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھا۔ اور اس دینی اور سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا جو ان کے معاصر علماء میں ماسوا چند ایک کے کسی کو حاصل نہ تھی۔ ترک موالات کے علاوہ جب مشرکین ہند کی تالیفِ قلوب کے لئے گائے کی قربانی ترک کرنے کی تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے شروع ہوئی تو حضرت نے سخت مزاحمت فرمائی اور اس کے خلاف فتویٰ دیا۔" (۲۹و۳۰ حیات مظہری۔ مطبوعہ کراچی۔)

نواب مشتاق احمد خاں حیدر آبادی فرزندِ نواب فخر یار جنگ وزیر مالیات حیدر آباد دکن، حضرت مولانا سید سلیمان اشرف سابق صدر شعبۂ سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (خلیفۂ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی) پر لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ:

"یہ تحریک عدم تعاون کا زمانہ تھا۔ کالج (علی گڑھ) میں علمائے کرام اور سیاست دانوں کی یلغار تھی۔ ذہنی خلجان اور افراتفری کا عالم تھا۔ سب چھوٹے بڑے نتائج سے بے پرواہ اسی رَو میں بہے جا رہے تھے۔ مولانا (سید سلیمان اشرف) ان معدودے چند بزرگوں میں تھے، جنھیں اس تحریک سے اختلاف تھا۔ ان کی نظر میں بعض مضمرات مسلمانوں کے عقائد اور مفاد کے منافی تھے۔ مثلاً شردھانند جیسے کٹر ہندو کو تقریر کے لئے مسجد میں لانا ایک ناقابلِ برداشت جسارت تھی۔ مولانا اپنے خیالات کا اظہار کھلم کھلا اور لگی لپٹی کے بغیر کر دیتے تھے۔ رَو میں بہہ جانے والے لوگوں نے خاص کر بعض علمائے کرام نے انھیں بہت کچھ برا بھلا کہا اور اخباروں اور رسالوں میں لعن طعن ہوتی رہی، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ایک دن جب وہ تفسیر کا درس دے رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر جنھوں نے اس زمانہ میں اپنا مستقر علی گڈھ بنالیا تھا۔ طلبہ کے ایک گروہ کے ساتھ مسجد میں تشریف

لائے اور قریب آکر مولانا پر ایک طنزیہ فقرہ چست کر دیا............

اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا۔ مولانا کی اعلیٰ شخصیت اور کردار کی بلندی کا واضح ثبوت مل گیا۔ وہ نہ صرف اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ بلکہ اس گرما گرم بحث میں مولانا محمد علی جوہر جیسے شخص کو نیچا دکھا دیا۔ اس دن میں نے مولانا کو بڑے جلال میں دیکھا۔ ان کی یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ:

''آپ لوگوں نے مذہبی اصولوں اور فقہی مسائل کو تماشہ بنا دیا ہے۔ میں زندہ رہا، تو دیکھوں گا کہ کون حق پر ہے؟'' (ص ۹۲۔ماهنامه ضيائے حرم۔ لاهور۔شماره جون ۱۹۷۷ء)

حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے روز نامہ ''پیسہ'' لاہور نے ''آہ مولانا احمد رضا خاں صاحب'' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا تھا جس کا یہ تاریخی حصہ پڑھنے کے لائق ہے:

''ترک موالات کے متعلق مرحوم کی رائے یہ تھی کہ:

مسلمانوں میں ترک موالات کا حکم صاف اور عام ہے تو اس میں استثناء کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ کہ جب اسلام میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ یکساں ترک موالات کا حکم ہے تو جس طرح انگریزوں اور ان کی حکومت سے ترک موالات کیا جاتا ہے ویسے ہی ہندوؤں سے بھی جو مشرکین میں شمار کیے جاتے ہیں، ترک موالات ہونی چاہئے۔ یہ منطق نہایت کمزور ہے کہ انگریزوں سے تو ترک موالات ہو اور ہندوؤں سے محض سیاسی اتحاد کے لئے موالات روا رکھی جائے۔'' (روز نامہ پیسہ لاہور۔ شمارہ ۳ر نومبر ۱۹۲۱ء)

شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) بھی ابتداءً پنجاب خلافت کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد انھوں نے اس کمیٹی سے استعفاء دیتے ہوئے لکھا:

''گرامی صاحب کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیجیے۔ سنا ہے وہ مجھ پر ناراض ہیں کہ میں نے خلافت کمیٹی سے کیوں استعفاء دے دیا۔ وہ لاہور آئیں تو ان کو حالات سے آگاہ کروں۔ جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبروں کا مقصد تھا۔ اس کے اعتبار سے تو اس کمیٹی کا

وجود میری رائے میں مسلمانوں کے لئے خطرناک تھا۔ (۱۱ر فروری ۱۹۲۰ء)۔ (ص ۲۷۔ مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خاں۔ مطبوعہ بزم اقبال لاہور ۱۹۵۴ء)

شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) کے صاحبزادے مسٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اقبال مسئلۂ خلافت پر مسلمانوں کے ہندوؤں کے ساتھ مل کر عدم تعاون کی تحریک میں شرکت کے خلاف تھے۔ کیوں کہ کسی قابلِ قبول ہندو مسلم معاہدہ کے بغیر محض انگریز دشمنی کی بنا پر قومیتِ متحدہ کی تعمیر ممکن نہ تھی۔ علاوہ اس کے انھیں خدشہ تھا کہ کہیں ایسے اشتراک اور مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر قومیتِ متحدہ کے داعی ان کی علیحدہ ملّی حیثیت نہ ختم کر دیں۔ جس کے سبب بعد میں انھیں پشیماں ہونا پڑے۔ انھیں اختلاف کی بنا پر اقبال نے صوبائی خلافت کمیٹی سے استعفاء دے دیا۔'' (ص: ۲۴۸۔ ج دوم۔ زندہ رود۔ از جاوید اقبال۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

ڈاکٹر اقبال اپنے ایک مکتوب بنام مولانا سید سلیمان ندوی میں لکھتے ہیں:

''اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھوں بک جانا گوارا نہیں ہوسکتا۔ افسوس اہل خلافت اپنی اصل راہ سے بہت دور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص ایک منٹ کے لئے قبول نہیں کرسکتا۔ (ص: ۲۴۹۔ ج دوم۔ زندہ رود از جاوید اقبال۔ مطبوعہ لاہور)

اس دور کے مذہبی اور سیاسی حالات سے واقفیت کے لئے ڈاکٹر اقبال کے ایک دوست مولانا غلام بھیک نیرنگ (وکیل انبالہ، پنجاب) کے ایک مضمون بعنوان ''اقبال کے بعض حالات'' کا یہ حصہ ملاحظہ فرماتے چلیں۔

''۱۹۲۳ء کے آغاز میں اسی سلسلہ کی ایک منظّم اور اعلانیہ شدھی تحریک آگرہ، متھرا، بھرت پور، ایٹہ، وغیرہ اضلاع میں جاری ہوئی۔ اور مسلمانوں نے اس حملہ کی مدافعت کے لئے ان شدھی زدہ علاقوں میں اپنے واعظ اور مبلغ بھیجے۔ اس زمانے میں جو تجربات و مشاہدات ہوئے، ان کے پیشِ نظر راقم نے یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو بہ مشورہ و امداد بعض اکابر ملت مثل حاجی مولوی سر رحیم بخش مرحوم، مولانا عبد الماجد بدایونی، نواب عبد الوہاب خاں مرحوم۔ ایک مرکزی ''جمعیت تبلیغ الاسلام'' قائم کی جو بفضلہٖ تعالیٰ اب تک قائم ہے۔ چونکہ اقبال کو تبلیغ و اشاعت اسلام کا خاص شوق تھا (اس

لئے) وہ ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ہماری اس جمعیت کے ممبر ہو گئے۔ (ص ۲۲۔سہ ماھی اقبال۔ لاھور۔شمارہ اکتوبر ۱۹۵۷ء۔)

چنانچہ سر اقبال اپنے ایک مکتوب محررہ ۵/دسمبر ۱۹۲۸ء بنام مولانا غلام بھیک نیرنگ (انبالہ، پنجاب) میں فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

یہ بات میں علیٰ وجہِ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیاتِ حاضرہ کے تھوڑے سے تجربے کے بعد۔ ہندوستان کے سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ اور میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ یا کم از کم یہ بھی شدھی بھی اسی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔

بہر حال! جس جاں فشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اس کا اجر حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی دے سکتے ہیں۔ آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں۔ مگر آپ اور مولوی عبد الماجد بدایونی جنوبی ہند کے دورہ کے لئے تیار رہیں۔ (ص:۲٤ سہ ماھی اقبال، لاھور، ۱۹۵۷)

سوامی شردھانند کی نہایت خطرناک تحریک شدھی سنگٹھن یعنی تحریک اِرتدادِ مسلمین (در ۱۹۲۳ء) کے سدِ باب کے لئے مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی تدابیر و مساعی کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ تحریکِ خلافت و تحریکِ موالات کے زُعَما و قائدین اور جمعیۃ العُلَما کے علُما و مشائخ نیز دیگر قوم پرست مسلم لیڈروں کا کوئی قابلِ ذکر اور مؤثر کردار دور دور تک کہیں نظر نہیں آتا اور لاکھوں مسلمانوں کے ارتداد کا طوفان انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ کیا اس کے پسِ پشت نظریۂ ''قوم پرستی'' ''متحدہ قومیت'' اور ''ہندو مسلم اتحاد'' کے ایمان شکن و اسلام دشمن اثرات و نتائج کارفرما نہیں ہیں؟؟؟

اربابِ بصیرت اور دیدہ ور مسلم تاریخ نگاروں کو اس پہلو پر غور کر کے اس کا صحیح تجزیہ کرنا چاہیے کہ شدھی تحریک (یعنی تحریکِ ارتداد مسلمین) ۱۹۲۳ء کی طرف سے علما وزعمائے تحریکِ خلافت وترکِ موالات وجمعیۃ العلما نے کیوں چشم پوشی وغفلت برتی؟ اس اجتماعی بے حسی وبے اعتنائی کے اسباب ومحرکات کیا تھے؟ اِرتداد جیسی خطرناک طوفانی مہم بھی ان کی ایمانی غیرت وحمیت کو بیدار کیوں نہ کرسکی؟ جس نے ان کے مومنانہ ضمیر کے وجود پر ایک نمایاں سوالیہ نشان لگادیا؟ اور اس کا صحیح جواب بھی مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کر کے انہیں مستقبل کی اس طرح کی ممکنہ غلطی سے مکمل اجتناب واحتراز کا پیغام دینا چاہیے۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی قائم کردہ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی شریف (تشکیل در ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء) نے شدھی سنگٹھن تحریک ۱۹۲۳ء کے مقابلے میں علاقہ آگرہ ومیوات وراج پوتانہ میں اپنا وفد بھیج کر اس کا سیلاب روکا اور لاکھوں مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچایا۔ اس موقع پر ممبر وفدِ جماعت رضائے مصطفیٰ حضرت مولانا حشمت علی لکھنوی (وصال ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) تحریر فرماتے ہیں:

''جمعیۃ العلماء وخلافت کمیٹی کی طرف سے ابھی تک کوئی عملی خدمت شروع نہیں کی گئی، باوجود یہ کہ ان جماعتوں کے پاس کافی روپیہ اور کثیر التعداد ممبر اور مبلغ اور لکچرار بھی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک جز واس کام پر مامور کردیا جاتا، تو ان جماعتوں کی شان سے کچھ بعید نہ ہوتا، لیکن نہ معلوم یہ جماعتیں اس کام کو کیوں غیر ضروری سمجھتی ہیں؟ اور پانچ لاکھ مسلمانوں کے ایمان کا خطرہ انہیں بے چین کیوں نہیں کرتا؟ مسلمانوں کی غفلت کب تک رہے گی؟ اور وہ اپنے دین پر ایسے زبردست حملے دیکھ کر بھی ہوش میں نہ آئیں گے؟ (ص ۴، دبدبۂ سکندری، رام پور، مؤرخہ ۱۶ر فروری ۱۹۲۳ء۔ وص ۹۵۔ تحریک شدھی اور علمائے اہل سنت، مؤلفہ محمد شہاب الدین رضوی، مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء)

تحریک خلافت وترک موالات کے علما وقائدین کی حرکات کے بارے میں مولانا اشرف علی

تھانوی (متوفی ۱۹۴۳ء) کہتے ہیں:

"اوران لیڈروں کی کیا شکایت کی جاوے؟ بعض مولوی ایسے بدحواس ہوئے کہ نہ ان کو دنیا کی خبر رہی اور نہ ہی دین کی۔ ایمان تک قربان اور نثار کرنے کو تیار ہو گئے اور ایک مولوی صاحب نے گاندھی کے عشق میں اپنے ایمان اور دین اور اس میں گذری ہوئی عمر کو اس پر نثار کرنے کا اس شعر میں اقرار کر لیا ہے۔

عمرے کہ بآیات و احادیث گذشت رفتی و نثارِ بت پرستی کردی

ایک لیڈر صاحب نے یہ کہا کہ "اگر نبوت ختم نہ ہوتی، تو گاندھی مستحق نبوت تھا"۔
حیرت ہے کہ ایسا کم فہم نبی ہوتا؟ اگر فہیم ہوتا، تو پہلے آخرت پر ایمان لاتا۔" (ص: ۱۲۵۔ حصہ پنجم۔ الافاضات الیومیہ۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ مطبوعہ کراچی)

"یہ پہلے ہی سے اسلام اور ایمان کو ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ اوپر سے طاغوت کا سہارا مل گیا۔ سب کچھ اس کی نذر کر دیا۔ ماتھے پر قشقے لگوائے۔ جے کے نعرے بلند کیے۔ ہندوؤں کی اَرتھیوں کو کاندھا دیا۔ مساجد میں منبروں پر کافروں کو بٹھا کر مسلمانوں نے مذکرّ بنا دیا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مصلیٰ کی بے حرمتی کی۔ آیات واحادیث میں گذری ہوئی عمر کو ایک کافر بت پرست پر نثار کر دیا۔ لیڈروں کی اجازت سے مسلمان والنیٹر وں نے رام لیلا کا انتظام کیا۔ یہ علی الاعلان شایع کیا گیا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو فلاں طاغوت نبی ہوتا —" (ص: ۸۰۔ الافاضات الیومیہ، مولانا اشرف علی تھانوی۔ جلد ہشتم، مطبوعہ تھانہ بھون)

مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری (متوفی ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء) کے احوال وافکار کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:

"اسی طرح جس وقت گائے کے ذبیحہ کا ترک شروع ہوا اور بہتیرے مولویوں نے بھی اس کو مباح قرار دے کر بہ مصالحِ دینیہ ترجیحِ ترک پر فتویٰ دیے تو آپ نے سکوت پسند نہیں کیا اور شعارِ اسلام

ہونے کے لحاظ سے اس کی ضرورت عِلماً و عملاً محقق فرمائی۔ اس وقت آپ پر سب وشتم ضرور ہوا مگر چند ہی روز بعد اس کا نتیجہ دیکھ کر ممانعت کا فتویٰ دینے والے خود فرضیت کا فتویٰ دینے لگے۔ غرض اس اصول کے آپ ہمیشہ پابند رہے کہ ہر کارے و ہر مردے۔ دنیوی ضروریات پر جس طرح نظر لیڈرانِ قوم کی جائے گی اسی طرح دینی ضروریات پر اول نگاہ پڑنا علما و مشائخ کا منصب ہے نہ کہ لیڈرانِ قوم کا فتویٰ جس میں وہ علما کو متفق کرنے کی کوشش کریں کسی طرح دین نہیں ہوسکتا۔ ایک بار آپ نے افسوس کے ساتھ فرمایا۔ مسلمان اس شورش میں ہلاک ہوجائیں گے کہ لیڈران کو کرلیا آگے اور مولوی ہولیے ان کے پیچھے۔ (ص ۲۱۸۔ تذکرۃ الخلیل از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ مطبوعہ الخلیل مشین پریس میرٹھ)

مولانا شبیر احمد عثمانی سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات وصدر مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۶۹ھ/ دسمبر ۱۹۴۹ء) تحریکِ خلافت وترکِ موالات کے حامی ہونے کے باوجود لکھتے ہیں کہ:

''بہت سے خیر خواہ ''ہندو مسلم اتفاق'' کے عواقب کے بعد عوام الناس اور بعض لیڈروں کی ان غلط کاریوں پر متنبہ فرمارہے ہیں جو اس اتفاق کے جوش سے پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً قربانیِ گاؤ میں بعض جگہ تشدد و مزاحمت کیا جانا، یا قربانی کے جانور کو سجا کر رضا کارانِ خلافت کا گئوشالہ پہنچانا، یا قشقہ لگانا، یا ہندوؤں کی اَرتھیوں کے ساتھ خصوصاً ''رام رام ستیہ ہے'' کہتے ہوئے جانا، یا یہ کہنا کہ امام مہدی کی جگہ امام گاندھی تشریف لائے ہیں۔ یا یہ کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے یا قرآن وحدیث میں بسر کی ہوئی عمر کو نثارِ بت پرستی کرنا......

بلاشبہ میں بھی جب اپنی قوم کے بڑے سر برآوردہ لوگوں کو سنتا ہوں کہ وہ اس قسم کے محرمات یا کفریات کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ باتیں زبان سے بے دھڑک نکال دیتے ہیں، جن کو سن کر ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، تو میرا دل پاش پاش ہوجاتا ہے۔ الخ (ص: ۴۷۔ علامہ شبیر احمد عثمانی۔ از ڈاکٹر علی ارشد۔ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۲۰۰۵ء)

حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی قائم کردہ تحریک ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' (تشکیل ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء) نے شدھی تحریک کے مقابلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی، صدرالشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، محدث اعظم ہند مولانا سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا قادری بریلوی، شیر بیشۂ اہل سنت مولانا حشمت علی لکھنوی وغیرہم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ تحریک شدھی سنگٹھن کے زہریلے جراثیم اور خطرناک مفاسد کے ازالہ کے سلسلے میں ملکانہ یعنی آگرہ ومتھرا وبھرت پورو الٰو روغیرہ میں جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی شریف کی مساعیِ جمیلہ کو اس وقت (۱۹۲۳ء) کی دو عظیم المرتبت شخصیتوں اور مقبولِ عوام وخواص بزرگوں (۱) امیر ملت سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری (وصال ۱۳۷۰ھ) اور شیخ المشائخ سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی (وصال ۱۳۵۵ھ) کی مکمل تائید وحمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ جن کے وفود اور مبلغین نے جماعت رضائے مصطفیٰ کے ساتھ تعاون کر کے ملکانہ راجپوتوں کے علاقوں میں قریہ قریہ گھوم کر اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ہزاروں مسلمانوں کو ارتداد سے محفوظ رکھا اور ہزاروں وہ مسلمان جو ارتداد کا شکار ہو چکے تھے انہیں دوبارہ کلمہ پڑھا کر مشرف باسلام کیا۔ یہ تفصیلات ۱۹۲۳ء و۱۹۲۴ء کے رسائل ومجلّات میں تاریخی ریکارڈ کے طور پر درج ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مستقل کتاب ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' مؤلفہ مولانا شہاب الدین رضوی مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے اس کا مطالعہ کر کے اس وقت کے حالات و کیفیات اور جماعت کی خدمات وغیرہ ہر طرح کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ماہنامہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف (ضلع فیض آباد) کی ایک تجزیاتی رپورٹ ملاحظہ فرمائیں:

''مشرکینِ ہند کی یہ نگاہ سرسری طور پر نہ تھی بلکہ گہری تھی مگر وہ قدرت کے فیصلے اور آنے والے واقعات سے بے خبر تھے۔ چنانچہ اب وہ دیکھ رہے ہیں کہ خلافت کے حقیقی غم خوار اور اسلامی دفاعی قوت کی سچی جاں نثار فوج اور نوجوان مسلمان کا واقعی لشکر جس کا دوسرا نام ''جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی'' ہے اور جس کو عرصہ سے دنیا ضلالت شکن اور ارتداد فگن کا خطاب دے چکی ہے، وہ لشکرِ ظفر پیکر غازیِ اعظم کی فاتحانہ شوکت دیکھ کر ادھر سے مطمئن ہو کر ملکانہ کے میدانِ جہاد پر ٹوٹ پڑا

ہے اور پنجاب وممالکِ متحدہ سے اس وقت تک بارہ کمک اس کے لئے پہنچ چکی ہے۔ جن کے مقابل قدیم ارتداد پسندوں سے بھی ''مشرکین ہند'' کو کوئی معتد بہ نفع حاصل نہیں ہوسکتا۔ رؤسا بھی اب غافل نہیں جیسا کہ جماعت مبارکہ (رضائے مصطفیٰ بریلی) کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے شیروانی رؤسا نے جن میں ''اشرفی'' کے سرپرست عالی جناب خان بہادر نواب محمد ابوبکر خاں صاحب رئیس دادوں (علی گڑھ) بھی شامل ہیں، اسلام کے لیے کمربستہ اور تیار ہوچکے ہیں اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے حقیقی سردار مشائخ کرام اپنی اپنی خانقاہوں سے نکل پڑے اور ان کی کِبر سنی اور ضعیف العمری نے ان کو خدمتِ اسلام سے باز نہیں رکھا۔ (ماہنامہ اشرفی، کچھوچھہ مقدسہ، شمارہ ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ/اگست ۱۹۲۳ء)

محدث اعظم ہند سید محمد اشرفی کچھوچھوی (وصال رجب ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) جنہوں نے تحریکِ ارتداد کے خلاف عملی طور پر حصہ لیا تھا، اس سلسلے میں آپ ایک جگہ لکھتے ہیں:

مؤرخہ ۲۳/ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۷/اگست ۱۹۲۳ء کو میں طلبیدہ فرنگی محل لکھنؤ گیا اور وہاں سے آگرہ روانہ ہوا تا کہ مبلغینِ اسلام کی مساعیِ جمیلہ کو مشاہدہ کروں۔ (ماہنامہ اشرفی، کچھوچھہ مقدسہ، ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ/اگست ۱۹۲۳ء)

اپنے ایک خطبۂ صدارت در کانفرنس عیدگاہ بھڑوچ گجرات منعقدہ ۱۸/۱۹/۲۰/نومبر ۱۹۵۷ء میں فرماتے ہیں:

''اس ادارہ کو سب سے پہلے ملکانہ کی اس تحریک شدھی سے مقابلہ پڑا، جو تحریک ننگی تلوار کے سایہ اور سرمایہ سے شروع ہوئی تھی اور جس کے دفاع کے لئے کسی اقدام میں جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ بدیسی حکومت کی پالیسی افتراق پیدا کرنے کی ہوا دے رہی تھی اور ملک کے تمام ادارے خوف زدہ ہوکر خاموش ہوگئے تھے۔ اس وقت ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' رضائے مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حاصل کرنے کے لئے خطرات سے بے پروا ہوکر جان کی بازی لگا کر سربکف میدان میں کود پڑی اور جماعت کی شاندار کامیابیوں کو دیکھ کر اوروں میں بھی جرأت ہوئی اور چندہ خوروں نے بھی خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ مگر ملکانہ کا ذرہ ذرہ گواہ ہے۔ اور اس وقت کے

حکومتی دفاتر گواہ ہیں کہ ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' نے تحریک (شدھی) کو ایسی فاش شکست دی کہ جو بچھڑ چکے تھے آکے گلے ملے اور جو بچھڑنے کے قریب تھے وہ باز رہے اور اس سعی کے نتیجے میں جو قطعی بیگانے تھے ان کی بڑی تعداد کے افراد اپنے یگانے ہوگئے اور میدان میں صرف ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' کا جھنڈا لہراتا رہا۔ مدارس قائم کیے گئے اور ملکانہ کا ذرہ ذرہ حلاوتِ ایمان حاصل کرنے لگا۔
(ماہنامہ سنی لکھنؤ۔ بابت جمادی الآخرہ ۱۳۷۷ھ)

بہت سے وطنیت پرست زُعما و قائدینِ جمعیۃ العُلماء نے اپنی عاقبت نااندیشی سے حد سے متجاوز ہوکر ''ہندو مسلم اتحاد'' جسے مشرک نوازی سے تعبیر کیا جانا چاہیے اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو زبردست نقصان پہونچایا اور اس نعرہ کے سہارے ''اِدغام واِنضمام'' کی ایسی لہر چل پڑی جس پر بڑی مشکل سے قابو پایا جاسکا۔

مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ہم نوا علُمائے دیوبند کھلے بندوں یہ اعلان کرتے تھے کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں''۔ مولانا حسین احمد مدنی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) کے ہاتھوں میں اس نظریۂ قومیت کا پرچم تھا اور ان کے پیچھے جمعیۃ علُمائے ہند کا قافلہ رواں دواں تھا اور آج بھی ان کے وارث علُما سیاسی حلقوں میں ''نیشنلسٹ علُماء'' ہی کہے اور سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ امتِ اجابت اور ملتِ اسلامیہ کا خمیر دین اسلام ہے اور قومیت جغرافیائی وحدت یا نسبی ونسلی یگانگت سے عبارت ہے۔ دین کے تشخص اور امت وملت کے تحفظ کو اسلام ہر حال میں فوقیت اور ترجیح دیتا ہے۔ دیگر امور ومعاملات کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ قومیتِ متحدہ کے نام پر مسلم تشخص کا جذبہ سرد کر کے ہندو مسلم اِدغام واِنضمام کی راہ ہموار کرنا مسلمانانِ ہند کے لئے نہ پہلے قابل قبول تھا نہ اس وقت ہے اور نہ آئندہ ایسا کبھی ہوسکتا ہے۔ مسلم مخالف قومی وفکری رجحان کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے اسی وقت کہا تھا:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسرِ منبر کہ ''ملت از وطن ست''

چہ بے خبر زمقامِ محمد عربی است

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

وگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

☆☆☆

ندانی نکتۂ دینِ عرب را

کہ گوئی صبحِ روشن تیرہ شب را

اگر قوم از وطن بودے محمد

ندا دے دعوتِ دیں بولہب را

☆☆☆

حق را بفریبد کہ نبی را بفریبد

آں شیخ کہ خود را مدنی می خواند

☆☆☆

اپنی ملت کو قیاس اقوامِ مغرب پہ نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ھاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پہ انحصار

قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں؟

اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

مولانا شبیر احمد عثمانی سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات وصدر مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) اس نظریۂ وطنیت جس سے اسلام وایمان پہ حرف آئے اس کے خلاف اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے لئے سب سے پہلے ایک اسلامی وحدت و مرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بدوں کسی نام نہاد قومیتِ متحدہ کے تیز دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے آپ کو ڈال دینا خودکشی کے مترادف ہے۔ مسلمان دوسری قوموں سے صلح کر سکتے ہیں۔ عہد و پیمان کر سکتے ہیں۔ بہت سے امور میں تعاون اور اشتراکِ عمل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی مستقل ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کر سکتے۔ (ص ۲۳۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام دہلی۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف بہاری (وصال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تحریکِ خلافت اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی تحریکِ ترک موالات اور وطن پرستی کے انجام کا فیصلہ فرماتے ہوئے اپنی وقیع کتاب ''النور'' مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں تحریر فرماتے ہیں:

''مسٹر گاندھی کی دور بیں نگاہوں نے جب یہ دیکھا کہ مادرِ وطن کا نام لے کر مسلمانوں کو من حیث القوم حرکت میں نہیں لایا جا سکتا۔ چاہے چند ذی وجاہت یا شہرت پسند شریک ہو جائیں لیکن قوم کی شرکت متعذر رہے تو وہ ہندوؤں کے سامنے آزادیِ ہند کو شفیع لائے اور مسلمانوں کے سامنے مسئلۂ خلافت پیش کیا اور اس ایک مرکز پر کہ انگریزوں کا وجود دونوں کی گرفتاری اور پائمالی کا موجب ہے —— ہندو مسلم دونوں متضاد قوموں کا اجتماع کر دیا۔ شاید مسلمانوں کو ہندو لیڈروں کی اس زمانے کی پالیسی ابھی یاد ہوگی جب کہ یورپ کے میدانِ کارزار میں جنگ کی ایسی آگ بھڑکی جس کے شعلے اور چنگاریوں سے ہندوستان کا مصئون و محفوظ رہنا بھی معرضِ خطر میں تھا، اس وقت خصوصیت کے ساتھ مسٹر گاندھی کی پالیسی مسلمانوں کے ساتھ ان کی ''مخلصانہ محبت'' کا اچھا سراغ بتاتی ہے۔ یہ عجیب کشاکش کا وقت ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لئے تھا۔ ملخصاً۔

اس عقدۂ لاینحل کو مسٹر گاندھی نے اپنے ناخنِ تدبیر سے ایسا سلجھایا کہ مسلمانوں کی عقلیں الجھ گئیں۔ اسی الجھن میں مسلمانوں نے اتحاد کا ہاتھ بڑھانے سے پیشتر مدغم ہو جانے کی کوشش کی۔ قشقہ کھینچا۔ مندروں میں گئے۔ چڑھاوے چڑھائے۔ بتوں پر پھولوں کا تاج رکھا۔ گئو ماتا کی جے

پکاری۔ قربانیِ گاؤ سے توبہ کی۔ منبر ومکبرہ پر ہنود کو تبلیغ وہدایت کے لئے جگہ دی۔ اب مضامین لکھے جاتے ہیں۔ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ وعظ کہے جاتے ہیں۔ جن کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ کفار ومشرکین میں جذب ہوجانا عین اسلام ہے۔

غالباً خلافت کے متعلق تم یہ جواب دوگے کہ اب یہ مسئلہ طے ہوگیا کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو اور انگریزوں کا قدم یہاں سے نہ ہٹے، مسلمان کچھ بھی خلافت کی مدد نہیں کرسکتے ہیں۔

ہاں! میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ پہلے خلافت کے لئے ہندو تک سرگرم کار تھے۔ لیکن اسی قلیل مدت میں یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ خود مسلمان بجائے خلافت "سوراج" پکارنے لگے۔ شاید گاندھی کے باب میں تم یہ جواب دو کہ جب تک مسلمانوں میں کوئی صاحبِ سجادہ کوئی خانقاہ نشیں کوئی واعظ وفقیہ کوئی محدث ومفسر، حد یہ کہ کوئی جنٹلمین لیڈر مثل گاندھی کے نہ ہو تو ہمیں اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ ہم اسی کی تقلید کریں؟ ہاں! میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ گاندھی تمہارا پیشوا ہے اور تم اس کے پیرو— ہاں! میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ تم اس میں جذب ہوگئے تھے۔ ملخصاً (النور۔ ص ۴۹، مطبوعہ علی گڑھ ولاہور و بمبئی۔ النور کی اشاعتِ جدید بنام "موالات ومعاملات کا شرعی حکم۔ مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء)

"جذب" کے اسی عالمِ رستاخیز میں علی برادران (مولانا محمد علی جوہر ومولانا شوکت علی) حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چوں کہ آپ اہل سنت و جماعت کے پیشوا ومقتدیٰ تھے اس لئے کسی نہ کسی حیلے بہانے سے آپ کی حمایت اور تائید ضروری سمجھی جاتی تھی۔

علی برادران نے چاہا کہ آپ کی حمایت حاصل کرلیں۔ اس طرح ہماری آواز کا وزن کچھ اور بڑھ جائے گا۔ بلکہ ہم پوری قوت کے ساتھ اپنے مطالبات منواسکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ ہماری تحریک خلافت وغیرہ کا ساتھ دیں۔ جس کا جواب آپ نے اس طرح عنایت فرمایا: "مولانا! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے۔ آپ "ہندو مسلم اتحاد" کے حامی ہیں۔ میں

مخالف ہوں۔

اس جواب سے علی برادران کچھ کبیدہ خاطر ہوئے تو آپ نے تالیفِ قلب کے لئے مکرر ارشاد فرمایا: ''مولانا! میں ملکی آزادی کا مخالف نہیں۔ ''ہندو مسلم اتحاد'' کا مخالف ہوں۔

علی برادران کی یہ ملاقات اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ کیوں کہ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی جوش سے زیادہ ہوش کے قائل تھے اور انھیں کسی طرح یہ گوارہ نہ تھا کہ مسلمان جذبات کی رو میں آکر اپنے ملّی تشخص سے دستبردار ہو کر غیروں کی گود میں چلے جائیں اور ایک دشمن کے زیر کرنے کی فکر میں دوسرے دشمن کے شکار ہو جائیں۔ جیسا کہ ان کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں اور زمانۂ مابعد نے ان کا موقف سچ کر دکھایا کہ مسلمانوں نے اپنے شعائر کی توہین کی۔ قشقے کھنچوائے۔ جے جے کار کی اور غیر مسلموں کو مسجدوں میں لا کر انھوں نے خود دعوتِ تقریر دی۔ **العیاذ باللّٰہ۔**

اس بحث کے آخر میں یہ حقیقت افروز اور چشم کشا تأثر و تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا سید سلیمان اشرف سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک حاضر باش فیض یافتہ اور اردو کے مشہور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی اس دور کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(یہاں یہ بات واضح رہے کہ سید سلیمان اشرف نے ''النور'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۹۲۱ء ہی میں انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی اور تحریکِ خلافت و تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں سید سلیمان اشرف کا وہی موقف تھا جو امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا تھا۔)

''۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ نان کوآپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے۔ ''گائے کی قربانی'' اور ''موالات'' پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اس زمانہ کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا؟ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی۔

کالج (علی گڑھ) میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم (سید سلیمان اشرف) مطعون ہو رہے تھے لیکن چہرہ پر کوئی اثر نہ تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔ سیلاب گذر گیا۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم (سید سلیمان اشرف) نے اس عہدِ سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔ سارے عُلما سیلاب کی زد میں آچکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ قائم تھے۔
(گنجہائے گراں مایہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی۔ از پروفیسر رشید احمد صدیقی)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مواقع پر خود امام احمد رضا بریلوی نے کیا عملی اقدامات کیے؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی (وصال ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء) کی یہ تحریر دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔

"آج (۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) سے برسوں پہلے جنگ بلقان (۱۲۔۱۹۱۱ء) کے موقعہ پر انھوں (مولانا احمد رضا بریلوی) نے سلطنتِ اسلامی و مظلومین مسلمین کی اعانت و امداد کی مناسب و صحیح شرعی تدابیر لوگوں کو بتائیں۔ عام طور پر شائع کیں۔ قولاً و عملاً ان کی تائید کی۔ خود چندہ دے کر عوام کو اس کی طرف رغبت دلائی۔ اور اب بھی لوگوں کو صحیح مفید شرعی طریقے اعانتِ اسلام و مسلمین کے بتاتے رہے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب جو عملی کوشش کر سکتے تھے انھوں نے کیں۔ خود چندہ دیا اور اپنے زیر اثر لوگوں سے دلایا۔ مسلمانوں کو اسلامی سلطنت کی امداد و اعانت پر توجہ و رغبت دلائی۔ تحفظِ سلطنتِ اسلامی کی مفید و کارگر تدابیر بتائیں۔ یہ عملی کوشش نہیں تو کیا ہے؟ (ص:۱۲۔ برکاتِ مارہرہ مہمانانِ بدایوں۔ مطبوعہ حسنی پریس بریلی از اولادِ رسول سید محمد میاں قادری برکاتی مارہروی)

اس بحث کے آخر میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا یہ بیانِ ہدایت نشان بھی دوبارہ ملاحظہ فرمائیں:

"آؤ! اب تمھیں قرآن عظیم کی تصدیقِ دکھائیں اور ان کی طرف سے اس میل اور میل کا راز بتائیں۔ دشمن اپنے دشمن سے تین باتیں چاہتا ہے۔ (۱) اول: اس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔

(۲) دوم: یہ نہ ہو تو اس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔(۳) سوم: یہ بھی نہ ہو سکے تو اخیر درجہ اس کی بے پَرِی کہ عاجز بن کر رہے۔

مخالف نے یہ درجے ان پر طے کر دیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، خیر خواہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔

(۱) اولاً:— جہاد کے اشارے ہوئے، اس کا کھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا ہونا تھا۔

(۲) ثانیاً:— جب یہ نہ بنی تو ہجرت کا بھرّا دیا کہ کسی طرح دفع ہوں۔ ملک ہماری کبڈیاں کھیلنے کو رہ جائیں۔ یہ اپنی جائدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں یا یوں ہی چھوڑ کر جائیں۔ بہر حال ہمارے ہاتھ آئیں۔ ان کی مساجد، مزاراتِ اولیاء ہماری پامالی کو رہ جائیں۔

جب یہ بھی نہ بنی (۳) ثالثاً ترکِ موالات کا جھوٹا حیلہ کر کے ترکِ معاملت پر ابھارا ہے کہ نوکریاں چھوڑ دو، کسی کونسل کمیٹی میں داخل نہ ہو، مال گذاری ٹیکس کچھ نہ دو، خطابات واپس کر دو، امرِ اخیر تو صرف اس لئے کہ ظاہر نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی مسلمان کے لئے نہ رہ جائے، اور پہلے تین اس لئے کہ ہر شعبہ اور محکمے میں صرف ہنود رہ جائیں۔ (المحجۃ المؤتمنۃ۔ مطبوعہ بریلی)

یہاں میں تاریخ ماضی کا ایک ورق الٹنا اور تاریخی اعتبار سے بھی قارئین کو یقین دلانا چاہوں گا کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے جو کچھ لکھا اس کی شہادت مذہب کے ساتھ تاریخ بھی دے رہی ہے کہ امام احمد رضا کا موقف مبنی بر حقیقت تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ (متوفی ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں:

''۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو قرار دی گئی تھی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تأمل ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی تأمل نہیں ہوسکتا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہے۔ یہ صوبہ ان دو شہروں سے گھرا ہوا ہے جو اردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی دہلی اور لکھنؤ۔ اس صوبہ کے ہندو عموماً اردو سے ایسے مانوس ہیں جیسے مسلمان۔ مگر حضرت تعصب وہ ذات شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ ''من بجہنم لیکن تختۂ یاراں تباہ گردد''۔ فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ

گارساں دتاسی جنھوں نے اردوزبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی وہ اس متنازعہ مسئلہ کی نسبت ایک لیکچر میں لکھتے ہیں۔ ''ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں، جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔''

اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوالِ سلطنت کے بطور اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں، مگر انھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہم وطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں۔ (ص ۱۴۴۔ حیات جاوید از خواجہ الطاف حسین حالی۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)

''اردو زبان جو در حقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی سے صرف کسی قدر اَسما اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کو موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقعہ تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ:

''اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے''۔ ان کا بیان ہے کہ ''انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔

آخر انھوں نے کہا کہ یہ پہلا موقعہ ہے کہ

میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا:

اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے اس سے زیادہ مخالفت وعناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا کہ:

اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا:

مجھے بھی نہایت افسوس ہے، مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔" (ص:١٤١۔ حیات جاوید از خواجہ حالی۔ مطبوعہ نئی دہلی)

"مارچ ١٨٩٨ء میں جس کی ستائیسویں کو سر سید نے دنیا سے رحلت کی، حضور سر مکڈانل لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے اور معزز سر برآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گذرا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ اس زمانہ میں سر سید پر ہجومِ رنج والم کے سبب ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقشِ دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ١٩/مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سر سید کی وفات سے نو دن پہلے شایع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہٰ آباد میں اردو کی حمایت کے لئے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ اگرچہ اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا، لیکن جہاں تک ممکن ہو گا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔

ان کو یقین ہو گیا تھا کہ:

ہندوؤں کا یہ کام در حقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے، اس لئے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔ (ص:١٤٢۔١٤٣۔ حیات جاوید از خواجہ حالی، مطبوعہ نئی دہلی)

ہندو مسلم اتحاد کے مضر اثرات سے عاجز آکر چند سال بعد ہی مولانا محمد علی جوہر و مولانا حسرت موہانی وغیرہ نے جو موقف اختیار کیا اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی (کراچی) فرزندِ مولانا عبد الباری فرنگی محلی لکھنوی نے جو راہ اختیار کی، اس سے اہل علم واصحابِ مطالعہ اچھی طرح واقف

گویا عملی طور پر ان حضرات نے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے موقف پر مہرِ تصدیق ثبت کردی کہ ''ہندو مسلم اتحاد'' کا خواب ایک سَراب اور فریب کے سوا کچھ نہیں اور اس سے اصولِ شریعت وشعائرِ اسلام کی جو پامالی ہوئی ہے وہ اہلِ اسلام کے حق میں نہایت خطرناک اور تباہ کن ہے۔ رفتہ رفتہ حقائق سے پردے اٹھتے رہے اور دوسرے حلقے بھی آپ کی مومنانہ بصیرت کے قائل ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی ہند کے افکار ونظریات کا ایک ترجمان ماہنامہ الحسنات رام پور لکھتا ہے:

''احمد رضا خاں کے آخری دور میں سیاست نے ایک نیا رُخ اختیار کرلیا تھا۔ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا اور دوسرے ہی سال ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کا آغاز ہوا۔ احمد رضا خاں نے اس سے اختلاف کیا اور ایک رسالہ المحجة الموتمنه فی آیةِ الممتحنة (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے کفار ومشرکین سے اختلاط اور ان کے ساتھ سیاسی اتحاد کے خطرناک نتائج کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے معتقدین نے ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اس کے بعد آل انڈیا سنی کانفرنس کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی جس کا دوسرا نام ''جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ'' رکھا گیا۔ اس کے ایک اہم رکن اور بانی نعیم الدین مرادآبادی (۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) تھے، جو احمد رضا خاں کے خلیفہ تھے۔ سیاست کے اس نازک دور میں وہ جوش وخروش سے زیادہ سلامت روی کو مسلمانوں کے لئے مفید سمجھتے تھے۔ (شخصیات نمبر، ماہنامہ الحسنات، رام پور ۱۹۷۹ء)

خلاصۂ کلام: مذکورہ تمام دینی وفکری مسائل ومباحث اور سیاسی تنظیموں، تحریکوں کے افکار ونظریات اور ان کی سرگرمیوں پر حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے شرعی موقف اور آپ کے شرعی احتساب ومؤاخذہ کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد ہر انصاف پسند انسان مندرجہ ذیل نتائج سے مکمل طور پر اتفاق کرے گا کہ مردِ حق آگاہ فقیہِ اسلام امامِ اہلِ سنت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہ (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء)

(۱) ہر اس فتنہ کے زبردست مخالف تھے جس سے اسلام وایمان کو کچھ بھی خطرہ لاحق ہو۔

(۲) متوقع خطرات کو پہلی ہی نظر میں اپنی مومنانہ بصیرت کے ذریعہ بھانپ لیا کرتے تھے۔

(۳) جدید افکار و تحریکات کے سبھی گوشوں کو مدِ نظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ فرماتے اس لئے آپ مدت العمر اپنے موقف پہ جبلِ مستقیم کی طرح جمے رہے اور کبھی آپ کو بعض دیگر اصحابِ علم اور دانشورانِ قوم وملت کی طرح تبدیلیِ رائے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

(۴) آپ کے فیصلے وقتی جذبات اور عارضی اسباب و محرکات کی نذر نہیں ہوئے بلکہ آپ کی ہر بات اور ہر قدم سنت کی اقتدا اور شریعت کی اطاعت و اتباع کی راہ پر تاحیات گامزن رہا- آپ نے دینی و مذہبی فکر و مزاج کے ساتھ استقلال و استقامت کا ہمیشہ ثبوت دیا اور ان سے ایک لمحہ کے لئے بھی انحراف نہیں کیا۔ کیوں کہ تمسّک بالدین اور استقامت علیٰ الحق آپ کا جوہرِ امتیاز تھا۔

(۵) بعض اوقات اپنے جذبۂ دینی کے تحت آپ نے از خود پیش قدمی کر کے گمراہیوں کی نشان دہی فرمائی اور اصلاحی کوششوں کے باوجود جب مخالفین کا اپنے رویہّ پر ضد اور اِصرار بڑھا تب ہی آپ نے ان کے خلاف کوئی شرعی فتویٰ صادر فرمایا۔

(۶) آپ کی زندگی میں جلالِ فاروقی کا جلوہ صاف عیاں ہے۔ کیوں کہ باطل تحریکوں کے مقابلے میں آپ نے ذرا بھی رُو رعایت سے کام نہ لیا۔ بلکہ صف شکن مجاہد کی طرح آپ کی شمشیرِ خاراشگاف قہرِ الٰہی بن کر دشمنوں کے سر پہ ہمیشہ لٹکتی رہی۔

(۷) دینی مسائل اور ملکی معاملات پر آپ واضح فکر کے حامل تھے اور مسئلہ کے ہر پہلو پر آپ کی گہری نظر رہا کرتی تھی۔

(۸) تحریکوں، تنظیموں کے نمائندے آپ سے ملاقات کر کے یا کسی طرح آپ سے رابطہ قائم کر کے آپ کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرتے لیکن آپ نہایت بصیرت و احتیاط سے کام لیتے ہوئے وہی کہتے جس کی شریعتِ مطہرہ اجازت دیتی۔

(۹) اپنے عہد کے مشاہیر علما و مشائخِ کرام سے آپ کے دوستانہ مراسم اور قریبی تعلقات تھے اور وہ لوگ آپ کی رائے کا نہایت احترام کرتے۔

(۱۰) مسلمانانِ اہل سنت اس وقت کے حالات کے پیش نظر مختلف تحریکات کے تعلق سے آپ کی بارگاہ میں ھدایت کے طالب ہوتے اور آپ ان کی صحیح رہنمائی کرتے ہوئے ہمیشہ حق و صواب کی راہوں سے آشنا کرنے اور سلامت روی اختیار کرنے کی آپ انہیں ہدایت دیتے۔

(۱۱) آپ نے جادۂ حق و اعتدال سے منحرف خیالات ونظریات اور باطل تحریکات سے اختلاف پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عملی طور پر ان کی اصلاح کی مخلصانہ کوشش کی اور نئے ماحول میں کام کرنے کے طریقے بھی بتائے۔

(۱۲) خدمتِ قوم وملت کے لئے عملی طور پر ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' (تشکیل در ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء) قائم فرمائی جس نے متعدد محاذوں پر قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔

(۱۳) مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشی ہر محاذ پر آپ کی ہدایات سے قوم مستفید ہوئی۔

(۱۴) آپ کی حق گوئی و بے باکی اور تبلیغ وہدایت سے ایک عالم متاثر ہوا۔ نہ جانے کتنے گم گشتگانِ راہ منزلِ مقصود تک پہنچے اور فلاح وسعادت سے ہم کنار ہوئے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے جذباتِ صادقہ وخدماتِ جلیلہ ومساعیِ جمیلہ کے مفید نتائج برآمد ہوئے اور ہنگامی وبحرانی حالات کے تحت جن حضرات کے قدم شریعت کی راہ سے ڈگمگا گئے تھے، ان میں سے باتوفیق لوگوں کو رب تعالیٰ سے اپنے جرم وخطا اور غفلت وتقصیر کی معافی اور اس کی بارگاہ میں توبہ واستغفار کی سعادت حاصل ہوئی۔ چنانچہ تحریک خلافت کے روح رواں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی رجب ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) جن سے آپ کی طویل مراسلت ہوئی تھی اور آپ نے حسبِ حکمِ شرع ان سے توبہ ورجوع کا مطالبہ فرمایا تھا جس کے بعد انھوں نے اپنا حسب ذیل توبہ نامہ شائع کیا۔

''میں نے بہت گناہ دانستہ کیے اور بہت سے نادانستہ، سب سے توبہ کرتا ہوں۔ اے اللہ! میں نے جو امور قولاً وفعلاً وتحریراً وتقریراً بھی کیے۔ جن کو میں گناہ نہیں سمجھتا تھا۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب نے ان کو کفر یا ضلال یا معصیت ٹھہرایا۔ ان سب اور ان کے مانند امور سے جن میں میرے

مشائخ اور مرشدین سے میرے لئے کوئی قائدنہیں ہے، محض مولوی صاحب موصوف پر اعتماد کر کے تو بہ کرتا ہوں۔ اے اللہ! میری توبہ قبول کر۔ فقیر عبدالباری عفی عنہ۔ (ص:۳۰۔ مطبوعہ ہمدم لکھنو، جمعہ ۱۱ر رمضان ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۰ر مئی ۱۹۲۱ء)

مولانا محمد جلال الدین قادری (تحصیل کھاریاں ضلع گجرات، پنجاب، پاکستان) اپنی کتاب ''محدثِ اعظم پاکستان'' میں (از ص:۱۰۵ تا ۱۰۷۔ جلد اول۔ مکتبہ قادریہ لاہور ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء) لکھتے ہیں:

''اس سلسلے کا ایک واقعہ یوں ہے۔ جب نجدیوں نے مدینہ منورہ پر بم باری کی تھی اور مقابر و مآثر کے انہدام کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس وقت لکھنؤ میں ''خدام الحرمین'' کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی تھی، جس کے سربراہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء) علیہ الرحمہ تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں بہت زیادہ اضطراب و ہیجان تھا۔ حرمین شریفین کی حفاظت وصیانت کے لئے ایک بڑا اجتماع لکھنؤ میں بلایا گیا۔ اس میں بریلی سے جماعت رضائے مصطفیٰ کا علماء پر مشتمل وفد زیر قیادت حضرت حجۃ الاسلام (مولانا حامد رضا قادری بریلوی) لکھنؤ پہنچا۔ وفد کے حضرات یہ تھے: حضرت حجۃ الاسلام، حضرت مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی، حضرت مولانا سید محمد میاں مارہروی، حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی اور حضرت مولانا حشمت علی خاں لکھنوی، و دیگر علما و اراکین جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اپنے مالدار رؤسا مریدین و معتقدین کے ہمراہ حضرت حجۃ الاسلام کے شاندار استقبال کا اہتمام کیا۔ جب حجۃ الاسلام ٹرین سے اتر رہے تھے تو مولانا عبدالباری نے مصافحہ کی کوشش کی مگر آپ نے ہاتھ روک لیا اور مصافحہ نہ کیا۔ بلکہ فرمایا:

''مصافحہ ہوگا مگر پہلے وہ مسئلہ شرعی طریقے سے طے ہو جانا چاہیے جس کی وجہ سے ہماری اور آپ کی علیحدگی ہوئی ہے۔ مسئلہ کے طے ہونے تک آپ کے ہاں قیام نہ کروں گا۔ میرے ایک دوست یہاں پر ہیں، ان کے ہاں میرا قیام ہوگا۔'' یہ واقعہ ایک عظیم استقبال کے موقعہ پر ہوا۔ مولانا

عبدالباری فرنگی محلی ناکام واپس آ گئے۔ ان کے لئے یہ صورتِ حال انتہائی ناگوار تھی۔

اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے دور میں مولانا عبدالباری ہندو لیڈر گاندھی سے بہت متأثر ہوئے۔ اسی دور میں ان سے کچھ ایسے کلمات و حرکات صادر ہوئے، جو ایک مسلمان کی شان کے خلاف تھے۔ امام احمد رضا نے انہیں توجہ دلائی کہ آپ ان کلمات سے توبہ کریں۔ دونوں حضرات کے درمیان مراسلت (الطاری الداری لھفوات عبدالباری کے نام سے مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی نے اس مراسلت کو مرتب کر دیا تھا، جس کی اشاعت ۱۹۲۰ء ہی میں جماعت رضائے بریلی کی طرف سے ہوگئی تھی) جاری رہی مگر معاملہ (پہلی توبہ کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے کچھ ایسے اعمال و افعال سرزد ہو گئے تھے، جو قابلِ مواخذۂ شرعیہ تھے) طے نہ ہو سکا۔ اس بناء پر عُلمائے اہل سنت اُن سے خوش نہ تھے۔

مولانا عبدالباری کی ناگواری دیکھ کر حضرت صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی اور مولانا عبدالقدیر بدایونی ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ:

مولانا! آپ کو ناگوار نہ ہو، اس میں ناراضی کی کوئی بات نہیں۔ چوں کہ امام احمد رضا کا شرعی فتویٰ آپ کے خلاف موجود ہے۔ آپ نے ان کے انتباہ کے باوجود اپنی غیر شرعی حرکات سے (بالکلیہ) رجوع نہیں کیا۔ اس لئے حضرت حجۃ الاسلام نے اس شرعی ذمہ داری کی بنا پر، محض دین کی خاطر ایسا کیا ہے۔ اگر انہیں دنیا رکھنی منظور ہوتی تو لکھنؤ میں آپ کی وجاہت اور آپ کے ساتھیوں کی کثرت دیکھ کر ضرور آپ سے مصافحہ فرما لیتے مگر انھوں نے اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہ کی بلکہ شرعی فتویٰ کا احترام کیا اور حکم شرعی پر علانیہ عمل کر کے دکھایا ہے۔

حضرت صدر الافاضل کی اس تقریر پُر تاثیر کا مولانا عبدالباری پر گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے اس سے متاثر ہو کر نہایت اخلاص سے توبہ نامہ تحریر فرما دیا۔

جب یہ ''توبہ نامہ'' حضرت حجۃ الاسلام، حضرت مفتی اعظم اور ان کے رفقاء کے پاس پہنچا، تو اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سب کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلکنے لگے۔ ادھر مولانا

عبدالباری نے فوراً کاروں کا اہتمام فرمایا اور حجۃ الاسلام و مفتی اعظم اور ان کے رفقاء کو نہایت محبت و احترام کے ساتھ اپنے دارالعلوم میں لائے۔

اس موقعہ پر جب حضرت حجۃ الاسلام اور مولانا عبدالباری کا آپس میں مصافحہ و معانقہ ہوا تو وہ منظر نہایت ہی پر کیف، ایمان افروز اور قابلِ دید تھا۔ حضرت حجۃ الاسلام کی استقامت علیٰ الشریعت، حضرت صدرالافاضل کی پر خلوص مساعی اور مولانا عبدالباری کی للٰہیت نے مل کر ایک عجیب نورانی سماں باندھ دیا۔ بعدازاں مولانا عبدالباری کے زیرِ اہتمام محفل میلاد ہوئی۔ حضرت حجۃ الاسلام کے ہمراہ دارالعلوم منظر اسلام، بریلی کے طالب علم (جو بعد میں شیخ الحدیث بنے) مولانا محمد سردار احمد بھی تھے۔ حضرت حجۃ الاسلام کے ارشاد پر حضرت شیخ الحدیث نے مولانا عبدالباری کی خدمت میں فتاویٰ رضویہ کی جلد اوّل پیش کی، جسے مولانا عبدالباری نے نہایت مسرت و احترام کے ساتھ قبول کیا۔ (ص ۷ ہفت روزہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ پنجاب، پاکستان۔ شمارہ ۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ و مکتوب مولانا تقدس علی بریلوی متوفی ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء بنام محمد جلال الدین قادری۔ محررہ یکم صفر المظفر ۱۴۰۷ھ)

ابوالفیض مولانا محمد عبدالحفیظ حقانی بریلوی مفتی شاہی جامع مسجد آگرہ (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء کراچی) لکھتے ہیں:

''میں خود فرنگی محل مدرسہ نظامیہ (لکھنؤ) کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔ حضرت مولانا عبدالباری (فرنگی محلی) رحمۃ اللہ علیہ سے خاص طور پر شرح چغمینی پڑھی ہے۔ مگر زمانۂ تحریک خلافت میں کچھ باتیں ان سے سرزد ہوگئیں جن پر اعلیٰ حضرت (مولانا احمد رضا بریلوی) نے گرفت فرمائی۔ حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی نے فرمایا کہ اعلیٰ حضرت (مولانا احمد رضا بریلوی) رحمۃ اللہ علیہ نے آپ پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان باتوں سے توبہ کیجیے۔ چنانچہ صدرالافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش سے (مولانا عبدالباری نے) ایک تحریر دی۔

اس کے بعد حضرت مولانا حامد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود فرنگی محل (لکھنؤ) گئے۔ دونوں

میں مصافحہ و معانقہ ہوا۔ حضرت مولانا حامد رضا نے حضرت مولانا عبدالباری کے ہاتھ چومے، اس لئے کہ وہ صحابی کی اولاد ہیں۔ اس خوشی میں دارالشفاء (لکھنؤ) کی برفیاں آئیں۔ باقاعدہ فاتحہ ہوا اور تقسیم ہوئیں۔

اسی طرح علی برادران (مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی) بھی جو تحریکِ خلافت و ترک موالات کے نشہ میں چور تھے اور ان کی زبان و قلم سے بہت سے ایسے اقوال و افعال سرزد ہو چکے تھے جو شرعاً قابل مؤاخذہ تھے۔ ان کی تنبیہ، اتمام حجت اور خوف آخرت سے ہوشیار کرنے کے لئے حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے خلیفۂ ارشد صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہ (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) مولانا جوہر مرحوم کے سفرِ لندن سے پہلے ان کی قیام گاہ پر دہلی پہونچے اور ان کو اسلامی احکام سے روشناس کراتے ہوئے آخرت کے عذاب و خسران سے ڈرایا۔ مولانا جوہر صدرالافاضل مرادآبادی کی تبلیغ حق سے متاثر ہوئے اور ان کو گواہ بنا کر توبہ کی اور ان کے بھائی شوکت علی مرحوم نے بھی مرادآباد آ کر صدرالافاضل کے دست حق پرست پر توبہ کی۔ ''حیاتِ صدرالافاضل'' میں مولانا غُلام معین الدین نعیمی مرادآبادی (کراچی) نے یہ روایت درج کی ہے۔

ندوہ کے اجلاس بریلی کے موقعہ پر مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی جو ندوہ کے سرگرم رکن تھے اور بعد میں بھی اس سے ان کا کچھ تعلق رہا۔ وہ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے انتباہ پر ان کے نام یہ تحریر ۱۳۱۳ھ میں بھیجتے ہیں جو بشکل اشتہار اُسی سال چھپ چکی ہے۔

''اس میں شک نہیں کہ میں ندوہ کا حامی و رکن ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اپنی دیانت و عقیدہ کو خراب کر ڈالا۔ مخدوما! میں تو آپ کا ہم خیال ہوں۔ کابرأعن کابرٍ میں بلا تقیہ پکار پکار کر کہوں گا کہ ندوۃ العلماء کے الف لام سے مراد یہی علمائے اہل سنت ہونا چاہیے۔ نہ روافض و خوارج و نیچریہ و وہابیہ خَذَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُوفَکُون۔

آپ کا خادم: محمد سلیمان قادری چشتی از پھلواری شریف ۱۴/ شوال ۱۳۱۳ھ۔

حضرت مولانا مولوی سید شاہ ابوسلیمان محمد عبدالمنان قادری ابوالعلائی منعمی صدرالمدرسین مدرسہ عربیہ محمدیہ عظیم آباد (بہار) حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے فضائل بیان کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

''مجھ فقیر کو بھی ۱۳۳۹ھ کے موسم بہار میں زیارت کا موقع ملا۔ یوں تو عرصۂ دراز سے آپ کے رسائلِ مفیدہ وتحریراتِ انیقہ دیکھا کرتا تھا اور جزئیاتِ فقہیہ پر اعلیٰ حضرت (مولانا احمد رضا بریلوی) کو جوید طولیٰ حاصل تھا، اس کا قائل بھی تھا اور درحقیقت انہیں رسائل وتحریرات نے زیارت کا ولولہ بھی اس فقیر کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ بالآخر جب یہ فقیر درس نظامیہ کی تکمیل کر رہا تھا اور تعلیم کا آخری سال گذار رہا تھا، تو برسوں کی تمنائے دلی برآئی۔ بریلی شریف جانے کا اتفاق ہوا۔ طالب علمانہ شان سے اعلیٰ حضرت (مولانا احمد رضا بریلوی) کے مدرسہ میں پہنچا۔ حضرات اساتذہ سے ملاقاتیں کیں اور دلی تمناؤں کے اظہار کا موقع ہاتھ آیا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی، تو کہوں گا کہ جناب مولانا مولوی قاضی رحم الٰہی صاحب مدرس مدرسہ نے مجھے اعلیٰ حضرت کی خدمت فیض درجت میں پہنچایا اور میری پوری رہبری کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تحریک خلافت وترک موالات اپنے پورے شباب پر تھی اور جماعت کثیرہ ان تحریکوں میں شامل تھی۔ بناءً علیہ یہ فقیر بھی شدت کے ساتھ ان تحریکات کا حامی تھا۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی تحریروں نے جو وقتاً فوقتاً مجھے مل جایا کرتی تھیں اور جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب اور ابوالکلام (آزاد) کی باہمی گفتگو نے مجھے ان تحریکات سے برگشتہ کر دیا تھا اور ایک قسم کی دل میں خلش پیدا ہوگئی تھی جس نے بریلی شریف پہنچانے میں معاونت کی کہ اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو اور مسائلِ حاضرہ بھی سمجھ لوں۔ چنانچہ جیسا سنا کرتا تھا اور تحریروں سے معلوم کرتا تھا کہ علمی تبحر میں آپ کا کوئی ثانی نہیں اور اخلاقِ نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایک زندہ مثال ہیں۔ آپ کی زیارت نے بتمام وکمال فقیر پر یہ ثابت کر دیا کہ جو کچھ بھی آپ کی تعریفیں ہوئی ہیں، وہ کم ہیں۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ یہ فقیر سادات سے ہے، تو آپ نے بڑی عزت بخشی اور جملہ شکوک کو چند منٹوں میں اس طرح رفع فرمادیا، گویا کہ شکوک کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔

پھر اخلاق کا یہ عالم کہ دو دن مجھے آپ کے اخلاق کریمانہ نے روک رکھا اور ان دو دنوں میں اس فقیر نے بہت کچھ فیوض و برکات حاصل کیے۔ پھر رخصت ہوتے وقت خاص کرم فرمایا کہ کچھ نقد روپے جو الہ آباد کی آمد و رفت میں صرف ہو سکتے تھے، بلکہ کچھ زائد ہی تھے، مرحمت فرمائے۔ فقیر نے پہلے تو انکار کیا، لیکن اعلیٰ حضرت نے یہ فرمایا کہ یہ تو آپ کے گھر ہی کے عنایت کردہ ہیں، اسے لے لیجیے۔ تو فقیر نے وہ رقم لے لی اور واپسی کے بعد ان تحریکات سے کلیۃً علیحدگی اختیار کر لی۔ پھر بعد وصال اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ چند مرتبہ عرس اعلیٰ حضرت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بعد وصال بھی اعلیٰ حضرت کی روحانیت نے اپنے فیوض و برکات سے محروم نہ رکھا۔

وللّٰہ الحمد و الصلاۃُ و السلامُ علیٰ رسولہٖ الکریم. و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربِ العالمین.

(ص، ۲۲۹و۲۳۰ حیاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول، رضا اکیڈمی بمبئی، ۲۰۰۳ء)

○ ○ ○

پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی
سابق صدر شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور

⊙

نعت کی صنفی حیثیت

سچ یہ ہے اردو کی شعری اصناف میں نعت کی صنفی اور ادبی حیثیت اب تک واضح طور پر متعین نہیں ہو سکی ہے۔ ہر دور کے اکابرین شعر و ادب نے اس کی عظمت تو تسلیم کی ہے، مگر اس کو غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کی طرح ادبی حیثیت عطا کرنے میں کشادہ قلبی کا ثبوت فراہم نہیں کیا ہے۔ ویسے گاہے گاہے اس طرح کے اعترافات ملتے ہیں:

''نعت کی راہ شاعری کی سخت ترین راہوں میں سے ہے اور تمام اصناف شاعری میں سے مشکل ہے بقول عرفی آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم [1]

ڈاکٹر صابر سنبھلی لکھتے ہیں:

نعت گوئی اپنے آپ میں ایک مکمل صنف ہے اور اس کا میدان بھی وسیع ہے، لیکن اردو تنقید نگاروں نے جتنی بے اعتنائی اس صنف کی طرف سے برتی ہے، وہ قابل افسوس ہے۔ مانا کہ وہ ایک مخصوص حلقے کی چیز ہے، لیکن مرثیہ جس حلقہ سے تعلق رکھتا ہے، نعت کا حلقہ اس کے مقابلہ میں وسیع تر ہے۔ [2]

پروفیسر ابوالخیر کشفی کی صدائے احتجاج کچھ زیادہ ہی پُر زور اور توانا ہے۔

''کیا نعت گوئی کا رشتہ ہمارے جذبۂ عقیدت سے ہے یا نعت ایک ادبی صنف بھی ہے اور اگر یہ ادبی صنف ہے، تو اس کی شرائط اور تقاضے کیا ہیں اور نعت گو شاعر کو

شاعری کی تاریخ میں جگہ ملے گی یا محض اسے ایک گوشہ یعنی نعت کا شاعر قرار دیا جائے گا۔'' ۳ے

اب تک کی تازہ ترین صورت حال وہی ہے، جس کی کشفی صاحب نے اقتباس بالا کے آخری جملوں میں وضاحت کی ہے۔ یعنی نعت گو شاعر کو شاعری کی تاریخ میں جگہ دینے سے ہمارے ذمہ داران شعر وادب کترا رہے ہیں یا شرما رہے ہیں۔ اردو کے ممتاز و معتبر اہل قلم ڈاکٹر شجاعت سندیلوی ہمارے اس احساس میں برابر کے شریک ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان وادب کی تاریخ میں یہ فروگزاشت انتہائی افسوس ناک ہے کہ نعت کو ادبی اور فنی حیثیت سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ نہ تو ادب کے مورخین نے اس کی طرف توجہ کی، نہ اس کے متعلق شعوری طور پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔'' ۴ے

سندیلوی صاحب نے جس فروگزاشت کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ مولانا حالی نے اپنے شہرۂ آفاق ''مقدمۂ شاعری'' میں غزل، مثنوی اور قصیدے کی صنفی حیثیت پر کھل کر گفتگو کی ہے۔ ان کے معائب ونقائص کی نشاندہی بھی کی ہے اور کچھ اصلاحی مشورے بھی دیئے ہیں۔ لیکن نعت کا ضمناً تذکرہ کرنا بھی انہوں نے گوارا نہیں کیا، جب کہ خود بھی کچھ نعتیں کہیں ہیں۔

اسی طرح اردو کے ممتاز نقاد کلیم الدین احمد نے اپنی ہنگامہ خیز تصنیف ''اردو شاعری پر اک نظر'' کے دونوں حصوں میں تمام اصناف سخن کا ناقدانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہجویہ شاعری اور اس طرح کی دوسری خرافاتی شاعری پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے، لیکن نعت کا تذکرہ کرنے سے شعوری طور پر گریز کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اس حمام میں ان کے تمام معاصر ناقدین بے لباس ہیں اور بعد والوں کو بھی انہی لوگوں کی تقلید جامد میں اپنی ادبی زندگی کی خیریت نظر آئی۔

ایسا کیوں ہوا! اس کی تہہ میں جانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس کی ہیئت کے تعلق سے سوال اٹھاتے ہیں کہ غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی کی اپنی ایک ہیئتی شناخت

ہے، مگر نعت کی کون سی ہیئت ہے؟ اس کا ایک سامنے کا اور سیدھا سا جواب یہ ہے کہ قسام ازل نے نعت کو کسی مخصوص ہیئت کا پابند ہونے کے بجائے تمام شعری اصناف کی ہیئتوں میں ڈھل جانے کی فطری صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل، مثنوی، قصیدہ اور رباعی کی ہیئتوں میں شروع ہی سے یہ لکھی جارہی ہے۔ لیکن غزل کا روپ رنگ اس کو کچھ زیادہ پسند آیا ہے، اس لیے اس ہیئت میں نعتوں کا وافر ادبی سرمایہ ملتا ہے۔ پھر یہ کہ نعت کا موضوع ممدوح کائنات رحمت للعالمین حضور سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ قدسی صفات ہے۔ جب وہ عالمین کی رحمت ہیں، تو ان کی مدح گستری کے لیے تمام شعری اصناف کی آغوش وا ہونا ہی چاہیے۔ اصل چیز ادبی محاسن اور شعری لطافت ہے، جو کسی فن پارے کو حیات دوام عطا کرتی ہے اور اس میں دلکشی ورعنائی کے رنگ بھرتی ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو اردو کے نعتیہ سرمایہ میں فکروفن کے گلشن کھلتے نظر آتے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ ۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگان اٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھایئے

اس پر دوسرا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ نعتیہ شاعری میں چونکہ عقیدت کی فراوانی ہوتی ہے اور جس شاعری میں عقیدہ وعقیدت کی کامل دخل ہو وہاں شعری حسن کا برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر شاعری فکر منظوم کا سپاٹ نمونہ بن کر رہ جاتی ہے۔ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ: ع تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیے

میں ذیل میں اردو کے کچھ مشاہیر نعت گو شاعروں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں پوری ادبی دیانت داری کے ساتھ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے، تو نگاہِ نقد ونظر مایوس نہیں ہوگی اور قدم قدم پر اس کو ادبی اور شعری جمال وجلال کے نظر افروز جلوے اور چشم کشا مناظر نظر آئیں گے، وہ شعراء ہیں، حضرت رضا بریلوی، علامہ حسن بریلوی، حضرت محسن کاکوروی، غلام امام شہید، حضرت بیدم وارثی، حمید صدیقی لکھنوی، مولانا ضیاء القادری بدایونی، بیکل اتساہی،

مولانا شبنم کمالی، پروفیسر طلحہ رضوی برق۔ شکیل بدایونی، قتیل شفائی، راز الہ آبادی۔ اجمل سلطانپوری، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، حفیظ تائب وغیرہ۔ یہاں ناموں کی کھتونی مقصود نہیں، ورنہ فہرست اور طویل ہوسکتی ہے۔ان تمام شاعروں میں فکر بلند اور فن لطیف کے اعتبار سے سب سے عمدہ اور معیاری کلام حضرت رضا بریلوی کا ہے، جو مندرجہ بالا اعتراض پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے بطور تحدیث نعمت فرماتے ہیں:

جو کہے شعر و پاس شرع دونوں کا حسن کیوں کر آئے
لا اسے پیش جلوۂ زمزمۂ رضا کہ یوں

نعتیہ شاعری کی طرف سے بے التفاتی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ناقدین کی اکثریت کا دینی مطالعہ محض سرسری اور سطحی ہے۔نعت کے تمام مضامین قرآن و حدیث اور تاریخ و سیَر کی کتابوں سے ماخوذ ہوتے ہیں اور یہ وہ راستہ ہے، جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا۔اس لیے ناقدین شعر و ادب نے اس بحرِ ذخار میں غواصی کا خطرہ مول لینے سے بہتر یہ سمجھا کہ عافیت ساحل میں ہے۔اس سلسلہ میں کچھ ٹھوس مثالیں فراہم کی جارہی ہیں، تاکہ دعویٰ بلا دلیل نہ رہ جائے۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی شعر فہمی کی غلطی ناقدین کو غلط نتائج پر پہنچا دیتی ہے۔یعنی شعر تو قرآن و احادیث کی روشنی میں بالکل ٹھوکا بجایا ہوتا ہے، لیکن قاری یا ناقد کا علم و فہم ہی ناقص و محدود ہوتا ہے۔اس لیے وہ شعر کی غلط تاویل و تشریح کر کے شاعر کو طنز و طعن کا نشانہ بنا دیتا ہے۔اس سلسلے میں جناب ظہیر غازی پوری کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

”مگر نعتیہ شعر و ادب کا مطالعہ کرتے وقت اکثر جگہوں پر نظر رکتی ہے، بعض افکار کو ذہن قبول نہیں کرتا۔کہیں کہیں اپنی کم علمی یا بے بساطی کا بھی گمان گزرتا ہے۔“ ۵

اس اقتباس کا آخری ٹکڑا بڑا اہم اور بڑے دیانتدارانہ احساس پر مبنی ہے۔واقعی بعض لوگ اپنے مطالعے کی محدودیت اور نارسائی کا اعتراف کر لینے کے بجائے جوش انتقاد میں احتیاط کی حدوں سے گزر جاتے ہیں۔اس مقام پر شمس بریلوی کی یہ دلچسپ تحریر ملاحظہ ہو:

''عوام کے ذہن جب کسی ایسی عالمانہ تلمیح کی تصریح وتشریح سے قاصر رہتے ہیں، تو اپنے علمی افلاس کو چھپانے کے لیے کہہ اٹھتے ہیں کہ جناب شعر بے معنی ہے۔ خود میرے ساتھ ایک ایسا ہی معاملہ اس تلمیح کے سلسلے میں گزرا ہے کہ میں نے ایک شعر کہا اور اس میں ایک مذہبی تلمیح کو استعمال کیا۔ شعر یہ تھا:

اب زمانے میں کریں ہم شمس کس پر اعتماد
اک عصا نے فاش سب راز سلیماں کر دیا

اس تلمیح کو جو حضرت سلیمان کے عصا سے تھی، جس پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے تھے اور جس روز ہیکل سلیمان جنات نے مکمل کی اس روز یہ عصا جس کو ایک عرصے سے دیمک لگ گئی تھی، ٹوٹ کر گر پڑا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا جسد خاکی زمین پر آ گیا اور اس وقت تمام جنات کو معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام واصل بحق ہو چکے ہیں۔ میرے شعر کو جناب سیماب اکبر آبادی نے مہمل قرار دیا کہ ان کو صرف عصائے موسیٰ علیہ السلام یاد تھا اور عصائے سلیمان علیہ السلام سے وہ ناواقف تھے۔'' [6]

اب آئندہ صفحات میں اسی طرح کی عدم واقفیت کی ایک اور افسوسناک مثال ملاحظہ ہو:

اردو کے مشہور وممتاز نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اقبال ایک مطالعہ'' میں اقبال کی غزلوں کا محاسبہ کرتے ہوئے ان کے اشعار تین حصوں میں نقل کیے ہیں۔ تیسرے حصے میں یہ اشعار رکھے ہیں:

عجب کیا گر مہ وپرویں میرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا، فروغ وادی سینا
نگاہ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

''عموماً مفسرین وانا اول المسلمین کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس امت محمدیہ کے اعتبار سے آپ اول المسلمین ہیں، لیکن جب جامع ترمذی کی حدیث کنت نبیا وآدم بین الروح والجسد کے موافق آپ اول الانبیاء ہیں، تو اول المسلمین ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ (صفحہ ۲۰۰)

اس بحث کو میں مشہور ادیب ناقد جناب ابوالخیر کشفی کی اس رائے پر ختم کرتا ہوں، وہ لکھتے ہیں:

''اکثر ذہنوں میں اول وآخر سے خلش ہوتی ہے۔ لیکن یہ الجھن ہماری پیدا کردہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلق میں اول ہیں اور رسالت میں آخر۔'' ۱۰

اب اہل نظر غور فرمائیں کہ اقبال نے نعتِ رسول میں غلوئے عقیدت سے کام لیا ہے یا خود ناقد محترم کی چشم غلط بیں کا فساد ہے۔ کلیم صاحب کے اعتراضات کی فہرست بہت طویل ہے۔ مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں آپ ان کے دینی مطالعے کی سطحیت اور محدودیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

ع۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ان حقائق وشواہد کی روشنی میں امام احمد رضا فاضل بریلوی (حضرت رضا بریلوی) کے نعتیہ کلام کا ایماندارانہ جائزہ لیا جائے، تو خالص ادبی اور فنی لحاظ سے بھی ان کے نعتیہ اشعار اردو کے ممتاز ومایہ ناز غزل گوشاعروں کے اشعار سے بہتر وبرتر نظر آئیں گے۔ لیکن افسوس آج تک کسی نے اس متاع گراں بہا کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس کی ایک امکانی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے، جس کی طرف اردو کے ممتاز جدید نقاد ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

''پچھلے دنوں ایک نجی محفل میں ایک بزرگ نقاد نے کسی تازہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''میرے لیے اس کتاب کو پسند کرنا ناممکن ہے، اس لیے کہ یہ تو میرے عقائد ہی کے خلاف ہے''۔ اور میں سوچنے لگا کہ ادب کی پرکھ کے سلسلہ میں عقیدہ کو کسوٹی مقرر کیا

جائے تو کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ [۱۱]

من وعن یہی بات مشہور محقق جناب کالیداس گپتا رضا نے کہی ہے ملاحظہ ہو:

''تقریباً ربع صدی کے افریقہ کے قیام کے بعد مجھے ہندوستان پلٹے کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ اس لیے جناب مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کا نام اور کام سے بھی میری واقفیت چند ہی دنوں کی ہے، تاہم جب میرے ایک دوست اور عزیز اشتیاق احمد خان ادروی نے مجھے مولانا کی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں موسومہ حدائق بخشش (حصہ اول وحصہ دوم) برائے مطالعہ عنایت کیں، تو معلوم ہوا کہ اسلامی دنیا میں ان کے مقام بلند سے قطع نظر ان کی شاعری بھی اس درجہ کی ہے کہ انہیں انیسویں صدی کے اساتذہ میں برابر کا مقام دیا جائے۔ بے شک حسن بریلوی مرحوم نہایت اچھے شاعر تھے، تاہم حیرت ہے کہ اس ضخیم تذکرے میں ان کے بڑے بھائی ''عالم اہل سنت'' اور نعت گوئی میں ان کے استاذ جناب احمد رضا خان کے تذکرے نے جگہ نہ پائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خطا اس پاکیزہ مسلک کی بھی ہے، جس کے زیر اثر مولانا نے اپنی شاعری کو قطعاً نعتوں اور سلاموں ہی تک محدود رکھا اور باقاعدہ شاعری سے احتراز کیا۔ اس طرح عوام نے انہیں ایک شاعر کی حیثیت سے جانا ہی نہیں۔ تاہم نعتیں اور سلام ہی سہی ذرا سے غور وفکر کے بعد ان کے اشعار ایک ایسے شاعر کا پیکر دل ودماغ پر مسلط کر دیتے ہیں، جو محض ایک سخنور کی حیثیت سے بھی اگر میدان میں اترتا تو کسی استاد وقت سے پیچھے نہ رہتا۔ [۱۲]

اگر اردو تنقید امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری کے تعلق سے اب بھی سجدۂ سہو کر لیتی ہے، تو اس کے سر سے ایک بڑا الزام ٹل جائے گا۔

مراجع ومصادر:

۱ مولانا سید سلیمان ندوی، بحوالہ تقریظ گلبانگ حرم، از حمید صدیقی لکھنوی۔ص:۱۷

۲ ادبی تجزیہ مجموعۂ مضامین ڈاکٹر صابر سنبھلی۔صفحہ:۱۸۵

۳ مضمون مشمولہ جادۂ رحمت نعتیہ مجموعہ صبح رحمانی، صفحہ:۱۲

۴ حرف ادب از شجاعت سندیلوی، صفحہ:۱۴۶

۵ گلبن، احمد آباد کا نعت نمبر۔ص:۴۹

۶ کلام حضرت رضا کا تحقیقی وادبی جائزہ، صفحہ:۸۳

۷ اقبال ایک مطالعہ۔صفحہ:۱۷۹۔۱۸۰

۸ بحوالہ مدارج النبوہ، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی

۹ القرآن الکریم ترجمہ محمود الحسن۔۔۔۔

۱۰ نعت رنگ کراچی پاکستان، شمارہ ۹، صفحہ:۳۵

۱۱ تنقید واحتساب از ڈاکٹر وزیر آغاز، ۲۲ مشمولہ مضمون ادب کی پرکھ۔

۱۲ ماہنامہ المیزان، امام احمد رضا نمبر۔

○ ○ ○

ڈاکٹر واحد نظیر، دہلی

فنِ نعت گوئی

نعت بہ معنی تعریف، مصدر ہے اور اس کی جمع نعوت ہے۔ اصطلاح میں ایسی تعریف کو نعت کہتے ہیں جو ذاتِ رسول سے منسوب ہو۔ یہ نحو کی ایک اصطلاح بھی ہے جو صفت کے مترادف ہے۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نعت کہنے والے کو ناعت (نعت سے اسم فاعل) کہا ہے۔ لفظ نعت کو پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارکہ سے ادا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح باب ''اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم وصفاتہ ''میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا خدمت رسول میں حاضر ہوا کرتا تھا، بیمار ہوا، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر عیادت کو تشریف لے گئے۔ لڑکے کا باپ سرہانے بیٹھ کر تورات پڑھ رہا تھا، پیارے رسول نے اسے مخاطب کر کے فرمایا: یا یھودی انشدک باللہ الذی انزل التوراۃ علیٰ موسیٰ ھل تجد فی التورٰۃ نعتی وصفتی ومخرجی......''

ترجمہ: اے یہودی! میں تجھ کو اس خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں، جس نے حضرت موسیٰ پر تورات نازل فرمائی کہ کیا تو توارت میں میری نعت، میری صفت اور میرے مخرج کا تذکرہ پاتا ہے؟

یہودی نے تو نفی میں جواب دیا، لیکن اس کے لڑکے نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ میں تورات میں آپ کی نعت، آپ کی صفت اور آپ کے مخرج کا تذکرہ پاتا ہوں۔

اس حدیث پاک سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنے محبوب کی جو تعریفیں کیں، انہیں خود رسول نے نعت سے موسوم فرمایا ہے۔ وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کارِ مستحسن ہے، جس کے آغاز کو خدا کی ذات سے نسبت حاصل ہے۔ اردو کے معروف شاعر مرزا غالب نے اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے عجز بیان کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس ذاتِ مبارکہ کی تعریف خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمائی ہو، اس کی تعریف میں ایک عام انسان کس طرح کر سکتا ہے اور اگر کرے بھی تو اس کی کیا وقعت ہے؟ اس سوال کی روشنی میں یہاں میں دو نکات کی طرف اشارہ کروں گا۔ پہلا نکتہ یہ کہ اپنے محبوب کی تعریف خدا نے کی ہے اور انسان اللہ کا خلیفہ ہے، اس لیے نیابت کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان بھی رسول کی تعریف کرے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر دراصل اسے اپنے محبوب کی مدحت کے قابل بنا دیا۔ چوں کہ مدحتِ رسول، اصل یعنی خدا کی ذات سے ہو چکی ہے اس لیے نائب اس میں کوئی جدت یا اضافہ تو نہیں کر سکتا، بلکہ وہ محبوب خدا کی مدحت سرائی کر کے صرف اپنے اصل کی نیابت کا فریضہ انجام دینے کی سعادت ہی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ ان لوگوں کے دعوؤں سے تو شرمسار ضرور ہوتی رہی ہے، جنہوں نے کبھی خدا ہونے کا دعویٰ کیا اور کبھی نبوت پانے کے دعویدار ہوئے، لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ تاریخ کے کسی دور میں کسی نے مدحتِ رسول کا پورا پورا حق ادا کرنے کا دعویٰ کیا ہو۔ مولانا نعیم صدیقی کی مشہور تصنیف ''محسنِ انسانیت'' پر تقریظ لکھتے ہوئے مولانا ماہر القادری رقم طراز ہیں:

''کس کی مجال ہے، جو خلاصۂ کائنات، فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی مدحت سرائی اور سیرت نگاری کا حق ادا کر سکے۔ یہ غلط دعویٰ نہ کسی کی زبان سے نکل کر فضا میں پھیلا اور نہ کسی قلم نے اسے صفحۂ قرطاس پر ثبت کیا۔ اس بارگاہِ اقدس میں جس نے

بھی لب کشائی کی، تو اس کا مقصد حصولِ سعادت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔"
حصولِ سعادت کا یہی وہ پاکیزہ جذبہ ہے، جس سے سرشار ہو کر عہد نبوی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت کعب، حضرت کعب بن زہیر، حضرت کعب بن مالک، حضرت عبد اللہ بن رواحہ، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت عباس بن مرداس رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسے کبائرِ صحابۂ کرام نے اپنی زبان، قلم اور کاغذ کو مرہون نعت کیا۔ یہاں تک کہ ابو طالب اور میمون بن قیس اور اعشیٰ جیسے معاصرین رسول نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت میں خلوص سے کام لیا۔
رسول کی حیات ظاہری کے زمانے میں ایک بڑی تعداد ایسے شعرا کی بھی ملتی ہے، جو ایمانی دولت سے مملو تو نہیں تھے، لیکن ان کے مدحیہ اشعار سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اوصافِ رسول سے کس قدر متاثر تھے۔ عظمتِ رسول کے بالواسطہ اعتراف کا یہی وہ پہلو ہے، جو ہر زمانے میں معجزہ بن کر روشن ہوتا رہا ہے۔ ہر عہد، ہر ملک اور ہر مذہب میں پیارے مصطفیٰ کے مدحت سرا پیدا ہوتے رہے اور صبحِ قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ تفصیلات سے قطعِ نظر صرف ایک مثال کے ساتھ اس نکتے کو یہیں چھوڑتا ہوں کہ جرمن شاعر گوئٹے کی شہرہ آفاق نظم "نغمۂ محمدی" کا آزاد ترجمہ علامہ اقبال نے "جوئے آب" کے نام سے "پیامِ مشرق" میں شامل کیا۔
ظاہر ہے، یہ تمام باتیں نعت کی وسعت و مقبولیت کا ایک خام اشاریہ تو مرتب کرتی ہیں، لیکن ان سے موضوعِ نعت کی وسعت پر روشنی نہیں پڑتی۔ یوں تو نعت کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس کا تصور بھی محال ہے۔ مثال کے طور پر یہ اسلامی کلنڈر کا چودہ سو چھبیسواں سال ہے۔ آپ نے چودہ سو چھبیس (۱۴۲۶) لکھا تو یہ اعداد کا ایک مجموعہ ہے، لیکن جیسے ہی آپ نے اس پر ہجری کی "ھ" لگائی یہ اعداد کا مجموعہ نعت کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ چوں کہ یہ "ھ" صرف ایک حرف نہیں، بلکہ ہجرت رسول کے تاریخی واقعے کی علامت ہے۔ اسی طرح خدا خالق ہے یہ ایک حمدیہ جملہ ہے، لیکن جب آپ نے خدا کی خلاقی پر غور و فکر شروع کیا گویا موضوعِ نعت کے دروازے پر دستک دے دی۔ اس لیے کہ غور و فکر کے اگلے مرحلے میں ہی یہ حقیقت آپ کے

سامنے کھڑی ہوگی کہ اللہ کے خالق ہونے کا اعلان اس وقت تک نہ ہوا جب تک اس نے نور محمدی کی تخلیق نہیں فرمائی۔ موضوع کے حوالے سے یہ صرف اشارے ہیں اور ہمیں یہ کہنے دیجیے کہ یہ نکتہ فقط خالق ومخلوق تک ہی محدود نہیں، بلکہ ساجد ومسجود، عبد ومعبود اور اسمائے الٰہی کے تعلق سے بس پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔

نعت کے موضوع کی یہی وسعت اور حمد یہ موضوع سے قربت نعت گو شعراء کے لیے آسانیاں بھی فراہم کرتی ہے اور انہیں کڑی دشواریوں سے بھی روبرو کرتی ہے۔ آسانیاں اس طرح کہ موضوع کی گونا گونی شاعر کو احساس بے مائیگی کا شکار نہیں ہونے دیتی اور دشواریاں اس طرح کہ حمد یہ موضوع سے اس کی قربت شاعر کو سراپا محتاط رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ نازک مرحلہ ہے جہاں زبان وبیان کے شہسواروں کی رفتار تھم جاتی ہے۔ یہ مرحلہ ایسے پل صراط کے مانند ہے کہ ذرا سا غلو قاب قوسین او ادنیٰ کی حدوں کو توڑ کر الوہیت کے دائرے میں ڈال سکتا ہے اور ذرا سی تنقیص دنیا وآخرت کے تباہ وبرباد ہونے کی وجہ بن سکتی ہے۔ آیت قرآنی: لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی کا شانِ نزول ہمارے پیش نظر ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ نعت گوئی کے مرحلے اگر اس قدر دشوار گزار ہیں، تو ایسے شعراء، جن کے سینے میں عشق مصطفیٰ ٹھاٹھیں مار رہا ہو، کیا کریں؟ کیا اپنے جذبات اور قلبی واردات کو شعری پیکر میں ڈھالنے سے باز آجائیں؟ مدحتِ رسول اور ذکرِ رسول کو نظم کا پیکر نہ دیں۔ انہی پریشان کن سوالوں کا حل حضرت شرف الدین ابوعبداللہ محمد بن زید المعروف بہ امام بوصیری کے اس شعر میں پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دع ما ادعتہ النصاریٰ فی نبیھم
وحکم بما شئت مدحا فیہ واحتکم

ترجمہ: صرف وہ بات چھوڑ دو، جس کا دعویٰ نصرانیوں نے اپنے نبی کے بارے میں کیا ہے۔ اس کے بعد جو تمہارا جی چاہے، حضور کی مدح میں کہو اور جو حکم چاہو، لگاتے جاؤ۔

معلوم یہ ہوا کہ نعت گوئی کے لیے بیانِ مضمون کا ایک بڑا ادب، اسرائیلی روایات سے

احتراز ہے، اُس طور تفحص سے احتراز جس کا سفر تثلیث کی وادی تک پہنچا دیتا ہے۔ امام بوصیری کے اس شعر میں نعت کے موضوع کی تعیین بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ یہ درست ہے کہ مدحتِ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ممکنات اور اس کی حدیں انسان کی فکری دسترس سے باہر ہیں، لیکن یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ عہد نبوی سے تا حال ہر موزوں طبع عاشق رسول نے کچھ نہ کچھ نعتیہ اشعار ضرور کہے ہیں۔ ان اشعار کے موضوع کی دو قسمیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے، جس میں شاعر اپنے داخلی جذبات و کیفیات کو بارگاہ مصطفیٰ میں پیش کرتا ہے اور دوسری قسم وہ ہے، جس میں مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور اس کے متعلقات منظوم ہوئے ہیں۔ موضوع کی یہ تقسیم وسیع تناظر میں پیش کی گئی ہے، ورنہ ایمان کی بات یہ ہے کہ نعت میں پیش کیے گئے موضوعات کو عنوان دیا جائے، تو دفتر کے دفتر وجود میں آ جائیں۔

داخلی جذبات کے تعلق سے آرزو، استغاثہ، اظہار عشق و محبت یا قلبی واردات، مدینے سے جغرافیائی دوری کے احساسات جیسے موضوعات شامل ہیں۔ جب کہ حیات رسول اور سیرت وشمائل کے حوالے سے حالاتِ ماقبلِ ولادت، بشارت ولادت، ولادت باسعادت، رضاعت، یتیمی، نبوت، رسالت، خطابت، فصاحت، بلاغت، اخلاق، اوصاف، خصائل، معراج، ہجرت، غزوات، معاہدے شرافت، نجابت، سخاوت، شفقت، عدل، صداقت، امانت، للّٰہیت، انکساری، مزاج، حسن و جمال، گفتار، رفتار، تبسم، وضع، رخسار، گیسو، قد، ملبوسات، اسلوب، ماکولات، مشروبات، شجاعت، عزم و استقلال، شعر فہمی، نقد و تبصرہ، معجزات، دعوت نامے، خاندانی شرف، انبیا میں فضیلت، اہل وعیال وغیرہ۔ اسی طرح متعلقات میں گنبد خضریٰ، سنہری جالیاں، حریری پردے، سنگِ در اقدس، مدینہ منورہ کا جغرافیہ، اس کی تاریخ، بہار مدینہ وغیرہ نعت کے موضوعی عناصر ہیں۔

مقصدیت کے اعتبار سے نعت کا یک گونہ رشتہ صنفِ سے قائم ہوتا ہے۔ چوں کہ نعت میں رسول آخر الزماں کی تعریف مقصود ہوتی ہے اور قصیدے میں بادشاہ یا دیگر شخصیتوں کی تعریف۔ لیکن فنی تقاضے دونوں کے مختلف ہیں۔ قصیدے کا مزاج یہ ہے کہ غلو اور مبالغہ آرائی بسا

اوقات دروغ گوئی کی سرحدوں کو بھی چھونے لگتی ہے، پھر بھی اسے شاعر کے فنی کمال سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب کہ فنِ نعت گوئی اس کا متقاضی ہوتا ہے کہ حقیقت کے بیان میں یک سرمو فرق نہ ہونے پائے۔ علاوہ ازیں طمطراق، طنطنہ، شکوہِ لفظی اور زور بیان قصیدے کے فن کو حرارت بخشتے ہیں اور نعت میں یہی خصوصیات فنی نقص میں شمار ہو جاتی ہیں، چوں کہ نعت میں زور بیان نہیں، سنجیدگی اور متانت درکار ہوتی ہے۔ ''عرفی مشتاب ایں رہِ نعت ست نہ صحرا'' میں ''مشتاب'' کہہ کر عرفی نے اسی سنجیدگی اور متانت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا قصیدہ اور نعت مقصدیت کے اعتبار سے مشترک ہونے کے باوجود لفظیات اور لہجے کی سطح پر بالکل مختلف ہیں۔ عرفی کے ایک مشہور نعتیہ قصیدے کا شعر ہے:

هشدار کہ نتواں بہ یک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کی و جم را

گویا لفظیات اور لہجے کے انتخابی مراحل میں نعت گو شعرا کو یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ سلطانِ انبیا اور دنیوی سلاطین کی مدحت میں بین فرق ہے۔ وہ الفاظ واصطلاحات جو کسی فرد کے لیے مخصوص ہوں نعتیہ اشعار کا پیرایۂ اظہار نہیں بن سکتے۔ یہی حکم لہجے اور پیش کش پر بھی صادر ہوتا ہے۔ فلمی گیتوں کے طرز پر نعتِ نبی کا پڑھنا اور لکھنا اسی لیے درست نہیں۔ بیان و اظہار کا یہی محتاط رویہ جہاں نعتِ رسول کو عمومیت سے پاک رکھنے میں معاون ہوتا ہے، وہیں ذکرِ الوہیت کے خصوصی دائرے میں داخل ہونے سے بھی بچاتا ہے۔ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ جادۂ نعت کے مسافر در حقیقت نیابتاً اللہ ہی کی حمد و ثنا کے سفر میں ہوتے ہیں، مگر ان کا فکری اور فنی امتیاز اسی صورت میں باقی رہ سکتا ہے، جب کہ ان کی شعری کاوشوں میں توحید و رسالت کا فرق نمایاں طور پر موجود ہو۔ خالق و مخلوق کے امتیاز کا شعور کسی بھی مرحلہ پر کم نہ ہونے پائے اور ہر ہر لمحہ عقیدت کے ساتھ عقیدہ کا ہوش باقی رہے۔

عقیدت اور عقیدہ دراصل یہی وہ دو چیزیں ہیں، جن کے اظہار میں سلامت روی سے گزر جانا نعت کہنے کے فن سے حتی المقدور عہدہ برآ ہونے میں کامیابی پانے کے مترادف ہے۔

اگر عقیدتوں کا بیان ہو، تو فنی لحاظ سے نعت کا شاعر کی کامیابی یہ ہے کہ اس کا بیان و اظہار قاری پر بھی عقیدت والتجا کی وہی کیفیت طاری کردے، جس سے شعر دوچار ہوا ہے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں بھی وہی آرزوئیں مچلنے لگیں جن آرزوؤں اور تمناؤں نے شاعر کو ماہی بے آب بنا رکھا ہے۔ اگر نعتیہ شاعری میں عقیدوں کا بیان ہو، تو فنی لحاظ سے شاعر کی کامیابی یہ ہے کہ اس کا بیان لفظی تلمیحات کا مرہون منت ہوئے بغیر فکری طور پر قاری یا سامع کو نہ صرف اس عقیدے کی تہہ تک پہنچا دے، بلکہ اس کے افہام میں معاون اور استحکام میں اضافہ کا سبب بن جائے، جس عقیدے سے وابستگی نے اسے متعلقہ شعر کہنے کا ذہن بخشا ہے۔ اگر عقیدتوں کے بیان میں شاعر کے لیے یہ بات کسی آفت سے کم نہیں کہ ہوشیاری کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگا ہو، تو یقیناً عقیدوں کے بیان میں بھی یہ بات ایک بڑی افتاد کے مصداق ہی قرار پائے گی کہ اس کی صحت کسی بھی جہت سے مجروح ہوگئی ہو۔ خود شاعر کے نوکِ قلم سے اس کے اپنے عقیدے پر نشتر لگ گیا ہو اور اسے خبر بھی نہ ہوئی ہو۔ یا اعتقادیہ کے بیان میں ایک قسم کی رمزیت آگئی ہو۔ ایسی رمزیت جو مذہب کے یا تو فرقۂ باطنیہ میں تبدیل کردیتی ہے یا پھر طرح طرح کی تاویل توجیہہ کے دروازے کھول دیتی ہے۔ دوسری جانب عظمتِ رسول کی تخفیف کرنے والے شعرا کی تعداد بھی کم نہیں۔ اعتقادیہ کے بیان میں مبالغہ اور تخفیف دونوں ہی ایمان کے لیے خطرناک ہیں۔

حالی کی نعت ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' ہم میں سے کس کو یاد نہیں۔ لیکن اسی شاعر کا جب یہ شعر سامنے آتا ہے:

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم
کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم

تو پھر صاف پتا چل جاتا ہے کہ اعتقادیہ کی خوش عقیدگی نے کیا گل کھلائے ہیں اور شاعر نے کس طرح یہ عقیدہ نظم کردیا ہے کہ رسول پاک نبیِ مختار نہیں، نبی مجبور ہیں۔ یہاں جانا مقصود نہیں، جن میں عقیدۂ اوتاریہ اور نعوذ باللہ ''نبی مجبور'' جیسے عقیدے کی پیش کش ہوئی ہے۔ بلکہ یہ

عرض کرنا مقصود ہے کہ عقیدوں کی پیش کش میں حزم واحتیاط نہ ہو، تو نعتیہ شاعری ایمان کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ عقیدوں کی پیش کش میں فنی مرتبے کا ایک اوسط حال تو یہ ہے کہ لفظی تلمیح برجستہ آئی ہو اور اس سے بھی بلند درجہ یہ ہے کہ معنوی تلمیح سے صحیح عقیدے کی طرف قابل فہم نشاندہی ہوگئی ہو۔ ایسی نشاندہی جس میں روحِ قرآنی جھلک رہی ہو۔ اگر شاعر پیارے مصطفیٰ کا سراپا بیان کر رہا ہو تو عنانِ تخیل بے لگام نہ ہو، بلکہ شمائل نبوی کے مضامین اس کے موید ہوں۔ مزید ایک بات بر سبیل تذکرہ عرض کرنا چاہوں گا کہ آج کی نعتیہ شاعری میں عصری حسیت کو بھی مختلف نہجوں سے برتا جا رہا ہے۔ عالمی منظرنامے پر اہلِ اسلام کی جو کربناک تصویریں ابھر رہی ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اظہار غیر فطری بھی نہیں۔ اپنا حال دل سنانے کے لیے محبان رسول کے سامنے خدا اور رسول کی بارگاہ سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ عصری حسیت کو بیان کرتے ہوئے آدابِ نعت کا دامن ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے، کیوں کہ حالِ زمانہ کو پیش کرتے ہوئے غلو کا سہارا لینا گویا نبی کے دربار میں غلو کے ساتھ باتیں کرنا ہے۔

نعت کے فن پر باتیں کرتے ہوئے مختلف ہیئتوں کے استعمال کا معاملہ بھی سامنے آتا ہے۔ نہ صرف سرحد پار بلکہ خود ہمارے ملک میں بعض شعرا نے گیت اور دوہے کی شکل میں نعتِ نبی لکھا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی زبان میں یا کسی ادب کے قواعد وضوابط اور آئین اصول کی رعایتوں کے ساتھ نعت گوئی پر کوئی قید اور کوئی قدغن نہیں۔ نبی کی امت میں صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی شامل ہیں اور اپنے نبی سے عقیدت ومحبت کا اظہار وہ کرتی ہیں اور کر بھی سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں اصل چیز بس یہ ہے کہ قریب المفہوم الفاظ واصطلاحات کے استعمال کا خصوصی دائرہ قائم رہنا چاہیے۔ اس بات کو قدرے وضاحت کے ساتھ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی زبان، کسی ادب اور کسی شعری ہیئت کے نام پر جہاں معنیاتی لحاظ سے الفاظ کے استعمال میں اس کی سرگزشت، تداولی کیفیت اور تمدنی ثقاہت پر نظر رکھنا ضروری ہے، وہیں یہ بھی

لازم ہے کہ ایسی قریب المفہوم اصطلاحوں کے استعمال میں ترادف کے لحاظ سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو، جن کا تعلق اعتقادات سے ہے یا جو اعمالیات میں بہمہ وجود ممتاز وشناختہ ہیں۔ کیوں کہ اس احتیاط کے بغیر نعت کے فن کو بھگتی گیتوں کی فضا کے غلبے سے بچانا ناممکن ہے۔

موضوعِ نعت پہ اس مختصر گفتگو کے بعد یہ حقیقت روشن ہے کہ نعت گوئی خالص مقصدی شاعری سے عبارت ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ کوئی بھی شعری تخلیق دو ہی نظریے کے تحت وجود پذیر ہوتی ہے۔ ایک شاعری برائے شاعری اور دوسری شاعری برائے زندگی۔ شاعری برائے شاعری خالص تفریحی اور شعری جمالیات کا آئینہ ہوتی ہے۔ جب کہ شاعری برائے زندگی مقصدیت کی حامل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، پہلے نظریے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ گر چہ شعری حسن کاری کے مظاہرے کا موقع اس میں زیادہ ہے۔

اب نعت گو شعرا کے سامنے صرف شاعری برائے زندگی یعنی مقصدی تخلیق کا ہی میدان بچ جاتا ہے۔ ایک ایسا میدان جہاں شعریت یا شعری استعداد کے جوہر دکھلا پانا آسان نہیں۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت اور شریعت دونوں کے تقاضوں کو بحسن وخوبی نبھا پانا ایک بڑے فن کار ہونے کا ثبوت ہے۔ مثلاً چودھویں کے چاند کو دیکھ کر ایک شاعر کا تخیل چہرۂ مصطفیٰ کی تابانیوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اسی چاند کو دیکھ کر ایک شاعر کی فکری پرواز انگشت مصطفیٰ کی عظمتوں کے آسمان میں گم ہو جاتی ہے۔ اس طرح نعت گوئی کی سعادت تو دونوں کو حاصل ہوئی لیکن غور وفکر سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ دونوں کی فکری سطح، ادراک وعرفان، احتیاط کے رویے یہاں تک کہ عشق ومحبت کے تقاضے میں بھی بہت فرق ہے۔

چاند اور چہرۂ مصطفیٰ کا تصور جمال رسول کا اظہار ہے، جب کہ چاند اور انگشت کا تصور کمالِ مصطفیٰ کا آئینہ دار۔ ایک کا تعلق تشبیہ سے ہے اور دوسرے کا تلمیح سے۔ ایک نے عکس کو دیکھا اور نقش تک پہنچنے کی کوشش کی اور دوسرے نے واقعہ کو دیکھا اور اثر تک یا صاحب واقعہ تک رسائی کی کوشش کی۔ رسول اور صحابہ کے جھرمٹ کو ہم چاند تاروں سے تشبیہ تو دے سکتے

ہیں ن لیکن تشبیہ کا مفہوم یہ نہیں ہوگا کہ آقا کا چہرہ چاند جیسا ہے یا چاند آقا کے چہرے جیسا ہے۔
کیوں کہ رسول کی ذات لاثانی ہے اور لاثانی کی مثال ممکن نہیں ہوتی۔
یہ نکات واشارات اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فکری وفنی حزم واحتیاط اور خلوص کے ساتھ نعت لکھنا، پڑھنا اور سننا عینِ عبادت ہے۔ نیز اعتقاد کی صداقت اور موضوع کی حقانیت اس کی بنیادی شرط ہے۔ لہٰذا حقائق کو منظوم کرتے ہوئے حد درجہ احتیاط لازمی ہے، جب کہ عقیدتوں کے بیان میں خود سپردگی، سرشاری اور خلوص ضروری ہے۔ چوں کہ نعت صرف شعری ذوق کی تسکین کا سبب نہیں ہوتی بلکہ یہ اسلام اور بانی اسلام کی تاریخ، حیاتِ مومن کا لائحہ، شاعر کے ایمان وایقان کا مظہر اور قرآن واحادیث کی تفہیم کا آئینہ بھی ہوتی ہے۔ اس طرح نعتیہ شاعری کے تخلیقی عمل میں ذراسی بے احتیاطی ایمان کو کس طرح نقصان پہنچا سکتی ہے، اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ خلاصے کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمین وآسمان کی کسی بھی حقیقت پر پہلا حجاب حمد کا ہے کہ ہر شے کی تخلیق خدا نے فرمائی ہے اور دوسرا حجاب نعت کا ہے کیوں کہ ہر شے کی تخلیق کا باعث ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ **لولاک لما خلقت الافلاک**۔ اسی حجاب کی تصدیق ہے۔

○ ○ ○

ڈاکٹر خواجہ اکرام
ایسوسی ایٹ پروفیسر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

⊙

کلامِ رضا کی شعری جمالیات

اردو شاعری کی تنقید میں کئی اصطلاحیں ایسی ہیں، جن کی خود تعریف و تعبیر حتمی طور پر نہیں ہو سکی ہے۔ انہی اصطلاحوں میں جمالیات کی اصطلاح ہے۔ اس کی الگ الگ تعبیریں پیش کی گئی ہیں اور جتنی تعبیریں ہیں، اسی قدر انتشار بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمالیاتی اقدار تہذیب وتمدن کے اقدار سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ حسن کو جمالیات کا مظہر مانا جاتا ہے، لیکن حُسن کے معیارات طے کرنے میں بھی انتشار ہے۔ کیوں کہ حسن کے معیار علاقے، خطے، تہذیب وتمدن کے لحاظ سے تبدیل ہوتے ہیں۔ عموماً حسن کو عشق کی ابتدا مانا جاتا ہے اور عشق کو ہی کائنات کا حاصل تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن عشق کے معیارات بھی مختلف ہوتے ہیں اور حُسن عشق کو جمالیات کی بنیاد مانتے ہیں۔ اسی لیے جمالیات کی تعبیر مفکروں نے اپنے اپنے انداز سے کی ہیں۔

وکی پیڈیا کے مطابق ''جمالیات فلسفلے کی ایک صنف ہے، جو فن کے حُسن اور فنِ تنقید کی قدروں اور معیاروں سے بحث کرتی ہے۔ جمالیات کی اصطلاح پہلی بار باؤم گارٹن نے ۱۷۵۰ء میں استعمال کی اور اس سے مراد علم حسیات لی، جس کا بنیادی مقصد حسن کی تلاش قرار دیا۔ کانٹ نے ماورائی جمالیات کی ترکیب استعمال کی، جس سے حسیاتی تجربے کی بنیادی اصول لیے۔ اس

اصطلاح کے جدید معنی ہیگل نے ۱۸۲۰ء میں متعین کیے۔ پرانے زمانے میں جمالیات سے مراد وہ علم تھا، جو حسن یا جمال اور رفعت کی ہیئت سے متعلق مجرد تصورات پر بحث کرتا تھا۔ مگر جدید فلسفہ کے نزدیک جمالیات وہ سائنس ہے جو تخلیقی تجربہ، تجربۂ حسن اور نقد و نظر کی قدروں اور معیاروں سے بحث کرتی ہے اور نوعیت اور عمل کے اعتبار سے منطق اور نفسیات سے مختلف ہے'' ادب میں ان اقدار کو بنیاد بنا کر ادبی شہ پاروں پر نقد و تبصرہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ بھی ایک بڑا سوال رہا ہے اور یہاں بھی اختلافات کی گنجائش موجود ہے۔ اس حوالے سے نصیر احمد ناصر نے لکھا ہے کہ:

'ادب کو جمالیاتی بنیادوں پر پرکھنا مناسب ہے یا فلسفیانہ اور اخلاقی قدروں پر، اس بات کا تعلق فلسفہ فن سے ہے، جس کی بحث ادب میں بہت قدیم ہے۔ محض فلسفیانہ اور اخلاقی نہیں بلکہ اس بحث کے افادی، علمی، ادراکی، فکری، معاشی، معاشرتی، عمرانیاتی، سائنسی اور کئی دیگر پہلو بھی ہیں۔ جمالیاتی معروض کا تعلق صرف جسمانی یا مرئی مظاہر سے نہیں، غیر مرئی اور داخلی محسوسات اور اظہارات سے بھی ہوتا ہے۔ جمالیاتی تصور آفاقی ہے اور اسے علمی طور پر بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ فلسفے اور اخلاق کی اعلیٰ اقدار جمالیاتی سیاق و سباق ہی میں ادب پارے کا روپ دھار سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے ادب کو جمالیاتی بنیادوں پر پرکھنا زیادہ مناسب ہے۔' (نصیر احمد ناصر۔ اداریہ تسطیر جولائی ۲۰۱۰ ''ادبی جمالیات، مواد، اثرات اور دائرہ کار'' سے مقتبس)

بات درست بھی یہی ہے کہ ادب کے قاری ادب کو اپنے ذوقِ مزاج اور تہذیبی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ شاعری جو جذبۂ دل کی ترجمان ہے، اس کو بھی دیکھنے، کہنے اور سننے کا اپنا اپنا جمالیاتی ذوق ہوتا ہے، کیوں کہ عشق جو جمالیات کا مظہر ہے، اس کے رنگ بھی ہزار ہیں اور جلوے بھی بے شمار ہیں۔ یہ عشق فرزانگی بھی سکھاتا ہے اور دیوانگی بھی۔ لیکن ایک عشق ایسا بھی ہے، جو حدِ ادب کو ملحوظ رکھنے کا درس دیتا ہے۔ جی ہاں یہ بات ذرا عقل و فہم سے دور ہے کہ عشق اور ادب ایک ساتھ ممکن نہیں۔ کیوں کہ عشق دیوانگی سکھاتا ہے، تو عقل سنجیدگی کا درس دیتی ہے۔ اسی لیے عشق و عقل

ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ کبھی عقل حاوی ہوتی ہے، تو کبھی عشق کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ اقبال جیسے شاعر نے بھی عشق کو عقل پر ترجیح دی ہے اور یہ کہا کہ:

تازہ میرے ضمیر پر معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ، عقلِ تمام بولہب

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

اقبال یہ کہتے ہیں کہ عقل تو گومگو کی کیفیت میں ہی رہتی ہے اور سود و زیاں کا حساب لگاتی ہے اسی لیے عقل ہمیشہ پیچھے رہتی ہے اور عشق اپنے ایک ہی جست سے کائنات کی کئی پہنائیاں طے کر لیتا ہے۔ تاریخ نے عشق کے بدولت ہی ایسے کارنامے درج کیے ہیں، جو عقل سے ممکن نہیں تھا۔ اگر عشق نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم خلیل کے مرتبے تک نہ پہنچتے۔ یہ عشق ہی تو تھا کہ جس نے آتش کو گلزار بنایا:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق کی جلوہ طرازیوں سے انسانی تمدن کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی، اس کو عشق اپنی طاقت سے بے سوزن اور بغیر تارِ رفو سی سکتا ہے:

وہ پُرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

اس کے مقابلے میں عقل سود و زیاں کے پیمانے کو سامنے رکھتا ہے۔ اسی لیے عقل طرح طرح کے حربے اپناتا ہے، عقل کی عیاری اور عشق کی سادگی اور اخلاص کو اقبال نے اس طرح ظاہر کیا ہے:

عقل عیار ہے سو بھیس بدلیتی ہے

عشق بے چارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم

لیکن اسلامی زندگی کے شعار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں کو معتدل انداز میں رکھا جائے، اسی لیے اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ:

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑیئے

کیوں کہ عقل سے شرع محمدی کی تعمیل ہوگی اور دل سے عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل سجائی جائے گی کیوں کہ:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدۂ تصورات

لیکن بات اگر یہاں آکر ٹھہرتی ہے، تو ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دنیا کا حاصل بھی عشق رسول ہی ہے۔ بغیر عشقِ رسول کے کچھ نہیں مل سکتا، نہ تو دنیا میں امن ممکن ہے اور آخرت کا حصول ممکن نہیں۔ لیکن یہ عشق یعنی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایسا عشق ہے، جس میں دیوانگی نہیں فرزانگی کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ عشق دنیا کے عشق سے نرالا ہے۔ اسی لیے تو شاعر نے کہا ہے کہ:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آئید جنید و بایزید اینجا

عشق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ دیوانہ وار خود کو نچھاور کردیں، لیکن امام احمد رضا اس عشق کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

پیشِ نظر وہ نو بہار سجدے کو دل ہے بے قرار
روکیے سر کو روکیے ہاں یہی امتحان ہے

یہاں شاعری میں عشق کی، جس جمالیات کا ذکر ہے، وہ دنیا کی شاعری میں اور کہیں نظر نہیں آئے گا۔ کیوں کہ عشق کا یہ ادب درِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کہیں مل ہی نہیں سکتا۔

یہ عشق حاصل کل ہے۔

روکیے سر کو روکیے ہاں یہی امتحان ہے

کہہ کر احمد رضا عشق مصطفیٰ کی تڑپ کو بھی برقرار رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور عشق مصطفیٰ کے آداب کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ لیکن عشق مصطفیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ بغیر عشق الٰہی کے حاصل نہیں کر سکتے اور یہاں اجازت ہے کہ عشق کی دیوانگی کو بے محار چھوڑ سکتے ہیں:

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

عشق حقیقی اللہ کا ایک نایاب تحفہ ہے، یہ عشق دولت وثروت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یادِ الٰہی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تپش میں اپنے آپ کو جلانے کے بعد حاصل ہوتا ہے اور جب یہ دولت لازوال حاصل ہوتی ہے، تب وہ مدحت رسول کرنے کا حقدار ہوتا ہے اور ایسے عشاق کی مدحت پھر صرف شاعری نہیں رہتی اور نہ ساحری بنتی ہے، بلکہ حیاتِ جاودانی کا درس دیتی ہے اور زندگی میں ایسی تازگی کا ایسا رس گھولتی ہے، جو دائمی ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم نعتیہ شاعری میں جمالیاتی عناصر کی تلاش کرتے ہیں، تو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں ادب کے وہی بندھے ٹکے معیار نظر آتے، جو عشق مجازی کے معیار ہیں۔ نعتیہ شاعری میں اس معیار کی تلاش بے سود ہے، کیوں کہ یہاں تو وہ معیار نظر آئیں گے، جس میں پاکیزگی اور تقدس کے عناصر ملیں گے۔ اسی لیے شاعری کی تنقید کرنے والوں کی نظر عموماً ان عناصر کی تلاش کرتے ہیں، جو عشق مجازی کی خصوصیات ہیں۔ لہٰذا وہ نعتیہ شاعری کو فنی جمالیات سے خالی تصور کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ نعتیہ شاعری میں فنی اعتبار سے جدت وندرت دیکھنے کو نہیں ملتی، کیوں کہ یہاں بے شمار پابندیاں ہیں اور موضوعات بھی طے ہیں۔ یہاں حد ادب کو ملحوظ رکھنا ہوتا اور نعتیہ شاعری میں مبالغہ اور تخیل کی کارفرمائی کی گنجائش بھی نہیں۔ نعت گو شاعر کے ذہن میں ہمہ وقت یہ بات رہتی ہے کہ شان رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ نعتیہ شاعری میں ذرا سی لغزش شاعر کو گمرہی اور ضلالت کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اسی لیے شاعر محض اپنے عقیدے کا اظہار کرتا

ہے۔لہٰذااس طرح کی شاعری میں اسلوب وبیان کی جولانیوں کے بجائے سیدھا سادہ بیان اور اسلوب دیکھنے کوملتا ہے۔اسی لیےفن کی نیرنگیاں اورزبان وبیان کی لطافتیں نعتیہ شاعری میں عموماً مفقود ہیں۔جولوگ بھی نعت کوپسند کرتے ہیں،وہ محض عقیدت کی بنیاد پر۔لیکن یہ تمام باتیں یکسر غلط ثابت ہوجاتی ہیں جب ہم نعتیہ کلام کا بغائر مطالعہ کرتے ہیں۔صرف احمد رضا کی شاعری کو دیکھیں،تو یہ تمام مفروضات غلط ثابت ہوجاتے ہیں۔مثال میں یہاں چنداشعار ملاحظہ فرمائیں:

طوبیٰ میں جوسب سے اونچی، نازک شاخ
مانگوں نعت نبی لکھنے کو،روح القدس سے ایسی شاخ
ظاہروباطن،اول آخر،زیبِ فروغ وزینِ اصول
باغِ رسالت میں ہےتوہی گل،غنچہ،جڑ،پتی شاخ

ان اشعار میں ایسی شعری جمالیات کی مثالیں موجود ہیں،جن کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی، کیوں کہ یہاں صرف اسلوب کی ندرت ہی نہیں ہے، بلکہ حقیقت کے بیان میں وہ جدت ہے کہ عقیدت ومحبت کے ساتھ نعت کی عظمت بھی عیاں ہوجاتی۔اسلوب بھی رنگین ہے اور بیان بھی جدید ہے۔شاخ طوبیٰ کی اونچی اورنازک شاخ کہہ کرامام احمد رضا نے نعتیہ شاعری کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کے آداب کوجس خوبی سے بیان کیا ہے،ایسادلکش اوردلپذیر نمونہ شاعری عشقیہ کلام میں نظرنہیں آتی۔ان دواشعار میں اختصاروایجاز کے ساتھ جس طرح عظمت نعت کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کائنات گیتی میں آمداور تمام رسول وانبیاء میں آپ کی اولیت کو ظاہر کیا ہے، وہ کا انوکھا اسلوب اورنادر انداز بیان ہے۔ذراغور فرمائیں کہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کے سلسلے میں اورشعرا کیا کہتے ہیں۔سعدی شیرازی جب نعت نبی کہنے کا ارادہ کرتے ہیں،تو یہ کہتے ہیں:

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

یا کوئی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن امام احمد رضا عجز بیان ظاہر نہیں کرتے بلکہ نعت نبی لکھنے کے لیے انتہائی عظیم وسیلے کو ڈھونڈتے ہیں اور تب یہ کہتے ہیں:

مانگوں نعت نبی لکھنے کو، روح القدس سے ایسی شاخ

اب آپ زمانہ قدیم کے اس رواج کو نظر میں رکھیں، جب قلم کی جگہ سرکنڈے کے قلم کا استعمال کرتے تھے۔ اس عہد میں قلم تراشنے کے لیے شاخ طوبیٰ کی تمنا کرنا بھی اپنے آپ میں بڑی عظمت کا متحمل ہے۔

ان تمام صفات کے باوجود اگر اردو تنقید میں نعتیہ شاعری کو نظر انداز کیا گیا ہے، تو یہ اردو تنقید کا المیہ ہے نعتیہ شاعری کا المیہ نہیں کیوں کہ نعت وحمد تو دنیا کے ہر خطے میں گنگنائے جاتے رہیں گے اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متوالے اس سے سرور وکیف حاصل کرتے رہیں گے۔ اردو شاعری میں نعتیہ سرمائے کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن بہت کم ہی شاعر ہیں، جن کو نعتیہ شاعری کے سبب اردو ادب میں مناسب جگہ دی گئی ہو۔ اس حوالے سے اگر کسی کا ذکر ہوتا ہے، تو اکثر حفیظ جالندھری اور محسن کاکوروی کا نام آتا ہے۔ محسن کاکوروی کو ان کے مدحیہ قصیدے کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آئے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورشِ ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبے میں قبضہ نہ کریں لات وہبل

ہے۔لہٰذا اس طرح کی شاعری میں اسلوب و بیان کی جولانیوں کے بجائے سیدھا سادہ بیان اور اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے۔اسی لیے فن کی نیرنگیاں اور زبان و بیان کی لطافتیں نعتیہ شاعری میں عموماً مفقود ہیں۔جو لوگ بھی نعت کو پسند کرتے ہیں، وہ محض عقیدت کی بنیاد پر۔لیکن یہ تمام باتیں یکسر غلط ثابت ہو جاتی ہیں جب ہم نعتیہ کلام کا بغائر مطالعہ کرتے ہیں۔صرف احمد رضا کی شاعری کو دیکھیں، تو یہ تمام مفروضات غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔مثال میں یہاں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

طوبیٰ میں جو سب سے اونچی، نازک شاخ
مانگوں نعت نبی لکھنے کو، روح القدس سے ایسی شاخ
ظاہر و باطن، اول آخر، زیبِ فروغ و زینِ اصول
باغِ رسالت میں ہے تو ہی گل، غنچہ، جڑ، پتی شاخ

ان اشعار میں ایسی شعری جمالیات کی مثالیں موجود ہیں، جن کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی، کیوں کہ یہاں صرف اسلوب کی ندرت ہی نہیں ہے، بلکہ حقیقت کے بیان میں وہ جدت ہے کہ عقیدت و محبت کے ساتھ نعت کی عظمت بھی عیاں ہو جاتی۔اسلوب بھی رنگین ہے اور بیان بھی جدید ہے۔شاخ طوبیٰ کی اونچی اور نازک شاخ کہہ کر امام احمد رضا نے نعتیہ شاعری کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کے آداب کو جس خوبی سے بیان کیا ہے، ایسا دلکش اور دلپذیر نمونۂ شاعری عشقیہ کلام میں نظر نہیں آتی۔ان دو اشعار میں اختصار و ایجاز کے ساتھ جس طرح عظمت نعت کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کائنات گیتی میں آمد اور تمام رسول و انبیاء میں آپ کی اولیت کو ظاہر کیا ہے، وہ کا انوکھا اسلوب اور نادر انداز بیان ہے۔ذرا غور فرمائیں کہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کے سلسلے میں اور شعرا کیا کہتے ہیں۔سعدی شیرازی جب نعت نبی کہنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو یہ کہتے ہیں:

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

یا کوئی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن امام احمد رضا عجز بیان ظاہر نہیں کرتے بلکہ نعت نبی لکھنے کے لیے انتہائی عظیم وسیلے کو ڈھونڈتے ہیں اور تب یہ کہتے ہیں:

مانگوں نعت نبی لکھنے کو، روح القدس سے ایسی شاخ

اب آپ زمانہ قدیم کے اس رواج کو نظر میں رکھیں، جب قلم کی جگہ سر کنڈے کے قلم کا استعمال کرتے تھے۔ اس عہد میں قلم تراشنے کے لیے شاخ طوبیٰ کی تمنا کرنا بھی اپنے آپ میں بڑی عظمت کا متحمل ہے۔

ان تمام صفات کے باوجود اگر اردو تنقید میں نعتیہ شاعری کو نظر انداز کیا گیا ہے، تو یہ اردو تنقید کا المیہ ہے نعتیہ شاعری کا المیہ نہیں کیوں کہ نعت وحمد تو دنیا کے ہر خطے میں گنگنائے جاتے رہیں گے اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متوالے اس سے سرور وکیف حاصل کرتے رہیں گے۔ اردو شاعری میں نعتیہ سرمائے کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن بہت کم ہی شاعر ہیں، جن کو نعتیہ شاعری کے سبب اردو ادب میں مناسب جگہ دی گئی ہو۔ اس حوالے سے اگر کسی کا ذکر ہوتا ہے، تو اکثر حفیظ جالندھری اور محسن کاکوروی کا نام آتا ہے۔ محسن کاکوروی کو ان کے مدحیہ قصیدے کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آئے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورشِ ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبے میں قبضہ نہ کریں لات وہبل

یہ وہی قصیدہ معراجیہ ہے، جسے محسن کاکوروی سنانے کے لیے امام احمد رضا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ظہر کی نماز کے بعد محسن کاکوروی نے اشعار سنانا شروع کیا۔ ابھی دو اشعار ہی پڑھ سکے تھے کہ امام احدم رضا نے کہا اب بس کیجیے، عصر کی نماز کے بعد بقیہ اشعار سنے جائیں گے۔ اسی ظہر وعصر کے درمیان امام احمد رضا نے بھی ایک قصیدہ معراجیہ لکھا اور جب مجلس بیٹھی، تو پہلے آپ نے اپنا قصیدہ سنایا۔ اسے سن کر محسن کاکوروی نے کہا:

مولانا اب بس کیجیے، اس کے بعد میں اپنا قصیدہ نہیں سنا سکتا۔

محدث اعظم ہند حضرت مولانا سید محمد اشرفی میاں بیان فرماتے ہیں کہ لکھنو کے ادیبوں کی ایک شاندار محفل میں حضرت رضا رحمۃ اللہ علیہ کا قصیدہ معراجیہ میں اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کے سنایا، تو سب جھومنے لگے۔ میں نے اعلان کیا کہ اردو ادب کے نقطہ نظر سے میں ادیبوں کا فیصلہ اس قصیدہ کی زبان کے متعلق سننا چاہتا ہوں، تو سب نے کہا: اس کی زبان کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی ہے۔

اب ذرا اس قصیدے کے بھی چند اشعار ملاحظہ کریں:

وہ سرورِ کشور رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہماں کے لیے تھے

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں
اِدھر سے انوار ہنستے آتے اُدھر سے نفحات اٹھ رہے تھے

اتار کر ان کے رخ کا صدقہ وہ نور کا بٹ رہا تھا باڑا
کہ چاند سورج مچل مچل کر جبیں کی خیرات مانگتے تھے

وہی تو اب تک چھلک رہا ہے وہی تو جوبن ٹپک رہا ہے
نہانے میں جو گرا تھا پانی کٹورے تاروں نے بھر لیے تھے

تبارک اللہ شان تیری تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہیں تو وہ جوشِ لن ترانی کہیں تقاضے وصال کے تھے

خرد سے کہہ دو کہ سر جھکا لے گماں سے گزرے گزرنے والے
پڑے ہیں یاں خود جہت کو لالے کسے بتائے کدھر گئے تھے

سراغ این و متیٰ کہاں تھا نشان کیف و الیٰ کہاں تھا
نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی نہ سنگِ منزل نہ مرحلے تھے

ادھر سے پیہم تقاضے آنا ادھر تھا مشکل قدم بڑھانا
جلال وہیبت کا سامنا تھا جمال ورحمت ابھارتے تھے

قصیدے کے یہ اشعار کسی بھی طرح اردو کے نمائندہ قصائد سے کم نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قصیدے کی اصل روح لب و لہجے کا پُر شکوہ ہونا ہے اور مبالغہ اس کی جان ہے، تخیلات کے سہارے شاعر اپنے کلام کو دلکش و دلفریب بناتا ہے۔ امام احمد کے اس قصیدہ معراجیہ میں صنف قصیدہ کی تمام خوبیاں اپنے خاص آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں شعری جمالیات کے وہ عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں، جن کا سرا ایک طرف اگر انتہائی عقیدت ومحبت کی طرف جاتا ہے، تو دوسرا سرا قرآن وحدیث سے ملتا ہے۔ اس لیے اس قصیدے میں جو جلوہ طرازیاں اور جولانیاں

موجود ہیں، ان کو مئے دوآتشہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اردو شاعری میں پیکر تراشی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے کیوں کہ پیکر تراشی کا ملکہ ہر ایک کو حاصل نہیں۔ پیکر تراشی کا مطلب یہ ہے کہ لفظوں کے ذریعے کسی تصور یا خیال کو اس طرح پیش کرنا کہ اس کی شکل وصورت سامنے آجائے۔ نعتیہ شاعری میں یہ تو نہیں کر سکتے۔ البتہ مراثی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ نعت میں چوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت ہوتی ہے اور اس حوالے سے پیکر تراشی کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔ لیکن امام احمد رضا کا شعری اسلوب دیکھیے کہ انہوں نے اپنے اشعار میں ان کے صفات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پیکر تراشی کا شائبہ ہوتا ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیں:

سر تا بقدم ہے تن سلطان زمن پھول
لب پھول، دہن پھول، ذقن پھول، بدن پھول

ایک اور مثال دیکھیں:

خوار وبیمار وخطا دار وگنہ گار ہوں میں
رافع ونافع وشافع لقب آقا تیرا

اس شعر میں حضور کے صفات والا کمال کے ساتھ ساتھ جو انداز بیان اور اسلوب ہے، اس میں لفظی تلازمے قابل دید ہیں۔ پہلے مصرعے کے مقابل دوسرے مصرعے میں ویسے ہی الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے جو درد کا مداوا ہے اور علاجِ عاصیاں ہے۔ اس طرح کے اشعار وہی کہہ سکتا ہے جس کو زبان کے ساتھ ساتھ فن پر پوری مہارت حاصل ہو۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں امام احمد رضا کو نعتیہ شاعری میں جو رتبہ حاصل ہے اس مقام تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ کیوں کہ انہوں نے نعتیہ شاعری کو اپنی فکر سے نئی جہات سے آشنا کرایا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد تنگ وتاریک قبر ہی سب کا ٹھکانہ ہونے والا ہے۔ لیکن عشق رسول کے دیوانے قبر میں جانے سے ڈرتے نہیں، بلکہ قبر میں جانے کی حسرت رکھتے ہیں کیوں کہ قبر میں نور محمدی کا دیار ہونے والا ہے۔ اب

اعلیٰ حضرت کا یہ شعر دیکھیں کہ انہوں نے اسی موضوع کو کس انوکھے انداز سے باندھا ہے:

لحد میں عشقِ رخِ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

اس طرح کے اشعار وہی کہہ سکتا ہے، جو سچا عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ جس قبر میں نورِ محمدی آ جائے وہاں پھر اندھیرا کیسا؟۔ یا ان اشعار کو دیکھیں جو عشق کے انوکھے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے:

کاش آویزۂ قندیل مدینہ ہو وہ دل
جس کی سوزش نے کیا رشک چراغاں ہم کو

جان ہے عشقِ مصطفیٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اٹھائے کیوں

مورا تن من دھن سب پھونک دیا
یہ جان بھی پیارے جلا جانا

اب چند ایسے اشعار بھی ملاحظہ کریں، جو امام احمد رضا کی فکری وفنی عظمت کی دلیل ہیں:

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائیں کیوں
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں

آنکھیں ٹھنڈی ہوں جگر تازے ہوں جانیں سیراب
سچے سورج وہ دل آرا ہے اجالا تیرا

دل عبث خوف سے پتہ سے اڑا جاتا ہے
پلہ ہلکا سہی بھاری ہے بھروسا تیرا

عصائے کلیم اژدہائے غضب تھا
گِروں کا سہار عصائے محمد ﷺ

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں
جو ترے در سے یار پھرتے ہیں
در بدر یوں ہی خوار پھرتے ہیں

اُن کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں
جس راہ چل گئے ہیں کوچے بسا دیئے ہیں

ان اشعار کے مطالعے سے بس یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ:

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس راہ چل گئے ہو سکے بیٹھا دیئے ہو

○ ○ ○

ڈاکٹر محمد اعجاز انجم لطیفی ایم اے پی ایچ ڈی
استاذ جامعہ رضویہ منظر اسلام بریلی شریف

فروغ رضویات میں منظر اسلام کا کردار

وادی رضا کی کوہِ ہمالہ رضا کا ہے
جس سمت دیکھئے وہ علاقہ رضا کا ہے

برادرانِ اسلام! یہ جان کر آپ حضرات کو یقیناً خوشی ہوگی کہ مرکز برکات رضا ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ میرا روڈ ممبئی کے ڈائریکٹر محبّ گرامی قدر مولانا ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی صاحب قبلہ آج کئی سال سے فکر رضا اور مسلک اعلیٰ حضرت کو عام سے عام تر کرنے کے لیے کوشاں ہیں، اسی کوشش کی ایک اہم کڑی آج کا سمینار بھی ہے۔ سمینار کے لیے موصوف نے مجھے ایک مقالہ بعنوان ''فروغِ رضویات میں منظر اسلام کا کردار'' لکھنے کی فرمائش کی۔ بے پناہ مصروفیت کے باوجود تکمیل خواہش کے پیش نظر میں نے عنوان سے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

حضرات! میرے مقالے کا عنوان ہے 'فروغ رضویات میں منظر اسلام کا کردار' فروغ رضویات سے آج کل کچھ لوگ زیادہ ہی پریشان ہیں۔ کوئی اعلیٰ حضرت کے نام سے چڑ رہا ہے تو کوئی مسلک اعلیٰ حضرت کہنے سے اجتناب کر رہا ہے۔ مخالفین، معاندین، حاسدین کچھ نہ کچھ

لکھتے ہیں اور تخریب کاری کرنے پر ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں۔ مخالفین وحاسدین فکر رضا اور تحریک رضا کو یعنی مسلک اعلیٰ حضرت کو جتنا ہی مٹانے اور دبانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اتنا ہی بڑھتا اور پروان چڑھتا چلا جارہا ہے۔ یہاں پر آپ حضرات کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ رضویات کیا چیز ہے؟ کہ جس کے فروغ کی بات ہورہی ہے۔ لہٰذا پہلے اس ذہنی تشویش اور خلجان کو دور کرلینا چاہیے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ رضویات دراصل اسلامیات ہی ہے۔ یعنی اسلامی عقیدے اور شریعت کی وہ چیزیں اور وہ باتیں، جو ایمان اور احکام اسلام میں داخل ہیں، انہیں چیزوں اور باتوں کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے قرآن وحدیث اور اقوال ائمہ سے مدلل ومبرہن کرکے عندالناس اسلامی معاشرے میں رائج کرنے کی کوشش کی ہے، جس کو آج کل علماء کی اصطلاح میں 'مسلک اعلیٰ حضرت' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ شیطان کے پیروکار اور چیلوں نے یعنی علماءِ سو نے اسلامی لٹریچر کے نام سے ایسی ایسی کتابیں شائع کیں کہ بھولے بھالے انسان ان کتابوں کو پڑھ کر بدعقیدہ اور گمراہ ہورہے تھے۔ صاحب ایمان اور اہل اسلام کے دلوں سے ایمان کی دولت اور عشق رسول کا انمول خزانہ رخصت ہورہا تھا۔ ہندوستان میں فتنہ بدعقیدگی اور گمرہی کا سلسلہ سب سے پہلے مولوی اسماعیل دہلوی کی کتاب 'تقویۃ الایمان' کی اشاعت سے شروع ہوا۔ آنجناب نے کس حسین انداز میں تخریب کاری شروع کی کہ کتاب کا نام رکھا 'تقویۃ الایمان' لیکن کام اس سے تفویۃ الایمان کا لیا جانے لگا۔ اسی قبیل کی دوسری کتابیں جیسے ''حفظ الایمان'' صراط مستقیم، تحذیر الناس، فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ۔ کتاب کے نام سے یہ ظاہر ہورہا ہے کہ مذکورہ کتابیں اسلامیات اور ایمانیات سے متعلق ہیں، ان کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے سے ایمان وعقیدہ پختہ ہوگا۔ علماء سو نے سعودی ریال اور مال وزر کی ہوس میں بظاہر عوام کو یہی تاثر دینے کی کوشش کی۔ لیکن مذکورہ کتابوں کی وجہ سے مسلمان آپس میں دست وگریباں ہونے لگے، باپ، بیٹے، میاں، بیوی، بھائی، بہن میں اختلاف ہونے لگا۔ شیطان کے پیروکاروں نے اپنی تخریب کاری کی اسکیم میں کامیابی کا پرچم لہرانا شروع کردیا، اسلامی عقیدے پر حملہ ہونے لگا۔

مومنوں کے سینے سے عشق رسالت کا جذبہ اور شان الوہیت کا ولولہ ختم ہونے لگا۔ وہابیہ، دیابنہ اور فرقہائے باطلہ نے علم غیب، حیات نبی، اختیارات نبی، عظمت نبی، شفاعت، استعانت ندایارسول اللہ وغیرہ تمام عقائد و معمولات کو کفر و شرک بتانا شروع کر دیا۔ اسی طرح میلاد، قیام صلوٰۃ وسلام، ایصال ثواب، تیجہ، دسواں، چالیسواں، برسی، عرس، فاتحہ یہ سب معمولات جو صدیوں سے اہل سنت و جماعت میں رائج ہیں اور علمائے اسلام نے انہیں باعث اجر و ثواب قرار دیا ہے۔ ان لوگوں نے ان عقائد و معمولات کو اپنی اپنی کتابوں میں شرک و بدعت قرار دیتے ہوئے اپنی ساری توانائی انہیں مٹانے میں صرف کیں۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا، تو علما اہل سنت نے اپنے قلم سے ان عقائد و معمولات کا تحفظ فرمایا۔ تحریر، تقریر اور مناظرہ کے ذریعہ ہر اعتراض کا دنداں شکن جواب دیا۔ عقائد و معمولات کی اس معرکہ آرائی میں امام احمد رضا نے بھی علما سو کی تخریب کاری کا تعاقب کیا۔ عشق رسالت میں شرسار ہو کر عظمت نبی اور شان الوہیت کے تحفظ کے لیے قلم حق رقم اٹھایا اور اعلان کر دیا۔

کلکِ رضا ہے خنجر خونخوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

فاضل بریلوی نے ان نام نہاد مولویوں کا اصلی چہرہ بے نقاب کیا اور اہل سنت کے عقائد کے ثبوت میں دلائل و براہین کا انبار لگا دیا۔ ایک ایک عقیدہ کے ثبوت میں کئی کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ باطل فرقوں کے رد و ابطال میں اور عقائد و معمولات اہل سنت کی تائید میں جو عظیم خدمت انجام دیں۔ اس بنیاد پر آپ علماء اہل سنت میں سب سے نمایاں اور ممتاز ہو گئے۔ عقائد اہل سنت و جماعت کی زبردست وکالت کرنے کے سبب یہ عقائد امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی ذات کی طرف منسوب ہونے لگے اور اب حال یہ ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات اہل سنت و جماعت کی پہچان بن گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی حجازی، شامی، یمنی، عراقی، مصری جب مدینہ منورہ میں یارسول اللہ کہتا ہے تو نجدی اسے بریلوی کہتے ہیں۔ حالاں کہ اس کا تعلق بریلی شہر سے نہیں ہوتا ہے، اسی طرح

اگر کوئی ''یا شافع محشر'' کہہ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت طلب کرتا ہے، تو وہ چاہے، عرب ہی کا رہنے والا کیوں نہ ہو'وہابی' اسے بھی بریلوی ہی کہتے ہیں، اس کی وجہ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اسلاف کے وہ عقائد ہیں، جس کی امام احمد رضا نے دلائل وبراہین کے ذریعہ شدومد سے تائید فرمائی ہے اوران عقائد کے ثبوت میں سب سے زیادہ نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ عقائد امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی سے اس قدر منسوب ہوگئے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی مسلمان خواہ کسی ملک کا باشندہ ہو، اگران عقائد کا قائل ہو، تو اسے بریلوی کہا جاتا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد پاکستان رقمطراز ہیں:

امام احمد رضا اس طبقہ کی نمائندگی کرتے تھے، جس نے دور آزادی میں ملت اسلامیہ کی ساکھ کو قائم رکھا۔ ان کا تعلق سواد اعظم اہل سنت و جماعت سے تھا۔ جس کو آج عرف عام میں بریلوی کہا جاتا ہے۔

(ڈاکٹر مسعود احمد: حیات وخدمات۔ ص:۲۵۲)

اسی طرح سے نائب مفتی اعظم حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی 'مسلک اعلیٰ حضرت' کی تائیداور مجدد اعظم کی تصنیفی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

'مسلک اعلیٰ حضرت کوئی نیا مسلک اور دین نہیں، مسلک اعلیٰ حضرت حقیقت میں سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے اس طریقہ رضیہ ومتوارثہ کا نام ہے، جو عہد رسالت سے لے کر آج تک سواد اعظم کا مسلک ہے، جوھی الجماعتہ اورما انا علیہ و اصحابہ کا مصداق ہے۔ مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی تصانیف پڑھئے۔ انہوں نے انہیں عقائد ومسائل کو تحریر فرمایا ہے'۔ جو سلف سے خلف تک اب تک اہل سنت و جماعت کا رہا ہے۔ ہر عقیدے کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیات اوراحادیث کے ساتھ ساتھ اسلام کی کتابوں سے حوالہ جات تحریر کردیتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی کتابیں سو سال سے پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہزار شخصی اور جماعتی کوشش کے

باوجود آج تک کوئی مخالف بھی کسی عقیدے کے بارے میں ثابت نہیں کرسکا کہ اہل سنت وجماعت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے عہد مبارک میں انگریزوں نے اپنے پلان کے مطابق بہت سے چالاک عیار دنیادار افراد کو خرید کر اہل سنت کے خلاف کئی مذاہب کی بنیاد ڈلوائی۔ مثلاً وہابی، نیچری، قادیانی، چکڑالوی، صلح کلی، ان سب مذاہب کے بانیوں اور حامیوں نے اپنی ساری ذہنی وعلمی توانائیوں کو صرف کرکے اہل سنت کے خلاف صف آرائی کی۔ ان سب کا مقابلہ تن تنہا مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے فرمایا اوران سب کے عقائد باطلہ کو رد کرکے ان سب کے پرخچے اڑادیئے۔ ان سب خدمات کو دیکھتے ہوئے مذہب اہل سنت وجماعت کا دوسرا نام مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ اس زمانے میں اہل سنت کو تمام فرقہائے باطلہ سے ممتاز کرنے کے لیے سوائے مسلک اعلیٰ حضرت کے کوئی لفظ موزوں ہوتا ہی نہیں۔ (ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، اپریل ۱۹۹۹ء)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اعلیٰ حضرت نے جو کچھ لکھا اور علمی، تحقیقی کارنامہ انجام دیا۔ وہ سب اسلامیات پر مبنی ہیں۔ بلفظ دیگر ہم انہی کارناموں کو رضویات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ ''رضویات'' اور اسلامیات ایک ہی سکہ کے دورخ ہیں، تو کوئی بے جا نہ ہوگا۔

فروغ رضویات: اب رہا سوال فروغ رضویات کا۔ تو فروغ رضویات پر علما اہل سنت اس لیے زور دیتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کے مخالفین، معاندین، حاسدین نے امام احمد رضا فاضل بریلوی کو محض ایک مولوی کی حیثیت سے متعارف کرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ جیسا کہ ہندوستان کے مشہور ومعروف ادیب اور قلم کار مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کتاب نزہۃ الخواطر میں یہ لکھا کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قلیل البضاعۃ فی الحدیث والتفسیر (حدیث وتفسیر میں فرومایہ تھے) اس طرح کی تقریر وتحریر کے ذریعہ فاضل بریلوی کی عبقری اور

ہمہ جہت شخصیت کو ایک معمولی مولوی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جارہا تھا۔ علمی اور تحقیقی کارناموں پر پردہ ڈالنے کی سازش رچی جارہی تھی۔ اس سازش کا پردہ چاک کرنے کے لیے ڈاکٹر مسعود احمد پاکستان لوح و قلم ہاتھ میں لے کر میدان عمل میں اتر پڑے، تو غلط فہمیوں کے بادل چھٹ گئے، بدگمانیوں کے قلعے مسمار ہو گئے اور وہ لوگ جو منصوبہ بند طریقے پر فاضل بریلوی کی حیات و خدمات پر خاک ڈال رہے تھے، تلملا اٹھے۔ چنانچہ ایک متعصب ذہن لکھتا ہے کہ:

"امام احمد رضا کو ہم دفن کر چکے تھے۔ فلاں پروفیسر (ڈاکٹر مسعود احمد) نے قبر سے نکالا ہے، اب دوبارہ دفن کرنے میں نصف صدی لگے گی۔ (اجالا، ص: ۴۸)

حق کو حق غلط کو غلط ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے فاضل بریلوی کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ان کی حیات و خدمات پر اتنا لکھا، اتنا لکھا اور اس قدر تحقیقی کام کیا کہ آج دنیا انہیں ماہر رضویات کے نام سے یاد کرتی ہے۔ راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر مسعود احمد علیہ الرحمہ کی خدمات کو فروغ رضویات کے عنوان سے احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا ایک اقتباس بطور استشہاد میں یہاں پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:

ہمارے علمی اور تحقیقی رسائل مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے تذکرے سے یکسر خالی نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مولانا بریلوی کے متبعین نے ان کے آثار علمیہ کی تدوین کی طرف توجہ نہ کی اور دوسرے حضرات نے اس لیے توجہ نہ کی کہ جن تحریکوں اور اداروں سے ان کا تعلق رہا، وہ کسی نہ کسی صورت میں مولانا بریلوی علیہ الرحمہ کے ہدف تنقید رہے۔ اس لیے ان حضرات نے یا تو بالکلیہ نظر انداز کر دیا۔ اگر ذکر بھی کیا، تو اس طرح کہ مولانا بریلوی کی بھاری بھرکم شخصیت دب کر رہ گئی ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں راقم نے مولانا بریلوی پر کچھ کام کیا ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنوز ساحل سمندر تک بھی رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ مولانا بریلوی کی شخصیت تابناک ہوتی جاتی ہے اور حیرت

بڑھتی جاتی ہے۔(ڈاکٹر مسعود احمد: حیات و خدمات، ص:۲۵۰)

مذکورہ اقتباس پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مسعود احمد کو اعلیٰ حضرت سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی، ڈاکٹر صاحب اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی فکر اور تحریک کو تمام دنیا کے لوگوں پر واضح کرنے کے لیے ایک اہم ادارہ کی داغ بیل ڈالنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ اسی خواہش کا اظہار انہوں نے مختلف کتابوں کے حرف آغاز اور ابتدائیہ و تقدیم میں کیا ہے۔ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی پاکستان، رضا اکیڈمی ممبئی۔ المجمع الاسلامی مبارک پور''سنی سوسائٹی ڈربن'' مرکزی مجلس رضا لاہور پاکستان (بانی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری لاہور)۔ اس طرح کے اور بہت سارے ادارے، جو آج ملک و بیرون ملک قائم ہیں اور آئے دن ہوتے جا رہے ہیں، یہ اسی خواہش کا نتیجہ اور اسی جرس کی آواز ہے۔

منظر اسلام کا کردار: فروغ رضویات میں منظر اسلام کا کیا کردار رہا ہے۔ اس پہلو کو بیان کرنے سے پہلے منظر اسلام کے قیام کا پس منظر بیان کرنا نہایت ضروری ہے، تا کہ منظر اسلام کے قیام کا مقصد عوام پر بخوبی واضح ہو جائے۔ منظر اسلام کا قیام اس وقت عمل میں آیا، جب وہابی، دیوبندی اور دیگر فرقہائے باطلہ نے شان الوہیت اور شانِ رسالت میں گستاخیاں اور بدتمیزیاں کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک نامور قلم کار رقم طراز ہے:

> ''منظر اسلام کا وجود وقت کی اہم ضرورت اور وقت کا شدید تقاضہ تھا، اس کے علمی فیضان کا دور اس وقت شروع ہوا۔ جب کہ بساط ہند پر باطل فرقے اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ تسلط جما رہے تھے اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور متعدد اضلاع میں وہ اپنے پنجے گاڑ چکے تھے''

(صد سالہ منظر اسلام نمبر، پہلی قسط ص:۱۰۰)

اس حقیقت کی ترجمانی اور حق بیانی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

مشیت ایزدی کو منظر اسلام کا قیام اور علم دین کا اعلان منظور تھا، سید صاحب (امیر احمد)

مذکورامام احمد رضا کی خدمت میں یوں گویا ہوئے:

'حضرت اگر آپ نے مدرسہ کا قیام نہیں فرمایا، تو بدعقیدہ لوگوں دیوبندیوں، وہابیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا اور میں قیامت کے دن شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آپ کے خلاف نالش کردوں گا۔ یہ سننا تھا وہ بھی آل رسول کی زبان سے۔' امام احمد رضا لرزہ براندام ہو گئے اور فرمایا:

'سید صاحب آپ کا حکم بہ سروچشم منظور ہے۔ مدرسہ قائم کیا جائے۔ اس کے پہلے ماہ کے اخراجات میں خود ادا کروں گا، پھر بعد میں دوسرے لوگ اس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔' (تذکرہ جمیل، ص:۱۷۷)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے آفتاب نیم روز کی طرح عیاں ہو گیا کہ منظر اسلام کا قیام باطل فرقوں کی سرکوبی اور اسلامیات کے فروغ کے لیے عمل میں آیا تھا۔ یوں تو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اپنی گرانقدر تصنیفات وتالیفات سے دین حق کی اشاعت نیز باطل وگمراہ کن افکار ونظریات کا ردوابطال کا کام بہت تیزی اور سرگرمی سے انجام دے رہے تھے۔ لیکن آپ کی تحریر کردہ کتابوں کے مضامین اور فکر ونظر کو عوام تک پہنچانے اور مشتہر کرنے کے لیے ایسے باکمال اور بااخلاص علما وفضلا کی سخت ضرورت تھی کہ جو ملک وبیرون ملک کے طول وعرض میں پھیل کر اس خدمت کو انجام دے سکیں، چنانچہ جب جامعہ رضویہ منظر اسلام کا قیام عمل میں آ گیا اور ملک العلما جیسی شخصیت اس سرچشمۂ علم کے طالب علم بنے، تو چند سال ہی میں یہ کمی دور ہو گئی۔ ہر چہار جانب سے طلبائے علوم نبویہ مرکز علم وادب میں جمع ہو گئے اور درس وتدریس کا سلسلہ بام عروج کو پہونچ گیا۔ میرے اس دعوے کی تائید حضرت مولانا شاہ سلامت اللہ نقشبندی مجددی رامپوری کی معائنہ رپورٹ سے ہو رہی ہے، عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کو حسن ترقی روز افزوں عطا فرمائے، ہمت عالی اور توجہ خاص منتظم دفتر مولانا حسن رضا خاں صاحب دام مجدہم سے امید کامل ہے کہ اس مدرسہ مبارکہ سے جس کی نظیر اقلیم ہند میں کہیں نہیں ہے۔ ایسی

برکات فائض ہوں جو تمام اطراف و جوانب کی ظلمات اور کدورات کو مٹائیں اور ترویج عقائد حقہ حنفیہ اور ملت بیضاء شریفہ حنفیہ کے لیے ایسی مشعلیں روشن ہوں، جن سے عالم منور ہو۔" (روداد منظر اسلام ۱۳۲۳ء ص:۵۱)

یہ ابتدائی دور کی رپورٹ ہے، اب میں موجودہ دور کی رپورٹ پیش کر رہا ہوں، جس کو ایک بے باک قلم کار اور تنقید نگار نے لکھا ہے، وہ دور حاضر کے محقق اور بے بدل مفتی ہیں جنہیں دنیا مفتی شمشاد حسین کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے، موصوف منظر اسلام کی تعلیمی ترقی اور اس کی کامیابی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

'دار العلوم منظر اسلام وہ شجر پروقار ہے، جس کی شاخیں ہر طرف پھیلی ہوتی ہیں، اسی کے پھل اور پھول ہیں، جو ہند و بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر سال سیکڑوں کی تعداد میں یہاں سے علما فضلاء کی فراغت ہوتی ہے۔ حفاظ نکلتے ہیں اور قراء سند قرأت حاصل کرتے ہیں۔ یہ وہ چشمۂ صافی ہے، جس سے ذہن وفکر میں وسعت، علم وفن، گہرائی اور شخصیت میں جاذبیت پیدا ہوتی ہے، یہ وہ روشن منارہ ہے، جس سے علم کی روشنی، فکر کی روشنی سعادت مندی اور فیروز بختی کی روشنی پھیلتی ہے۔ یہ وہ معدن گوہر ہے، جہاں سے جوہر آبدار اور درنایاب دستیاب ہوتے ہیں۔ جس سے نہ صرف حال روشن ہوتا ہے۔ بلکہ مستقبل کے تمام زاویوں پر اس کی ضیا پڑتی ہے۔ یہ وہ کشت زعفران ہے، جس سے خوشبوئیں پھوٹ رہی ہیں اور ہر ایک کی مشام جاں کو معطر کر رہی ہیں۔ انہی خوشبوؤں کا کرشمہ ہے کہ آپ جہاں بھی جائیں گے، بریلوی کہلائیں گے۔ سچ ہے کہ "کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے۔" دار العلوم منظر اسلام صرف ایک علمی ادارہ ہی نہیں بلکہ میتھڈ آف اسکول ہے۔ جہاں سے امام احمد رضا فاضل بریلوی کے سماجی، حیاتیاتی، عمرانی، اقتصادی اور معاشی و تعلیمی نظریات کی اشاعت ہو رہی ہے۔ انہیں نظریات پر مسلک اعلیٰ حضرت یا بریلوی مسلک کا اطلاق ہوتا ہے۔

دعاء ہے خالق ارض وسما اس علمی ادارہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔ (صد سالہ منظر اسلام نمبر دوسری قسط ص:۱۹۳-۱۹۲)

مذکورہ بالا دونوں تاثراتی رپورٹ سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ''فروغ رضویات میں منظر اسلام کا کیا کردار رہا ہے۔ یہ تو ایک اشارہ ہے، جسے اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اب میں باقاعدہ طور پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دور حاضر میں اہل سنت و جماعت کا جو بھی تعلیمی و تنظیمی ادارہ جہاں کہیں بھی ہے وہ ''منظر اسلام'' ہی کے نور سے روشن اور منور ہے۔ اس میں منظر اسلام کا سدا بہار منظر بشکل بانی، ناظم، مہتمم، مدرس، منتظم نظر آرہا ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی حیثیت اور منصب سے قوم وملت کی خدمت انجام دے چکا ہے اور دے رہا ہے۔ میری بات کی تائید مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے۔

'منظر اسلام سے ایسے افراد ورجال پیدا ہوئے، جو امام احمد رضا کے سچے جانشین اور ان کے علوم ومعارف کے امین ووارث ہوئے۔ جن کی علمی قیادت ورہنمائی پر زمانے کو ناز ہے اور جن کی تحریر وتقریر اور نمایاں کردار نے حوادثات کا رخ موڑ دیا اور ایسا انقلاب برپا کیا۔ جس سے پندار وخیال کے بند دریچے کھل گئے۔ منظر اسلام سے علم وفضل کے ایسے رواں اور سیال چشمے پھوٹے، جن سے علم وفن کا گلستاں لالہ زار بن گیا اور اسے حیات نو کی سوغات تازہ ملی۔ منظر اسلام وہ فیض بار ممتاز درس گاہ ہے، جہاں سے مدرسین، مبلغین، مصنفین، محدثین، مناظرین ادباء وفضلا اور تنظیمی صلاحیت رکھنے والے افراد پیدا ہوئے اور آفاق کی وسعتوں میں پھیل گئے اور اس کے بام ودر سے علوم فنون کے ایسے شہنشاہ اور تاجور پیدا ہوئے کہ عالم میں جن کی علمی حکمرانی تسلیم کی گئی اور جن کی سعی وجستجو نے علم وفن کے دریا بہا دیئے۔

(صد سالہ منظر اسلام نمبر پہلی قسط، ص:۱۵۶)

میرے نظریہ کی تائید وتوثیق مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے، جو ڈاکٹر غلام جابر

شمس کے قلم سے نکلی ہے۔

"۱۳۲۲ء میں منظر اسلام کا قیام عمل میں آگیا، بعد میں یہی منظر اسلام بغداد العلم کہلایا، رشک یونان واصفہان بنا، غرناطہ سبک سار اور دہلی لکھنو شرمسار ہوا۔ بڑے بڑے مراکز سرنگوں ہوئے، اونچی درسگاہیں اور نامور تعلیم گاہیں للچائی نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہوگئیں۔ زمانہ شاہد ہے کہ برصغیر کے کرۂ زمین پر قدیم وجدید تعلیمی مراکز میں جو چراغ علم فروزاں ہے۔ اس کے روغن کا سر رشتہ مجدد اسلام اور منظر اسلام سے ضرور جڑا ہوا ہے۔ اس وقت دنیائے اہل سنت میں جتنے ادارے اور مدارس قائم ہیں، وہ سب کے سب مرکز اہل سنت جامعہ رضویہ منظر اسلام کے مرہون منت ہیں۔

(صدسالہ منظر اسلام نمبر پہلی قسط، ص:۱۷۲)

اب میں جامعہ رضویہ منظر اسلام کی ایک سو سات سالہ خدمات کو بحیثیت اہتمام چار دور میں تقسیم کررہا ہوں اور ہر ایک دور کے مخصوص فارغین کا نام بطور استشہاد پیش کررہا ہوں تاکہ قارئین کو بخوبی اندازہ ہوجائے کہ منظر اسلام اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے دست پاک سے قائم فرمودہ ایسا باغ سدابہار ہے کہ جس پر خزاں کبھی نہیں آئی اور نہ کبھی اس کی کلیاں پژمردہ ہوئیں کیوں کہ اس کی آبادکاری اور آبیاری میں خلوص، للہیت، عزم، حوصلہ کے عناصر کارفرما تھے۔ اس لیے اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی، رعنائی آج بھی اپنے کمال جوبن کے ساتھ صاحبان عقل وخرد اور ارباب فکر ونظر کو دعوت نظارہ حسن وجمال دے رہی ہے۔

پہلا دور: مہتمم حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں علیہ الرحمہ ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۳ء، ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۱ء تک یہ دور اہتمام اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی سرپرستی میں گزرا، اعلیٰ حضرت بقید حیات تھے، انھوں نے بنفس نفیس طلبہ کو پڑھایا۔ اس لیے ان کے کچھ مخصوص شاگردوں کا نام تحریر کرنا نہایت مناسب ہے۔

(۱) ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری (۲) علامہ عبدالرشید عظیم آبادی پٹنہ (۳) مولانا سید عزیز غوث بریلوی (۴) مولانا ابوالفیض غلام محمد بہاری (۵) مولانا مفتی نواب مرزا بریلوی (۶) مولانا ظہیر الدین اعظم گڑھ (۷) مولانا حفیظ احمد اعظم گڑھ (۸) مولانا نعمت اللہ نواکھالی (۹) مولانا صدیق احمد نواکھالی (۱۰) مولانا عظیم اللہ، مچھلی شہر (۱۱) مولانا احمد عالم رجہتی (۱۲) مولانا غلام مصطفیٰ ابراہیم بلیاوی (۱۳) مولانا مفتی محمد مصطفیٰ رضا خاں بریلوی (۱۴) مولانا محمد حسنین رضا خاں بریلوی (۱۵) مولانا سید فتح علی شاہ قادری سیالکوٹ (۱۶) مولانا مفتی غلام جان ہزاروی لاہور (۱۷) مولانا اکبر حسین خاں رام پوری (۱۸) مولانا برہان الحق رضوی جبل پوری (۱۹) مولانا عبدالواحد رضوی پاکستان (۲۰) مولانا حشمت علی خاں پیلی بھیتی (۲۱) مولانا حامد علی فاروقی پرتاب گڑھ۔

یہ وہ حضرات ہیں، جنہوں نے براہ راست اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی سے علم کی دولت حاصل کی اور اکناف عالم میں علم وحکمت کی جوت جگائی۔ آج پوری دنیا ان کی علمی صلاحیت اور فنی کمالات کا لوہا مان رہی ہے۔ فروغ رضویات میں ان لوگوں کا نمایاں کردار رہا ہے۔ حجۃ الاسلام جہاں ایک اعلیٰ کردار مہتمم تھے، وہیں درس وتدریس کے بھی بادشاہ تھے، اس لیے آپ نے اہتمام کے ساتھ تدریس کا بھی فریضہ انجام دیا۔ آپ کے مخصوص شاگردوں کا نام درج ذیل ہے۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم رضا خاں عرف جیلانی میاں بریلی، حضرت مولانا تقدس علی خاں حیدر آباد سندھ، حضرت علامہ سردار گورداسپوری محدث اعظم پاکستان۔ حضرت مولانا الیاس سیالکوٹی۔ حضرت مفتی اعجاز علی رضوی۔ حضرت مفتی وقار الدین۔ حضرت مولانا محمد بدیع الزماں مقصود پور بہار۔ حضرت مفتی اعجاز ولی۔ حضرت مفتی ظفر علی نعمانی۔ حافظ ملت مولانا عبدالعزیز مبارکپوری، بانی الجامعۃ الاشرفیہ۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے ایک تاریخ مرتب کی ہے اور دنیائے سنیت میں نام پیدا کیا ہے، یہ بھی حضرات منظر اسلام کے فارغین ہیں۔

دوسرا دور: مہتمم مفسر اعظم ہند مولانا ابراہیم رضا خاں جیلانی میاں علیہ الرحمہ ۱۹۴۳ء تا

۱۹۶۵ء، آپ کو اعلیٰ حضرت نے اپنی زبان مبارک قرار دیا تھا۔ آپ نے بھی اہتمام کی ذمہ داری نبھانے کے ساتھ ساتھ تدریس کا اہم فریضہ انجام دیا۔ آپ کے شاگردوں میں یہ چند نام قابل ذکر ہیں۔ ریحان ملت حضرت علامہ ریحان رضا خاں رحمانی میاں، تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں ازہری، حضرت مولانا سید محمد عارف صاحب نانپاروی، حضرت علامہ مولانا مفتی عبدالواجد صاحب، حضرت علامہ مولانا مفتی غلام مجتبیٰ اشرفی صاحب کوسیاری، حضرت مولانا مظہر حسن بدایونی، حضرت مولانا شاہ محمد صاحب افریقہ۔ حضرت مولانا محمد حنیف صاحب برطانیہ۔ حضرت مولانا محمد صفی صاحب برطانیہ۔ حضرت مولانا عبدالحکیم پر بھیلی کٹیہار، حضرت مولانا عبدالخالق صاحب پورنوی سابق نائب شیخ الحدیث منظر اسلام۔

تیسرا دور: مہتمم ریحان ملت مولانا ریحان رضا خاں رحمانی میاں علیہ الرحمہ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۸۵ء، آپ تو چمنستان رضا کے ریحان تھے۔ آپ کی خوشبو سے سارا جہاں معطر ہے۔ آپ کی علمی صلاحیت اور قابلیت اور اعلیٰ نظامت کے سبھی معترف ہیں۔ آپ نے بھی اہتمام کے ساتھ ساتھ تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ آپ کے دور اہتمام اور تدریس کے چند مشاہیر فضلا اسلام درج ذیل ہیں:

حضرت مولانا محمد حنیف خاں صاحب مؤلف جامع الاحادیث، حضرت مولانا محمد انور علی رضوی نانپارہ مدرس منظر اسلام۔ حضرت مولانا ڈاکٹر جمیل احمد خاں لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ حضرت مولانا صغیر احمد صاحب ناظم اعلیٰ الجامعۃ القادریہ رچھا۔ حضرت مولانا سید شاہد علی صاحب صدر المدرسین وشیخ الحدیث الجامعۃ الاسلامیہ رام پور۔ حضرت علامہ مولانا سید اجمل حسین اشرفی جیلانی کچھوچھہ شریف۔ حضرت مولانا سید مہدی حسن اشرفی اجمیر شریف۔ شیر قادریت حضرت مولانا محمد مختار احمد صاحب بہیڑی، حضرت مولانا تطہیر احمد صاحب دھوڑا ٹانڈہ۔ حضرت مولانا علاء الدین گجرات۔ حضرت علامہ مولانا غلام یٰسین صاحب ناظم اعلیٰ الجامعۃ النظامیہ ملک پور ہاٹ۔ حضرت علامہ مولانا امام اختر صاحب صدر المدرسین الجامعۃ النظامیہ ملک پور ہاٹ۔ حضرت مولانا کمال احمد خاں صاحب نانپارہ۔ حضرت مولانا عبدالحمید صاحب افریقہ۔ حضرت مولانا عبدالہادی صاحب افریقہ۔ حضرت مولانا مرغوب حسن صاحب

اعظم گڑھ۔ راقم الحروف (محمد اعجاز انجم لطیفی) نائب صدر المدرسین جامعہ رضویہ منظر اسلام بریلی۔ حضرت مولانا محمد ایوب عالم صاحب مدرس جامعہ رضویہ منظر اسلام بریلی شریف۔ حضرت مولانا سید محمد احسن صاحب صدر المدرسین جامعہ فاطمہ شاہ جہان پور۔

چوتھا دور: مہتمم حضرت مولانا سبحان رضا خاں سبحانی میاں دام ظلکم علینا ۱۹۸۵ء تا ہنوز، آپ ایک خاموش طبیعت انسان ہیں، گوشہ نشینی کی زندگی گزارنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے آپ نہایت خاموشی کے ساتھ ماہنامہ اعلیٰ حضرت کی ادارت، خانقاہ عالیہ رضویہ کی سجادگی، رضا مسجد کی تولیت اور جامعہ رضویہ منظر اسلام کی نظامت واہتمام کا بھی فریضہ اجام دے رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ سارے امور کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ دن بدن ہر چیز میں تبدیلی اور ترقی لانے کی بھرپور کوشش کرر ہے ہیں۔ خدائے پاک آپ کا جذبہ اور حوصلہ سلامت رکھے۔ آپ کے دور اہتمام میں فارغین کی کثرت ہوگئی ہے۔ جس کا اندازہ سال بہ سال کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے۔ چند مشہور ومعروف فارغین کے نام درج ذیل ہیں۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ رضوی شیخ الحدیث مظہر العلوم گرسہائے گنج۔ حضرت مولانا سلطان رضا نوری ناظم اعلیٰ دار العلوم مفتی اعظم بہرائچ۔ حضرت مولانا ڈاکٹر محمود حسین اشرفی، پروفیسر بریلی کالج بریلی۔ حضرت مولانا محمد یونس رضا مونس اویسی نائب صدر المدرسین جامعۃ الرضا بریلی شریف۔ حضرت مولانا نشتر فاروقی نائب ناظم جامعۃ الرضا بریلی شریف۔ حضرت مولانا سید کفیل احمد ہاشمی مفتی دار الافتا منظر اسلام۔ حضرت مولانا محمد احتشام الدین صاحب نوادہ بہار۔ حضرت مولانا شاہ جہاں صاحب بنگال۔ حضرت مولانا سید محمد حسین افریقہ۔ حضرت مولانا محمد حنیف رضوی رامپور۔ حضرت مولانا محمد ظہور الاسلام صاحب خطیب وامام رضا مسجد بریلی شریف۔ حضرت مولانا ماہ زماں صاحب شیخ الحدیث جامعہ حضرت بلال بنگلور۔ حضرت مولانا غلام مدنی اشرفی صاحب صدر المدرسین وشیخ الحدیث توقیر العلوم چورو راجستھان۔ حضرت مولانا ذاکر حسین صاحب مدرسہ عربی کشن گنج۔ حضرت مولانا ابوالکلام سلطان پور۔ حضرت مولانا غلام ربانی کشن گنج۔ حضرت مولانا صوفی زبیر میاں قادری خلیفہ تاج

الشریعہ۔ حضرت مولانا عقیل احمد پورنیہ، حضرت مولانا ابوالحسن نوری۔

اس طرح سے چاروں ادوار کے فارغین کی فہرست نام بنام مرتب کی جائے، تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اس کا اندازہ قارئین سال بہ سال کے فارغین کی مجموعی تعداد سے لگا سکتے ہیں۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۷۳ء تک کے ریکارڈ خرد برد اور منتشر ہونے کی وجہ سے سال بہ سال فارغین کی مجموعی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن ۱۹۷۴ء سے باضابطہ ریکارڈ موجود ہے۔ موجودہ ریکارڈ پر قیاس کرتے ہوئے گزشتہ سالوں کے فارغین کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

فارغین کی تعداد سال بہ سال درج ذیل ہے۔

سنہ	تعداد	سنہ	تعداد	سنہ	تعداد	سنہ	تعداد
۱۹۷۴	۲۹	۱۹۷۹	۴۵	۱۹۸۴	۱۸۵	۱۹۸۸	۲۴۵
۱۹۷۵	۵۸	۱۹۸۰	۵۰	۱۹۸۵	۲۲۴	۱۹۸۹	۱۶۳
۱۹۷۶	۴۳	۱۹۸۱	۵۱	۱۹۸۶	۲۳۶	۱۹۹۰	۲۴۰
۱۹۷۷	۶۱	۱۹۸۲	۶۴	۱۹۸۷	۲۳۹	۱۹۹۱	۲۴۰
۱۹۷۸	۴۷	۱۹۸۳	۱۰۳	۱۹۸۸	۳۵۵	۱۹۹۲	۱۹۳

سنہ	تعداد	سنہ	تعداد	سنہ	تعداد	سنہ	تعداد
۱۹۹۳	۱۶۷	۱۹۹۸	۱۴۹	۲۰۰۲	۲۳۳	۲۰۰۷	۳۷۶
۱۹۹۴	۱۶۸	۱۹۹۹	۱۴۵	۲۰۰۳	۱۷۵	۲۰۰۸	۳۱۹
۱۹۹۵	۲۳۰	۲۰۰۰	۱۴۵	۲۰۰۴	۲۸۴	۲۰۰۹	۴۳۴
۱۹۹۶	۱۸۳	۲۰۰۰	۱۴۵	۲۰۰۵	۲۱۹	۲۰۱۰	۴۹۷
۱۹۹۷	۱۳۸	۲۰۰۱	۲۲۰	۲۰۰۶	۳۰۸		

مذکورہ بالا تعداد صرف فضلاء کی ہے، حفاظ وقراء کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے، اگر انہیں بھی شامل کرلیا جائے، تو تعداد میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔

چند اکابر فارغین کا مختصر تعارف: **ملک العلما ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ** آپ ۲۹/ اکتوبر ۱۸۸۰ء میں بمقام موضع رسول پور میجرا ضلع نالندا صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں والد ماجد نے تعلیم شروع کرادی۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی۔ متوسطات کی تعلیم آپ نے مختلف مدارس میں حاصل کی۔ جب ان مدارس سے علم کی تشنگی دور نہ ہوسکی، تو آپ بریلی شریف اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ ہی کے دم قدم سے منظر اسلام کی بنیاد پڑی اور تعلیم کا آغاز ہوا۔ آپ نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے بخاری شریف کا درس لیا، ساتھ ہی ساتھ علم جفر، علم توقیت وغیرہ جملہ علوم وفنون کو بھی حاصل کیا۔ پھر ۱۳۲۵ھ میں علما ومشائخ کے جم غفیر میں آپ کی دستار بندی ہوئی۔ فراغت کے بعد آپ نے جامعہ رضویہ منظر اسلام میں لگاتار تین سال تک تدریس کا کام انجام دیا۔ پھر اعلیٰ حضرت ہی کے حکم سے آپ بحیثیت خطیب وواعظ شملہ تشریف لے گئے۔

حضرت مولانا حامد علی فاروقی علیہ الرحمہ: آپ کی ولادت ۱۸۸۹ء بمقام چند باضلع الہ آباد میں ہوئی۔ ابتدائی علم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ مزید تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے چچا عابد علی فاروقی کے ہمراہ لکھنؤ آگئے۔ آپ نے پورے شوق ولگن کے ساتھ فرنگی محل لکھنو میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ دوران تعلیم اکثر آپ اپنے چچا کے ساتھ قطب دیوہ حضرت وارث پاک کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قطب دیوہ نے روٹی کا ایک ٹکڑا چبا کر آپ کو عنایت کیا۔ آپ نے بسم اللہ شریف پڑھ کر اسے کھالیا۔ حضرت وارث پاک نے پیشانی پر سعادت کے آثار اور روشن مستقبل کا اجالا دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ اس کی صحیح تعلیم مجدد وقت اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا احمد رضا خاں کے فیضان کے سایہ تلے ہوگی۔ آپ کے چچا اپنے ہونہار بھتیجے کو لے کر بریلی شریف حاضر ہوئے اور اعلیٰ حضرت کی خدمت میں اپنے بھتیجے کو پیش کردیا۔ کچھ سالوں تک وہ اس نابغۂ عصر کی بارگاہ میں رہ کر ان کے خرمن علم سے بالیاں چنتے

رہے اور اس ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ کے فیضان علم سے سیرابی حاصل کرتے رہے۔ ۱۳۴۰ھ میں منظر اسلام سے آپ کی فراغت ہوئی۔ آپ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں، جن کی سند پر سرکار اعلیٰ حضرت نے دستخط فرمایا۔

حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم فریدی سمستی پوری علیہ الرحمہ: آپ کی ولادت ۱۹۱۰ء میں بمقام سمستی پور صوبہ بہار میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مولوی جعفر علی فریدی ہے، سلسلۂ نسب حضرت بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہ سے ہے۔ آپ نے اردو فارسی کی تعلیم مولوی سید ثناء الدین صاحب سے حاصل کی۔ عربی تعلیم کا آغاز حضرت مولانا شاہ منظور احمد پھلواری سے کیا۔ مولوی سید عتیق اللہ صاحب ساکن ہرلودھی ضلع مظفر پور اور مولوی محمد ادریس دہلوی سے صرف ونحو اور ابتدائی کتب درس نظامی پڑھیں، مدرسہ حمیدیہ دربھنگہ میں مولانا سید عبدالحیٔ قادری اور مفتی محمد فیض الرحمٰن سے پڑھ کر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے مولوی کا امتحان دیا۔ پٹنہ سے آپ کچھ دنوں کے لیے کانپور چلے آئے۔ وہاں مولانا غلام یحیٰ ہزاروی اور مولانا ابومحمد عبدالسلام قندھاری سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ پھر آپ نے مدرسہ منظر اسلام میں داخلہ لیا۔ حضور حجۃ الاسلام اور اساتذۂ منظر اسلام سے صحاح ستہ کا دورہ کیا اور تفسیر بیضاوی کا درس لیا۔ ۱۳۵۱ھ میں آپ کی دستار بندی ہوئی۔ سند فراغت واجازت حاصل کرنے کے بعد آپ نے مدرسہ منظر اسلام ہی سے تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر مدرسہ قادریہ بدایوں تشریف لے گئے اور ۱۹۴۲ء سے مدرسہ شمس العلوم گھنٹہ گھر بدایوں میں صدر المدرسین کے منصب پر فائز ہوگئے۔

حضرت مولانا غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ: امام النحو حضرت مولانا غلام جیلانی ابن مولوی حاجی غلام فخر الدین ۱۹۰۰ء میں ریاست دادوں ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گھر میں حاصل کی۔ چہارم درجہ پرائمری تک تعلیم پانے کے بعد آپ کے چچا حضرت مولانا غلام قطب الدین برہمچاری نے آپ کو جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں جو اس وقت مدرسہ انجمن اہل سنت کے نام سے مشہور تھا، لے جاکر داخل کردیا۔ آمدنامہ سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب فتح پوری سے فصول اکبری اور کافیہ پڑھی۔ ۱۹۲۳ء میں

حضرت مولانا قاضی شمس الدین احمد جونپوری کے ہمراہ اجمیر شریف بغرض تعلیم پہنچے۔ امتحان داخلہ کے بعد درجہ شرح جامی میں داخلہ ملا۔ آٹھ سال تک سالانہ امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے رہے۔ ملاحسن کے تحریری امتحان میں ممتحن کی تحسین پر دارالعلوم نے چار روپے انعامی وظیفہ مقرر کیا۔ ۱۳۵۱ھ میں صدر الشریعہ مولانا امجد علی مصنف بہار شریعت کی ہم رکابی میں مدرسہ منظر اسلام بریلی آئے۔ یہاں شرح چغمینی اور محقق دوانی کے غیر مطبوعہ حواشی قدیمہ وجدیدہ کے ساتھ شرح تجرید اور امام رازی علیہ الرحمہ اور طوسی کی شروح کے ساتھ اشارات کا سبق لیا۔ ۱۳۵۲ھ میں مدرسہ منظر اسلام کے سالانہ جلسہ میں حضور حجۃ الاسلام نے آپ کے سر پر دستار فضیلت باندھی اور سند عنایت فرمائی۔

حافظ ملت حضرت مولانا عبدالعزیز مرادآبادی علیہ الرحمہ: آپ قصبہ بھوجپور ضلع مرادآباد میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں ہوئی۔ ان ایام میں حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب جامعہ معینیہ اجمیر شریف میں تدریسی خدمات پر معمور تھے۔ ساتھیوں کے مشورہ کے پیش نظر صدر الشریعہ کی خدمت میں اجمیر شریف تشریف لے گئے۔ وہاں پر تقریباً نو سال تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں جب صدر الشریعہ جامعہ معینیہ اجمیر شریف سے مستعفی ہو کر دارالعلوم منظر اسلام تشریف لائے، تو آپ بھی ان کے ساتھ منظر اسلام بریلی شریف آگئے۔ منظر اسلام میں صدر الشریعہ کے علاوہ دیگر اساتذہ سے علم حدیث، تفسیر، فقہ، کلام وغیرہ حاصل کیا۔ ۱۳۵۱ھ میں علماء کرام ومشائخ عظام کے ہاتھوں سے منظر اسلام کے سالانہ جلسہ میں آپ کے سر پر دستار فضیلت رکھی گئی اور آپ کو سند تکمیل درس نظامی سے سرفراز کیا گیا۔

شمس العلما حضرت مولانا غلام مجتبیٰ اشرفی علیہ الرحمہ: آپ کی ولادت ۱۹۲۷ء میں ضلع کشن گنج کے گاؤں کوسیاری میں والد ماجد خادم علی ابن خیرات علی کے گھرانے میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے ہی گھر میں ہوئی۔ فارسی کی تعلیم علامہ نصیرالدین صاحب خلیفہ اشرفی میاں علیہ الرحمہ کے پاس ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں بحر العلوم کٹیہار بغرض حصول تعلیم حاضر

ہوئے۔ وہاں ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری سے اکتساب علم وفن کیا۔ ۱۹۵۶ء میں دنیائے سنیت کی مشہور ومعروف درسگاہ مرکز اہل سنت جامعہ رضویہ منظر اسلام بریلی شریف میں داخل ہوئے، یہاں پر آپ نے علوم وفنون کے حصول میں دو سال گزار دیئے۔ ۱۹۵۹ء میں جامعہ رضویہ منظر اسلام کے سالانہ جلسہ میں آپ کے سر پر علماء ومشائخ نے دستار فضیلت باندھی۔

چوں کہ آپ پڑھنے میں کافی ذہین وفطین تھے۔ اس لیے حضور مفسر اعظم ہند علیہ الرحمہ نے آپ کو بعد فراغت مدرس کی حیثیت سے رکھ لیا۔ پھر ۱۹۶۹ء میں حضور ریحان ملت نے آپ کو بحر العلوم مفتی سید افضل حسین صاحب مونگیری کی جگہ پر منصب صدارت کے فرائض سونپ دیئے۔ پھر اس کے بعد دار العلوم دیوان شاہ بھیونڈی تشریف لے گئے۔ ۲۲ رسال تک وہاں پر آپ نے صدر المدرسین کا فریضہ انجام دیا۔ پھر جامعہ کے موجودہ مہتمم حضرت علامہ مولانا سبحان رضا خاں سبحانی میاں قبلہ نے آپ کو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا۔

ریحان ملت حضرت مولانا محمد ریحان رضا خاں رحمانی میاں علیہ الرحمہ: آپ کی ولادت ۱۹۳۴ء میں محلّہ خواجہ قطب بریلی شریف میں ہوئی۔ ولادت سے پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خاندان کے ہر فرد کا چہرہ مسکرانے لگا۔ چوں کہ نبیرۂ اعلیٰ حضرت مفسر اعظم ہند کے یہاں یہ پہلی ولادت تھی۔ کانوں میں اذان وتکبیر پڑھی گئی۔ حجۃ الاسلام نے اپنا لعاب دہن عطا فرمایا، جو منہ میں رکھ دیا گیا۔ جد امجد حجۃ الاسلام نے محمد نام رکھا۔ بعدہ پکارنے کے لیے ریحان رضا تجویز فرمایا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے اپنے نعتیہ کلام میں تحریر فرمایا ہے۔

نام یہ جس نے دیا اس کو خبر تھی شاید
ان کا ریحان رضا زمانے میں چمکتا ہوگا

پیدائش کے بعد ریحان ملت نے طفولیت کے ایام علم وحکمت معرفت وطریقت کے خوش گوار ماحول میں گزارے۔ بچپن ہی سے علم وادب کے دلدادہ تھے۔ اعلیٰ ذہانت وفطانت رکھتے تھے۔ ریحان ملت کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ کچھ دنوں کے لیے والد ماجد کے حکم پر آپ لائل پور پاکستان تشریف لے گئے۔ وہاں پر جامعہ رضویہ مظہر اسلام میں داخلہ لے کر محدث

اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد سردار احمد رضوی لائل پوری کی خدمت میں تین سال مسلسل رہ کر معیاری کتابوں کا درس حاصل کیا۔ پھر وہاں سے واپسی کے بعد آپ نے دار العلوم منظر اسلام بریلی شریف میں درس نظامی کی تکمیل کی اور سند فراغت حاصل کی۔

سند فراغت حاصل کرنے کے بعد منظر اسلام میں بحیثیت مدرس بارہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ایک طویل مدت کے بعد مدرسین کی کمی کی وجہ سے دوبارہ ۱۹۸۲ء ۱۹۸۵ء تک دار العلوم منظر اسلام میں شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہے۔

تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں ازہری قاضی القضاۃ بریلی شریف: آپ کی ولادت محلّہ سوداگران بریلی شریف میں ہوئی۔ جب آپ کی عمر چار سال چار ماہ چار دن کی ہوئی تو والد ماجد مفسر اعظم ہند نے تقریب بسم اللہ خوانی کے بعد آپ نے اپنی والدہ ماجدہ سے قرآن مجید ناظرہ ختم کیا۔ اسی دوران والد ماجد سے اردو کی کتابیں پڑھیں۔ گھر پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد والد بزرگوار نے دار العلوم منظر اسلام میں داخل کرادیا۔ نحو میر، میزان، منشعب، وغیرہ منتہی درجہ تک کی کتابیں دار العلوم منظر اسلام کے کہنہ مشق اساتذہ کرام سے پڑھیں۔ پھر ۱۹۶۳ء میں جامعہ ازہر مصر تشریف لے گئے۔ وہاں مسلسل تین سال تک جامعہ ازہر کے فن تفسیر وحدیث کے ماہر اساتذہ سے اکتساب علم کیا۔ جامعہ ازہر مصر کے شعبۂ کلیہ اصول الدین کا سالانہ امتحان اگرچہ تحریری ہوتا تھا۔ مگر معلومات عامہ کا امتحان تقریری ہوتا تھا۔ چنانچہ جامعہ کے سالانہ امتحان کے موقع پر ممتحن نے آپ کی جماعت سے علم کلام کے چند سوالات کیے۔ پوری جماعت میں سے کوئی ایک طالب علم بھی ممتحن کے سوالات کے صحیح جوابات نہ دے سکا۔ ممتحن نے روئے سخن آپ کی طرف کرتے ہوئے سوالات کو دہرایا۔ آپ نے ان سوالات کا ایسا شافی وکافی جواب دیا کہ ممتحن تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا کہ ''آپ تو حدیث واصول حدیث پڑھتے ہیں، تب علم کلام میں کیسے جواب دیا۔ آپ نے جواب میں کہا میں نے دار العلوم منظر اسلام بریلی میں علم کلام پڑھا تھا۔

حضرت مولانا سید محمد عارف رضوی، سابق شیخ الحدیث منظر اسلام بریلی: آپ

نانپارہ ضلع بہرائچ میں ۷/مارچ ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے اور وہیں اپنے والدین کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ آپ کی تعلیم وتربیت آپ کے والدین نے ابتداء گھر ہی میں کرائی۔ ایک ماسٹر اور ایک مولانا صاحب آپ کو بہت دنوں تک گھر پر ہی پڑھاتے رہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد پرائمری اسکول نانپارہ میں داخلہ کرایا گیا۔ پرائمری کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد آپ کے والد نے آپ کو مولانا سبحان اللہ امجدی کے سپرد کردیا۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں آپ نے ان سے پڑھیں۔ ۱۹۵۶ء میں آپ جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں داخل ہوگئے۔ ایک سال وہاں تعلیم حاصل کی۔ آپ کے مشفق استاذ قاری علی حسین جامعہ نعیمیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر شہر بستی کے ایک مدرسہ معین الاسلام تشریف لے گئے۔ انہی کے ساتھ آپ بھی بستی پہونچ گئے۔ وہاں جاکر عربی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں، شعبان المعظم میں جب آپ چھٹیاں گزارنے اپنے وطن نانپارہ پہونچے تو آپ کی ملاقات حضور مفسر اعظم ہند سے ہوگئی، آپ کی نیازمندانہ طبیعت اور ذہانت وفطانت نے حضور مفسر اعظم ہند کو متاثر کیا۔ بعض بزرگوں کی سفارش پر مفسر اعظم ہند نے آپ کو بریلی شریف منظر اسلام میں پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح سے آپ منظر اسلام میں داخل ہوگئے۔ چند ہی دنوں بعد جب مفسر اعظم ہند نے آپ کا تعلیمی ذوق وشوق دیکھا۔ تو ان کی خصوصی توجہ آپ کی جانب مائل ہوگئی، خصوصی توجہ کا نتیجہ تھا کہ آپ دن بدن ترقی کرتے چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم منظر اسلام بریلی شریف سے آپ کی فراغت ہوئی۔

حضرت مولانا عبدالخالق رضوی سابق شیخ الحدیث جامعہ رضویہ منظر اسلام بریلی شریف: آپ کی ولادت سرزمین تاراباڑی بائسی پر ۱۹۵۱ء میں ہوئی، آپ کے والد کا آبائی مکان موضع گڑھیال ضلع پورنیہ ہے۔ آپ جب سخن آموزی کی منزل پر پہونچ گئے، تو آپ کے والد ماجد نے آپ کی رسم بسم اللہ خوانی حافظ محمد ابراہیم سے کرائی۔ پھر باقاعدہ آپ نے کتب درس نظامی کی ابتداء حضرت مولانا قمرالدین اشرفی سے کی۔ حضرت مولانا قمرالدین اشرفی بڑے فیاض عالم باعمل عربی وفارسی کے ماہر استاذ تھے۔ ابتائی کتابیں ان سے پڑھنے کے بعد آپ نے

حصول علم کے لیے علاقے کے مختلف مدرسوں کا سفر کیا۔ مدرسہ اشرفیہ چندر گاؤں پورنیہ بہار، مدرسہ مظہر اسلام اشرفیہ ہجلہ بائسی پورنیہ بہار پھر آخر میں ۱۹۶۲ء کو دارالعلوم منظر اسلام بریلی شریف حاضر ہوئے۔ یہاں پہونچ کر شرح جامی، شرح تہذیب حضرت مولانا مفتی محمد جہانگیر رضوی مونگیری اور حضرت علامہ مولانا احسان علی رضوی محدث منظر اسلام بریلی سے پڑھیں۔ ۱۹۶۷ء میں منظر اسلام کی سالانہ جلسہ میں علما و مشائخ کے ہاتھوں سے آپ کے سر پر دستار فضیلت رکھی گئی۔ فراغت کے بعد ہی سے آپ منظر اسلام کے مدرس ہو گئے۔ اس وقت سے لے کر ۲۰۱۰ء تک آپ جامعہ کے مدرس رہے۔ گورنمنٹ کے احکام کے مطابق جون ۲۰۱۰ء میں منصب تدریس سے آپ سبکدوش ہو گئے۔

یہ وہ چند اکابر اور مشاہیر فارغین منظر اسلام ہیں کہ جنہوں نے نہایت ذوق وشوق اور پوری دیانت داری کے ساتھ قوم وملت کی خدمت کا فریضہ انجام دیا اور فروغ رضویات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس طرح کے فارغین کی تعداد ہزاروں میں ہیں۔ اگر فردا فردا ہر ایک کا تعارف کرایا جائے تو کتنی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

اتنی عظیم تعداد اور کثرت کے باوجود کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے صرف تصنیفات وتالیفات کے ذریعے دشمنان دین سے لڑنے کے لیے ہتھیار تیار کیا، فوج تیار نہیں کی۔ فوج کسی اور نے تیار کی۔ اس طرح کی سوچ اور نظریہ عوام کے اندر پیدا کرنا کس بات کی غمازی کر رہا ہے؟ اہل علم کے لیے یہ نظریہ لمحہ فکریہ سے کم نہیں۔

چراغ سے چراغ چلے: اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے فرقہائے باطلہ کی تیز تند آندھی اور کفر وگمرہی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں منظر اسلام کا چراغ جلایا، اللہ کے فضل وکرم سے اس چراغ کی روشنی اکناف عالم میں پہونچ گئی۔ پھر چراغ سے چراغ جلنے شروع ہو گئے۔ جگہ جگہ مدارس اور دینی وملی ادارے قائم ہوتے چلے گئے۔ آج ہر طرف نور ہے اجالا ہے۔ سنیت کا بول بالا ہے۔ رضویات کا چرچہ ہے۔ مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرہ ہے۔ یہ سب منظر اسلام ہی کا کارنامہ ہے۔ منظر اسلام اہلسنت وجماعت کا ایک ایسا چراغ ہے کہ جس سے مدارس کے

لاتعداد چراغ روشن ہوئے اور اسکا دائرہ بریلی شریف سے لے کر بنگلہ دیش، پاکستان اور تمام افریقی یورپی ممالک تک پھیل گیا۔ عصر حاضر کے ہر سنی مدرسے میں منظر اسلام کا حسین منظر نظر آتا ہے۔ مذکورہ معلومات اور حوالہ جات کی روشنی میں مجھے یہ لکھنے میں کوئی دریغ نہیں کہ آج ہندو بیرون ہند اہل سنت و جماعت کے جتنے مدارس قائم ہیں وہ سب جامعہ رضویہ منظر اسلام ہی کے مرہون منت ہیں۔ کیوں کہ سارے مدارس کے اساتذہ مہتمم، ناظم، سبھی حضرات بلاواسطہ یا بالواسطہ منظر اسلام کے خوشہ چیں ہیں، میرے اس قول اور دعوے کی تائید مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے۔

منظر اسلام نے قوم وملت کو جہاں ہزاروں علما، فقہا، محدثین، مفسرین فصحاء، بلغاء مقررین، مبلغین، شعراء، ادبا، اور معلمین ومدرسین عطا کئے ہیں، وہیں سیکڑوں مدارس ومکاتب ہزاروں کتب وتصانیف اور لاکھوں تحقیقی فتاویٰ بھی عطا کیے ہیں۔ منظر اسلام کے فارغین ومستفیدین نے ملک وبیرون ملک میں جو دینی مدارس قائم کیے وہ بھی بالواسطہ منظر اسلام کی دین ہیں۔ (جشن صد سالہ منظر اسلام نمبر دوسری قسط۔ ص:۱۶۶)

اسی طرح کی چشم کشاں ایک اور عبارت ملاحظہ فرمائیے:

'منظر اسلام نے قوم وملت کو علم وحکمت کے ایسے درخشندہ ستارے عطا کیے، جس کی روشنی سے گم گشتگان راہ کو اپنی منزل کا سراغ ملا۔ فرزندان اسلام کو علوم وفنون کے ایسے ماہتاب وآفتاب عطا کیے۔ جن کی ضیاء بار کرنوں سے جہاں اہل سنت کا گوشہ گوشہ جگمگا رہا ہے۔ برصغیر ہندو پاک بنگلہ دیش اور برما کی سرحدوں سے نکل کر افریقہ، امریکہ، ہائی لینڈ، تھائی لینڈ اور دوسرے ممالک میں دین کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ درحقیقت منظر اسلام ہی کا فیض بانٹ رہے ہیں۔ کیوں کہ ہر شبستان علم وادب میں منظر اسلام ہی کا چراغ جل رہا ہے۔ فن وحکمت کی ہر شمع کا سررشتہ منظر اسلام سے جڑا ہوا ہے۔ مشرق سے مغرب تک کی فضائیں اسی گلستان علم وآگہی کی دلنواز خوشبوؤں سے معطر ومشکبار ہیں۔

کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

منظر اسلام نے رجال علم وحکمت کا ایسا طاقتور دستہ عطا کیا ہے، جو ہر محاذ پر اپنے دست وبازو آزما سکتا ہے۔ ان میں درسگاہوں میں علم وحکمت کے موتی لٹانے والے بھی ہیں اور فن تصنیف وتالیف کے ماہرین بھی۔ میدان خطابت کے شعلہ بار مقررین بھی ہیں اور محفل عشق وعرفان کے مسند نشین بھی۔ ملکی وعالمی سیاست کے تجربہ کار بھی ہیں اور ایوان باطل میں زلزلہ برپا کردینے والے مناظرین بھی۔ عصری علوم وفنون پر مہارت رکھنے والے علماء بھی ہیں اور عالمگیر سطح پر پیغام اسلام پہونچانے والے مبلغین بھی۔ فقہی بصیرت رکھنے والے ارباب فقہ وافتا بھی ہیں اور شعر وسخن کی زلفیں سنوارنے والے اصحاب شعر وادب بھی اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے صحراؤں میں علم وادب کا گلشن آباد کررکھا ہے۔ (ماہنامہ اعلیٰ حضرت کا جشن زریں نمبر ص:۲۵۴۔۲۵۳)

مذکورہ حوالہ جات اور شواہد کے پیش نظر یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ فروغِ رضویات میں منظر اسلام کا ایک اہم اور کلیدی کردار رہا ہے۔ جو ہنوز جاری وساری ہے۔ خدائے پاک کی بارگاہ میں میری دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب لولاک کے صدقے میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا لگایا ہوا شجر سدابہار منظر اسلام تا قیامت پھلتا اور پھولتا رہے آمین بجاہ سید المرسلین۔



مولانا محمد شاہد القادری
چیئرمین امام احمد رضا سوسائٹی کلکتہ

کلکتہ میں فکر رضا کی تابشیں

سیدنا مخدوم علاء الحق پنڈوی علیہ الرحمہ کا بنگال جو ہندوستان کے نقشہ پر مغربی بنگال کے نام سے متعارف ہے جہاں حضرت مخدوم بنگال شاہ علاء الحق پنڈوی اور آپ کے مرشد برحق، خلیفہ حضرت محبوب الٰہی آئینہ ہند سیدنا شاہ سرج اخی پاک کے مرقد انوار مرجع خلائق ہیں۔ اسی خطۂ نور میں سیدنا مخدوم سمنان کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے تخت و تاج کو خیر باد کہہ کر تشریف لائے۔ عشق و عرفاں کا جام پی کر خوشبودار ہوئے اور قلب و جگر کو صیقل فرمایا۔

مغربی بنگال کی راجدھانی کلکتہ تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے اپنے اندر بہت سی خوبیاں سمیٹے ہوئے ہے جو انگریزی دور حکومت میں ہندوستان کا درالسلطنت رہا اور ایشیا میں تجارتی منڈی کا ایک اہم مرکز بن کر ابھرا۔

اس شہر نشاط میں اسلام کی کرن پھیلی، علما ربانین کے تبلیغی دورے سے اسلامی تہذیب وثقافت بام عروج ملا، مرشدان طریقت نے خانقاہوں کو قائم کر کے زنگ آلود دلوں کو تزکیہ کیا۔ قائدین ملت نے اسلامی تحریکات کے ذریعہ امت مسلمہ کی قیادت فرمائی۔ مدارس اسلامیہ کے توسط سے قال اللہ وقال الرسول کی نغمہ سنجی کی گئی اور اصحاب صحافت نے اپنے قلم کی سیاہی سے انسانی سوچ وفکر میں اسلامی انقلاب پیدا کیا گویا کہ یہ شہر عشق و عرفاں، علم وشائستگی اور اسلامی افکار ونظریات کا سر چشمہ بن گیا۔

اس تجارتی منڈی میں اسلامی روح پھونکنے میں جن عناصر نے مرکزی کردار ادا کیے ہیں وہ ہیں اسلامی شخصیات، اسلامی تحریکات، اسلامی کتب، اسلامی دانش گاہیں اور اسلامی صحافت۔ لطف کی بات یہ کہ یہ عناصر جلیلہ چودہویں صدی کے مجدد اعظم سیدنا امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ کے افکار و نظریات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ اسی تحریک کا ایک حصہ ہے کہ سرزمین کلکتہ میں فکر رضا کے تابندہ نقوش کو قلم بند کیا جائے اور فروغ رضویات میں جو عوامل سرگرم عمل رہے ہیں انہیں صفحات قرطاس پر محفوظ کر لیا جائے تا کہ تاریخ کا ایک روشن باب بن جائے۔ سر فکر رضا کے حوالے سے حضرت مفتی محمد شمشاد حسین رضوی صاحب قبلہ (بدایوں) نے بہت ہی اچھے پیرائے میں حسین جملوں کے ساتھ اپنے موقف کا اظہار کیا ہے کہ:

> ''امام اہل سنت محدث بریلوی رضی اللہ عنہ کی فکر، فکر رضا کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی عام اور سادی فکر نہیں بلکہ اس کا رشتہ تخلیقی عمل سے جڑا ہوا ہے اور تخلیقی عمل کے لیے فکر و آگہی، شعور و ادراک ہونا چاہیے۔ اگر اسے 'فنون لطیفہ' سے تعبیر کر دیا جائے تو غلط بات نہیں کہ 'فکر رضا' ادب بھی ہے اور فن بھی۔ اس میں وسعتیں بھی ہیں اور گہرائی بھی، معنویت بھی ہے اور دوسری خصوصیات بھی۔ فکر رضا جب تخلیقی عمل سے تعلق رکھتی ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ فکر رضا کی تشکیل میں سماجی، اقتصادی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی اور علمی فنی حالات نے زبردست رول ادا کیا ہے۔ فکر رضا کے مطالعہ میں ان عوامل کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے تا کہ اس کی تشریح بہتر انداز میں ہو سکے۔ جو افراد پس منظر کا پاس و لحاظ کیے بغیر اس کے مطالعہ کی کوشش کرتے ہیں وہ نہ صرف خطاؤں کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ فکر رضا کی انفرادیت اور اس کی امتیازی خصوصیت کو بھی پامال کرتے ہیں۔ سائنٹفک انداز فکر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ فکر رضا اور اس کے تمام عوامل کا مطالعہ کیا جائے۔ (۱)

کلکتہ کی دنیا میں فکر رضا کی تبلیغ و تشہیر میں جن عناصر خمسہ نے اہم ورل ادا کیا انہیں قدر تفصیل

کے ساتھ نذر قارئین کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں وہ عناصر حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلامی شخصیات (۲) اسلامی تحریکات (۳) اسلامی کتب (۴) اسلامی دانش گاہیں اور (۵) اسلامی صحافت۔

اسلامی شخصیات: فکر رضا کے فروغ میں جہد مسلسل کرنے والی شخصیات کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں خصوصیات کے ساتھ امام المناظرین حضرت علامہ خیر الدین کلکتوی، قاطع نجدیت و بدعت حضرت علامہ مفتی محمد علی خاں مدراسی کلکتوی، حضرت ملک العلما مفتی ظفر الدین رضوی بہاری، حضرت سلطان العلما مفتی غیاث الدین سہسرامی، حضرت مجاہد ملت علامہ حبیب الرحمٰن قادری اڑیسوی، حضرت رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہم الرضوان کے اسماء آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

(الف) امام المناظرین علامہ خیر الدین کلکتوی: آپ کی ولادت باسعادت ۱۸۳۱ء میں دہلی میں ہوئی اور وصال مبارک ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۸ء میں ہوا۔ آپ نے پوری زندگی احقاق حق اور ابطال باطل میں بسر کیا اور ردوہابیت میں دس جلدوں میں "سوط الرحمن علی عنق الشیطان" تحریر فرما کر وہابیت کا اصلی چہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آپ امام احمد رضا کے اکابر میں تھے۔ ابوالکلام نے لکھا ہے:

"والد مرحوم سے ملنے مولانا احمد رضا کلکتہ تشریف لائے، آپ نے فرمایا پورے ہندوستان میں صرف ڈھائی سنی ہیں، ایک میں دوسرے مولانا عبد القادر بدایونی اور آدھے مولوی احمد رضا۔" (۲)

امام احمد رضا نے پوری زندگی کی گستاخان رسول کی بیخ کنی میں نچھاور کردی، کسی باطل فرقہ کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے گویا ان کی زندگی کا احقاق حق اور ابطال باطل طرۂ امتیاز تھا۔ حضرت علامہ کلکتوی کے افکار میں حضرت محدث بریلوی کی فکر کی تابانی کس قدر چمکتی دمکتی دکھائی دیتی ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں: اسلام کے اندرونی فرقوں میں انہیں جس قدر کاوش تھی وہ صرف وہابیوں سے تھی اور اس کا سبب وہ صحبت ہے جس میں غدر سے پہلے ان کا ابتدائی وقت صرف ہوا تھا۔ اتفاق سے ان کے اساتذہ بھی وہی تھے، وہ اپنی تمام خاندانی باتوں میں سے اپنے جد محترم (مولانا منور الدین

دہلوی) سے فیضیاب تھے۔ مکہ گئے اور وہاں بھی اس وقت سب سے بڑا چرچا یہی تھا۔ بالآخر ان کی تقریر وتحریر کا سب سے بڑا موضوع (ردوہابیت) بن گیا۔ (۳)

(ب) قاطع بدعت علامہ محمد لعل خاں مدراسی کلکتوی: آپ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء ویلور (مدراس) میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء کو زیارت حرمین سے مشرف ہوئے۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں بریلی شریف حاضر ہوئے۔ سیدنا مجدد اعظم علیہ الرحمہ سے شرف بیعت حاصل کی اور اجازت وخلافت سے سرفراز کیے گئے۔ ۲۱/ جولائی ۱۹۲۱ء/۱۵/ ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور کلکتہ میں آخری آرام گاہ بنا۔

بارگاہ امام احمد رضا میں آپ کا مقام کیا تھا حضرت محدث بریلوی اپنے شاگرد سیدنا حضرت ملک العلما کو لکھتے ہیں:

''کلکتہ میں بھی ایک عالم سنی کی بہت ضرورت ہے۔ حاجی صاحب (علامہ مدراسی) کو اللہ تعالیٰ برکات دے، تنہا اپنی ذات سے وہ کیا کیا کریں، سنیوں کی عام حالت یہی ہورہی ہے جن کے پاس مال ہے انہیں دین کا کم خیال ہے اور جنہیں دین سے غرض ہے افلاس کا مرض ہے ورنہ کلکتہ میں دین کے لیے دو ہزار روپے ماہوار بھی کوئی چیز نہیں۔''

مزید آگے لکھتے ہیں: ''افسوس کہ ادھر نہ مدرس، نہ واعظ، نہ ہمت والے مالدار، ایک ظفر الدین کدھر کدھر جائیں اور ایک لعل خاں کیا کیا بنائیں۔'' (۴) اور امام احمد رضا الاستمداد میں فرماتے ہیں جو ہر منشی لعل پہ ہیرا کھا مرنے کو منگاتے یہ ہیں۔ (رضا) (۵)۔

علامہ مدراسی نے فکر رضا کو پروان چڑھانے کے لیے اپنے خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ اسلامی کتب کی اشاعت، مدرسہ کا قیام، علما اہل سنت کو ردعقائد باطلہ کے لیے مدعو کرنا آپ کی زندگی کا نصب العین تھا۔ حضرت محدث بریلوی نے آپ ہی کی تحریک پر ردندوہ کے جلسہ میں شرکت کے لیے کلکتہ تشریف لائے اور شہر کلکتہ کو یہ اعجاز حاصل ہوا کہ چودھویں صدی کا مجدد اعظم اپنے قدم ناز سے اس شہر کو سرفراز فرمایا۔ فکر رضا کی تشہیر میں آپ کہاں تک کامیاب تھے خود حضرت محدث بریلوی کی زبان فیض ترجمان سے سماعت فرمائیں، ''الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے مدارس ندوہ

مخذولہ پر آپ کو فتح بخشی، اللہ تعالیٰ نے علما حق کی طرف راجع کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دو جہاں میں بے شمار نعمتیں اور اجر کثیر عطا فرمائے اور آپ جیسے عالی ہمت، خادم سنت، ہادم بدعت، اہل سنت میں بکثرت پیدا فرمائے۔ (آمین)۔ (کلیات مکاتیب رضا دوم، ص:۲۲۹)

مزید دعاؤں سے نوازتے ہیں:

''مولانا حامی سنت، ماحی بدعت حاجی محمد لعل خاں صاحب جو کچھ خدمات دین کر رہے ہیں مولیٰ عزوجل برحمہ قبول فرمائے اور دونوں جہاں میں اس پر اجر جزیل دے اور ہمیشہ اعدائے دین پر منصور رکھے۔(۶)

(ج) ملک العلما مفتی ظفر الدین رضوی بہاری: آپ کی پیدائش ۱۰/محرم ۱۳۰۳ھ/۱۹/ اکتوبر ۱۸۸۵ء میجرہ ضلع نالندہ (بہار) ہوئی۔ آپ نے حضرت محدث سورتی اور امام احمد رضا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ حضرت محدث بریلوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ نے مرشد برحق پر ایک ضخیم سوانح ''حیات اعلیٰ حضرت'' چار جلدوں میں تحریر فرمائی۔ آپ امام احمد رضا کی فکر کے مبلغ اور کتب رضویہ کے پاسبان تھے۔ آپ کا وصال ۱۹/ جمادی الآخر ۱۳۸۲ھ/۱۸/ نومبر ۱۹۶۲ء شب دوشنبہ ہوا، ۲۰ جمادی الآخر شاہ گنج قبرستان پٹنہ میں سپرد خاک ہوئے۔

کلکتہ میں فکر رضا کو عام کرنے اور اس کی محافظت میں آپ نے بھی اپنے وقت کی قربانی پیش کی ہے اور اپنے رفیق خلیفہ اعلیٰ حضرت علامہ محمد لعل خاں مدراسی کلکتوی کی دعوت پر تشریف لاکر فکر رضا کو مجروح ہونے سے بچایا۔ حضرت ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی لکھتے ہیں:

''رمضان ۱۳۳۴ھ میں ملک العلما پٹنہ سے بریلی تشریف لائے اور حسب عادت امام احمد رضا کی تصانیف میں تبیض و ترتیب میں لگ گئے۔ اس دوران کلکتہ سے ناصر ملت الحاج لعل محمد خاں علیہ الرحمہ کا اعلیٰ حضرت کے پاس خط آیا۔ ملک العلما کو فوراً روانہ کیا جائے۔ یہاں دیوبند کے تربیت یافتہ مولوی ولی اللہ مناظرے کا چیلنج دیتا پھرتا ہے۔ امام احمد رضا نے انہیں ۲۰/ روپے دے کر روانہ فرمایا۔ کچھار رضا کے اس شیر کے پہنچتے ہی مولوی موصوف کا پتہ پانی اور اس کے حوالی موالی کے جذبات ہرن ہو گئے۔''(۷)

خود ملک العلما تحریر فرماتے ہیں: میں قدم بوسی کرتے ہوئے وہ (۲۰ روپے) لے لیے اور کلکتہ روانہ ہوا۔ میرے پہنچنے کی خبر ملتے ہی سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اب کس میں مناظرہ کا دم ہے، اعلیٰ حضرت کی دعا کا اثر ہے۔ (۸)

مناظرہ کی مفصل روداد بنام "گنجینۂ مناظر کے نام ۱۳۳۴ھ حاجی عبدالرحمٰن ماڑواری کل ضلع شمالی ۲۴ پرگنہ نے شائع کیا۔

(د) سلطان العلما علامہ غیاث الدین سہسرامی: آپ کی ولادت باسعادت ۱۳۰۴ھ اوائل شوال میں ہوئی۔ آپ نے علامہ ہدایت اللہ خاں علامہ فاخر الہ آبادی، امام احمد رضا محدث بریلوی، حجۃ الاسلام مفتی حامد رضا خاں بریلوی سے تعلیم حاصل کی اور دارالعلوم منظر اسلام سے سند فارغ تحصیل ہوئے۔ آپ کو سیدنا امام احمد رضا اور حضرت سید شاہ شریف قدس سرہ سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ ۲۵ مئی ۱۹۶۵ء میں وصال ہوا۔ (۹)

آپ کی ذات مقدسہ سے کلکتہ میں فکر رضا کو تقویت ملی۔ آپ نے اپنی صلاحیت ولیاقت سے سحر انگیز اثر اہل کلکتہ پر چھوڑا اور فکر رضا کو بام عروج تک پہنچایا۔ مولانا سید احمد رضا لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا ظفر الدین بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو سہسرام کی مشہور درسگاہ میں ان دنوں قیام پذیر تھے۔ سہسرام سے حضرت مولانا غیاث الدین صاحب کو خط بھیجا کہ اعلیٰ حضرت نے آپ کو تاکید فرمائی ہے کہ کلکتہ حاجی منشی لعل خاں صاحب کے پاس جائیں، تم کو لازم ہے کہ الہ آباد کو چھوڑ و اور سہسرام پہنچو۔ جناب لعل خاں صاحب نے آپ کا ٹکٹ سکنڈ کلاس کا بھیجا ہے۔ خط ملتے ہی آپ سہسرام کے لیے روانہ ہو گئے۔ پھر کلکتہ تشریف لائے اسٹیشن پر حاجی صاحب خود موجود تھے۔ ان کے ساتھ کولوٹولہ تشریف لے گئے۔ صبح کے وقت حاجی صاحب نے فرمایا کہ یہاں انجمن اصلاح عقائد اور مدرسہ عثمانیہ ہے۔ آپ کو مدرسہ کا صدر اول نامزد کیا جاتا ہے اور انجمن کا نائب ناظم۔ انجمن کا اولین مقصد اشاعت ملت حنفیہ اور مذہب اہل سنت ہے۔ مدرسے میں ترجمہ وتفسیر قرآن پاک اور کتب تصوف مکتوبات صدی کا تعلیم دینا ہے اور لوگوں کے خطوط آئیں ان کا جواب اسی زبان میں دینا ہے۔ مثلاً عربی، فارسی اردو وغیرہ اور جب امام مسجد ناخدا کسی وجہ سے امامت نہ کرسکیں تو مصلحت اہل

سنت کی وجہ سے آپ کو امامت کرنی ہے اور کتب اہل سنت طبع کروانا ہے پھر کہا یہ سب حکم سیدنا اعلیٰ حضرت کا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد مدرسہ اسلامیہ واقع مسجد سیالدہ (کلکتہ) میں رہنے لگے اور اہل سنت (فکر رضا) کے لیے سعی پیہم کرنے لگے۔ مغربی بنگال میں بیر بھوم، بردوان، مالدہ، پنڈوہ شریف اور مرشد آباد میں سلسلے (چشتیہ رضویہ) کا کافی اجراء ہوا۔ (۱۰)

(ھ) **حضور مجاہد ملت علامہ حبیب الرحمٰن قادری بھدرکی:** آپ کی ولادت ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء میں دھام نگر ضلع بھدرک اڑیسہ میں ہوئی۔ آپ کے اساتذہ میں حضور صدر الا فاضل اور حضور صدر الشریعہ کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ سلسلہ نقشبندیہ میں عارف باللہ علامہ عبد الکافی نقشبندی علیہ الرحمہ سے مرید تھے۔ حضور حجۃ الاسلام علامہ حامد رضا خاں بریلوی، سرکار اشرفی میاں کچھوچھوی، قطب مدینہ علامہ ضیاء الدین مدنی سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ آپ تقریباً چھ مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت اور روضۂ انور کی زیارت سے مشرف ہوئے اور تمام عمر عزیز کو فکر رضا کی اشاعت میں وقف کر دی تھی۔ آپ کا وصال ۶/ جمادی الاول ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء ہوا۔ (۱۱)

سیدنا حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کو امام احمد رضا محدث بریلوی اور مرشد اجازت حضور حجۃ الاسلام سے اس قدر محبت تھی کہ بریلی اسٹیشن سے درگاہ تک پیدل برہنہ پیر چلا کرتے تھے اور فکر رضا کے ایسے مبلغ تھے کہ سعودی عرب میں نجدی حکومت کے سامنے مذہب اہل سنت کی ایسی ترجمانی فرمائی کہ نجدی مولویوں کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور وہ لوگ اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے جس کے پاداش میں آپ پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے گئے۔ مگر فکر رضا کا یہ عظیم داعی جبل استقامت بن کر نجدی مظالم مسکراتے ہوئے برداشت کرتا چلا گیا۔ اس عظیم مجاہد نے فکر رضا کی خوشبو سے اہل کلکتہ کے مشام جان کو معطر کرنے کے لیے انتھک کوششیں کیں تھیں۔

ڈاکٹر زاہد نظیر لکھتے ہیں:

''حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ جیسی نابغۂ روزگار شخصیت نے پیغام اعلیٰ حضرت کی ترسیل واشاعت کے لیے ہندوستان کے گوشے گوشے کا تبلیغی دورہ فرمایا۔ عشق رسول جو جام سیدنا حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ نے آپ کو پلایا تھا وہ رگ وپے میں سما گیا تھا۔ اسی عشق نے نجدی حکومت کے

سامنے ثابت قدم رکھا۔آپ کی ذات ستودہ صفات نے کلکتہ جیسی سنگلاخ زمین کو گل گلزار بنادیا۔
عشق وعرفان کی جوت جگائی اور مشن اعلیٰ حضرت کے برکات سے اہل کلکتہ کے قلوب واذہان کوتابندہ فرمایا۔مہینوں کلکتہ میں قیام،تبلیغ سیرت کا اجلاس،اکابر اہل سنت کی جلوہ گری،مسلک اعلیٰ حضرت کی ترویج یہ فیضان مجاہد ملت ہی تھا کہ کلکتہ بھی امام احمد رضا کی شیدائیوں کا اہم مرکز بن گیا اور خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ محمد لعل خان مدراسی کلکتوی کے توسط سے کلکتہ میں مشن اعلیٰ حضرت کی جو کرن چمکی تھی حضور مجاہد ملت نے کلکتہ کی گلیوں اور کوچواں تک پہنچادیا۔مقام مسرت ہے کہ جب مجاہد ملت نے تبلیغ سیرت کا پہلا اجلاس کلکتہ میں کیا تھا تو اس کی صدارت مفتی اعظم حیدرآباد علامہ مفتی عبد القدیر قادری بدایونی نے کی جہاں سے فکر رضا کے فروغ کے لیے منصوبے بنے، لائحہ عمل تیار کیا گیا اور مستقبل قریب میں زندہ دلوں کے ساتھ کام کرنے کے لیے اچھے اچھے تجاویز سے صفحات قرطاس کو مزین کیا گیا۔کلکتہ میں فکر رضا کے ابلاغ کے لیے مجاہد ملت نے جس طرح جہد مسلسل کیا ہے اور مسلک اعلیٰ حضرت کا اس داعی نے کلکتہ کے عوام اہل سنت کو بیدار رکھنے کے لیے جو عمل پیہم کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے جسے کوئی مورخ فراموش نہیں کرسکتا۔(ذاتی ڈائری)

(و) رئیس القلم علامہ ارشد القادری بلیاوی: آپ کی ولادت ۵؍مارچ ۱۹۲۵ء میں سیدہ پور ضلع بلیا میں ہوئی۔حضور حافظ ملت محدث مرادآبادی، امام المعقولات علامہ سلیمان بھاگلپوری، علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری سے شرف تلمذ حاصل رہا۔حضور صدرالشریعہ محدث گھوسی کے مرید اور حضرت مفتی اعظم ہند، حضرت قطب مدینہ خلیفہ اعلیٰ حضرت اور سرکار پٹنہ سید شاہ فدا حسین سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔آپ نے فکر رضا کو عالمی تحریک کی شکل میں پیش کیا ملک اور بیرون مساجد، مدارس اور تنظیمیں قائم کرکے فکر رضا کی ترویج واشاعت کا اہم مرکز بنایا۔مسلک اعلیٰ حضرت کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے دشمنان اسلام سے مناظرہ ومباحثہ کیا۔فکر رضا کا یہ عظم مبلغ ۲۹؍اپریل ۲۰۰۲ء کوشام ۴بج کر ۳۵ منٹ پر رب حقیقی سے جاملا۔(۱۲)

حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ فکر رضا کے ایک عالمگیر نقیب تھے۔آپ کے توسل سے صحرائے عرب، سات سمندر پار کلیساؤں کی دنیا یورپ اور گھنے جنگلوں سے بھرا ہوا براعظم افریقہ

میں فکر رضا کی ایسی خوشبو پھیلی کہ آج مدارس اسلامیہ کے ذریعہ مشن اعلیٰ حضرت کا داعی پیدا ہو رہا ہے۔ اسلامی تحریکات کے ذریعہ پیغام اعلیٰ حضرت عام کیا جا رہا ہے اور سنی صحافت کے ذریعہ فکر اعلیٰ حضرت کو فروغ مل رہا ہے۔ ڈاکٹر زاہد نظیر ہیں:

حضرت رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ مدبر اہل سنت، مفکر اسلام، مناظر مسلک اعلیٰ حضرت اور داعی فکر رضا تھے۔ اپنی تحریک فکر رضا کو پروان چڑھانے کے لیے زکریا اسٹریٹ کلکتہ سے پندرہ روزہ ''جام کوثر'' ۱۹۶۶ء میں اور ۱۹۶۷ء میں ''ماہنامہ جام نور'' جاری کر کے کلکتہ میں ایک اہم سنی پلیٹ فارم تیار کیا۔

کلکتہ ہوڑہ میں سنی نوجوانوں کو صالح قیادت کی فکر دینے کے لیے دار العلوم ضیاء الاسلام قائم فرمایا اور علمائے اہل سنت میں فکری جولانگی پیدا کرنے کے لیے ''مجلس علما اسلام مغربی بنگال'' کا ایک خوبصورت بینر عطا کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کلکتہ میں داعیان اسلام نے علامہ ارشد القادری کی فکر وتدبیر سے فائدہ نہ اٹھا کر شب و روز کے غیر مفید کاموں میں الجھے رہے جن کا نتیجہ یہ ہے کہ معاندین اسلام اپنے باطل نظریات کی تبلیغ میں با مقصد نظر آ رہے ہیں اور نئی نئی تحریکوں کا وجود ہو رہا ہے۔ کاش! آج بھی رہبران اسلام امامت وخطابت کی دنیا سے ذرا ہٹ کر فکر رضا کی بابت سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کریں تو انشاء اللہ کلکتہ میں ضرور انقلاب پیدا ہوگا اور اس جرس کی آوازیں چین و بنگلہ دیش کے سرحدوں تک گونجے گیں۔ (ذاتی ڈائری)

(٤) اسلامی تحریکات: کلکتہ میں جن اسلامی تحریکوں کے ذریعہ فکر رضا کو عروج حاصل ہوا چند کا مختصر جائزہ سماعت فرمائیں:

☆ **انجمن اصلاح عقائد:** اس تنظیم کے بانی خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ الحاج محمد لعل خاں مدراسی کلکتوی تھے اور نائب ناظم خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ غیاث الدین رضوی سہسرامی تھے۔ انجمن کا اولین اشاعت ملت حنفیہ، مشن اعلیٰ حضرت کا فروغ اور عقائد اہل سنت کی ترویج واشاعت، ۱۳۳۴ھ میں تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔

☆ **آل انڈیا تبلیغ سیرت:** اس تنظیم کے بانی حضور مجاہد ملت علامہ حبیب الرحمٰن قادری

اڑیسوی (ولادت:۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء......وصال:۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء) تھے جس کے بینر تلے پیغام مصطفیٰ کو ہندوستان کے قریہ قریہ، شہر شہر پہنچایا گیا۔ اس کی ایک شاخ کلکتہ میں بھی قائم کی گئی۔ فکر رضا کی تشہیر میں نمایاں کردار رہا۔ ریلیف فنڈ کے ذریعہ فسادات کے مواقع پر مصیبت زدوں کی مدد کی گئی ہر سال پانچ روزہ جلسہ شہر کے مختلف محلوں میں سیرت مصطفیٰ کے حوالے سے ہوتا تھا جس کے بینر تلے حب رسول کو مسلمانوں کی سانسوں میں پیرو دیا گیا۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت ۱۳۶۸ھ میں وجود میں آئی۔

☆ تحریک خاکساران حق: اس کے بانی مبانی سیدنا حضور مجاہد ملت تھے۔ اس تحریک کو مسلم نوجوانوں میں فسادات کے مواقع پر بالخصوص دفاعی صورت پیدا کرنے کے لیے تربیتی کیمپ کی حیثیت حاصل تھی۔ تحریک خاکساران حق کے اغراض ومقاصد میں ایک شق شامل تھی کہ تحریک سے وابستہ نوجوانوں میں فکر رضا پیدا کیا جائے اور پیارے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا عاشق بنایا جائے۔ کلکتہ اور قرب وجوار کے اضلاع میں شاخیں قائم کی گئیں۔ کئی دفعہ خود نوجوانوں کو تربیت دینے کے لیے مجاہد ملت کلکتہ تشریف لائے، کئی دنوں تک قیام رہا۔ بعد نماز فجر ایک بڑے گراؤنڈ میں جمع کیا جاتا تھا۔ درود شریف کا ورد ہوتا۔ دفاعی طریقہ کار سے آگاہ کرتے اور صحابہ والا جذبہ خدمت دین اجاگر کرنے کے لیے کلمات حسنہ سے نوازتے۔ منظر بڑا پر کیف ہوتا۔ ناز ونعم کا پروردہ، دولت جن کے قدموں کی کنیز وہ ایک معمولی اور سادہ کپڑا میں دین کے محافظ دستہ کو تربیت دیتے وقت ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ بس یہی لگن تھی مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا یہ نوجوان طبقہ احکام قرآن کا علمبردار بن جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چلتی پھرتی تصویر کی عملی تفسیر بن جائے اور فکر رضا کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے والا داعی بن جائے۔ تحریک خاکساران حق ۱۳۸۹ھ میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔

☆ مجلس علمائے اسلام مغربی بنگال: مجلس علمائے اسلام مغربی بنگال کے فاؤنڈر حضرت رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ (ولادت:۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء......وصال:۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء) نے مغربی بنگال بالخصوص کلکتہ کے علما کو متحدہ ہوکر کام کرنے کے لیے ایک پاکیزہ بینر بنام ''مجلس علمائے اسلام'' دیا۔ ۲۰۰۰ء میں مجلس معرض وجود میں آئی۔ بڑے بڑے کام اس کے بینر تلے علمائے

کرام نے انجام دیئے بالخصوص ۲۰۱۰ء میں مولوی طاہر گیاوی کی فرقہ وارانہ تقریر سے پورے اڑیسہ میں ہنگامی صورت اختیار کرگئی تھی، کلکتہ کے دیوبندیوں نے اس فتنہ کی آگ کو یہاں پھیلانا شروع کیا فوری طور پر مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ سے مجلس کا وفد ملاقات کر کے صورت حال سے آگاہ کیا اور فوری طور پر ایکشن لینے کے لیے ایک میمورنڈم دیا گیا۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں دیوبندیوں کی شرانگیزیاں پر پابندی عائد ہوگئی۔ علمائے کلکتہ کی نگرانی میں مجلس کے بینر تلے فکر رضا کو فروغ مل رہا ہے اور آج کلکتہ میں مسلک اعلیٰ حضرت کی نمائندہ تنظیم کی حیثیت سے متعارف ہے۔

☆ **بزم رضائے مصطفیٰ مغربی بنگال:** بزم رضائے مصطفیٰ مغربی بنگال کے بانی علامہ محمد قاسم علوی مدظلہ العالی ہے۔ اس تنظیم کا قیام مارچ ۱۹۸۹ء میں ہوا۔ اس بزم کے تحت فکر رضا کا سب سے بڑا کام ابتدا آفرینش سے سرکار مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے جشن ولادت کے پُر بہار موقع پر ''جلوس محسن انسانیت'' کا اہتمام، اس تنظیم کی آج یہ پہچان ''جلوس محمدی'' ہے۔ عوام سے لے کر حکومت کے ایوان تک اس کی دھمک ہے۔ مسلکی، ملی، سماجی میدان میں بڑے بڑے کارنامے ہیں جو تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔

☆ **امام احمد رضا سوسائٹی کلکتہ:** ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء میں امام احمد رضا سوسائٹی کلکتہ کا قیام عمل میں آیا۔ بانی (راقم) محمد شاہد القادری ہے۔ جس کا مقصد اول فکر رضا کے حوالے سے تگ و دو کرنا اور امام احمد رضا محدث بریلوی کے افکار و نظریات پر مستعدی کے ساتھ کام کرنا۔ حضرت محدث بریلوی ۱۰ ارنکاتی پروگرام میں ایک پر پابندی کے ساتھ عمل جاری ہے کہ اہل سنت میں متحرک علما کی پذیرائی کی جائے اس پر پیش رفت ہوا۔ ۲۰۰۹ء میں سوسائٹی کا پہلا اجلاس مجاہد ملت کنونشن میں الحاج سعید نوری ممبئی کو کتب علمائے اہل سنت کی اشاعتی خدمات پر ''امام احمد رضا ایوارڈ'' اور ریاستی سطح پر مولانا ابو الکلام احسن القادری ہوڑہ کو تدریسی خدمات پر ''مفتی اعظم ہند ایوارڈ'' اور پروفیسر شاہد اختر حبیبی کو صحافتی خدمات پر ''تاج الشریعہ ادبی ایوارڈ'' دیا گیا۔ ۲۰۱۰ء میں سوسائٹی کا دوسرا اجلاس تاجدار دیوئی کنونشن کے موقع پر حضرت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ امجدی مدظلہ العالی کو خدمت علم حدیث پر ''امام احمد رضا ایوارڈ'' ریاستی سطح پر فکر رضا کو بنگلہ زبان کے ذریعہ تبلیغ پر مرشد آباد کے مفتی غلام صمدانی

رضوی کو ''مفتی اعظم ہند ایوارڈ'' دیا گیا اور عالم اسلام کی عبقری شخصیت حضور تاج الشریعہ مدظلہ العالی کی حیات وخدمات ''تجلیات تاج الشریعہ'' نامی کتاب ۲۰۰۷ پر سوسائٹی کے زیر اہتمام رضا اکیڈمی ممبئی نے زیور طباعت سے آراستہ کر کے شائع کیا۔ مزید دوسرے نکات پر عمل پیہم کا سلسلہ برقرار ہے۔

فکر رضا کے فروغ میں بہت سی تنظیمیں اپنے طور پر کلکتہ میں مصروف بعمل ہیں۔

☆ سنی علما کونسل مغربی بنگال: ۲۰۰۵ء/۱۴۲۶ھ میں سنی علماء کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

☆ دعوت قرآن اسلامک ریسرچ اینڈ دعوہ سینٹر: ۲۰۰۹ء/۱۴۳۰ھ میں سینٹر قائم ہوا۔

☆ قادری فاؤنڈیشن کلکتہ: ۳۰/اپریل ۲۰۰۸ء/۱۴۲۹ھ میں قائم ہوا۔

☆ رضا اکیڈمی کلکتہ: ۲۰۰۹ء/۱۴۳۰ھ میں اکیڈمی قائم ہوئی جس کے بانی مفتی مختار عالم رضوی ہیں۔

(۳) اسلامی دانش گاہیں:

☆ (۱) مدرسہ عثمانیہ کلکتہ: یہ مدرسہ ۱۳۳۴ھ میں سیدنا اعلیٰ حضرت محدث بریلوی کی دعاؤں کے سایہ میں قائم ہوا۔ مغربی بنگال جماعت اہل سنت کا پہلا مدرسہ تھا جس کے بانی خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ محمد لعل خاں مدراسی کلکتوی تھے۔ زکریا اسٹریٹ کلکتہ میں یہ مدرسہ معیار تعلیم کی بنیاد پر عروج تھا۔ علامہ کلکتوی نے تعلیمی معیار کو مزید مستحکم کرنے کے لیے سیدنا اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے توسل سے خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ غیاث الدین رضوی علیہ الرحمہ کا تقرر صدر المدرسین کی حیثیت سے کیا اس وقت مروجہ کتب کے علاوہ تصوف پر بھی کتابیں داخل نصاب تھیں جن میں مکتوبات صدی کا ذکر اول درجہ رکھتا ہے اس کے علاوہ مدرسہ اسلامیہ، سیالدہ کلکتہ کا بھی نام آتا ہے جہاں علامہ غیاث الدین نے درس وتدریس کا کام انجام دیا ہے۔

☆ (۲) دار العلوم ضیاء الاسلام (ہوڑہ): مغربی بنگال کے مدارس اسلامیہ میں اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کی سن تاسیس ۱۹۶۲ء ہے بانیوں میں حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ اور حضرت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ امجدی مدظلہ العالی کا نام آتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں اس کی عمارت کی سنگ بنیاد کے موقع پر اہل سنت کے اکابر علمائے کرام میں حضور مفتی اعظم ہند (م ۱۴۰۲ھ)، حضور سید العلما (م ۱۳۹۴ھ)، حضور حافظ ملت (م ۱۳۹۶ھ) حضور مجاہد ملت

(م۱۴۰۱ھ) خصوصیات کے ساتھ موجود تھے۔ ۲۰۰۵ء میں دوسری عمارت کی سنگ بنیاد کے موقع پر حضور تاج الشریعہ مدظلہ العالی شریک بزم تھے اور آپ نے اپنی جیب خاص سے ۱۱؍ہزار روپے نقد تعمیر کے لیے مدرسہ کو عنایت فرمایا۔ یہاں فضیلت تک تعلیم ہوتی ہے اب تک سیکڑوں علما کے سروں پر تاج فضیلت سجایا گیا ہے۔ ہوڑہ اور کلکتہ میں فکر رضا کا یہ نمائندہ مدرسہ ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

☆ (۳) دارالعلوم سلیمیہ فیض الاسلام کلکتہ: اس دارالعلوم کی تاسیس ۱۹۶۲ء میں عمل میں آئی۔ حضرت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ امجدی مدظلہ العای نے عمارت کی سنگ بنیاد رکھی۔ درجہ مولوی تک تعلیمی نظم و نسق ہے۔ اس میں باضابطہ شعبہ افتا بھی ہے۔ بحیثیت مفتی حضرت علامہ مفتی مختار عالم رضوی مدظلہ العالی ہیں اور مدرسہ کی مکمل نگرانی آپ کے ذمہ ہے۔ فکر رضا کے حوالے سے یہ مدرسہ پچاس سالہ قدیم علمی قلعہ ہے۔ حضور مفتی اعظم ہند کے نام سے فیضان نوری لائبریری بھی قائم ہے۔

☆ (۴) دارالعلو اسلامیہ کلکتہ: ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم اسلامیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔ جن کے بانی صوفی طاہر صاحب نقشبندی تھے۔ یہاں عالمیت تک تعلیم باضابطہ ہوتی ہے۔ نظم و نسق بہت عمدہ ہے۔ لائق فائق اساتذۂ کرام مصروف تدریس ہیں۔ کلکتہ میں فکر رضا کی ترویج و اشاعت میں اسے اہم مقام حاصل ہے۔

☆ (۵) دارالعلوم رضائے مصطفیٰ: معیار تعلیم کے اعتبار سے کلکتہ میں اپنی انفرادیت برقرار رکھا ہے۔ مئی ۱۹۹۹ء میں قائم ہوا۔ عمارت کی سنگ بنیاد میں شہزادۂ حضور صدرالشریعہ مفتی اعظم مغربی بنگال مفتی ثناء المصطفیٰ امجدی (م۱۹۹۹ء) رونق محفل تھے۔ فضیلت تک تعلیم ہوتی ہے۔ اس کے بانی حضرت علامہ محمد قاسم علوی مدظلہ العالی ہیں۔

☆ (۶) دارالعلوم قادریہ ضیاء مصطفیٰ کلکتہ: اس علمی دانش گاہ کا قیام ۲۰۰۰ء میں ہوا۔ جس کے بانی حضرت مفتی رحمت علی تیغی صاحب قبلہ ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں جامعہ عبداللہ بن مسعود کا قیام ہوا جو اس دارالعلوم کا اہم شعبہ ہے۔ درجہ عالمیت تک تعلیم ہوتی ہے۔ تعلیمی معیار لائق تحسین ہے۔

☆ (۷) مدرسہ حسینیہ غوثیہ، کلکتہ: ۱۹۹۵ء میں مدرسہ حسینیہ غوثیہ کا قیام عمل میں آیا۔ ۲۰۰۶ء میں جس کی عمارت کی سنگ بنیاد حضرت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ امجدی مدظلہ العالی، حضرت رفیق ملت علامہ سید شاہ نجیب حیدر برکاتی مدظلہ العالی، نبیرۂ حضور سید العلما علامہ سید سبطین حیدر برکاتی مدظلہ العالی نے رکھا۔ شعبۂ کمپیوٹر کا افتتاح حضرت محدث کبیر نے کیا۔ فکر رضا کے حوالے سے اسے کے خدمات منفرد المثال ہے بانی راقم ہے۔

ان مدارس اسلامیہ کے علاوہ فکر رضا کو پروان چڑھانے میں حسب ذیل مدارس کلکتہ میں کوشاں ہیں:

☆ دار العلوم قادریہ رضویہ (برجونالہ)، ☆ مدرسہ عربیہ غوث اعظم (راجہ بگان)، ☆ مدرسہ اشتیاق العلوم (خضر پور)، ☆ مدرسہ قادریہ حبیبیہ (پیلخانہ، ہوڑہ)، ☆ مدینۃ العلوم انسٹی ٹیوٹ (توپسیا)، ☆ مدرسہ رضاء العلوم (شیب پور)، ☆ مدرسہ انوار مصطفیٰ (ملابگان)۔

(٤) اسلامی کتب: فکر رضا کے فروغ میں کلکتہ میں اشاعتی کام بھی گاہ بگاہ ہوتا رہا اور پیغام اعلیٰ حضرت کو عام کرنے میں بنیادی حیثیت کارفرما رہی۔ چند اہم کتابوں کا اجمالی تعارف نذر قارئین ہے:

☆ گنجینۂ مناظرہ، کلکتہ: رمضان ۱۳۳۴ھ میں خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ کلکتوی کا اعلیٰ حضرت کے پاس خط آیا۔ ملک العلما کو فوراً کلکتہ روانہ کیا جائے۔ یہاں دیوبند کے تربیت یافتہ مولوی ولی اللہ مناظرے کا چیلنج دیتا ہے۔ سیدنا اعلیٰ حضرت نے ۲۰/روپے عنایت فرما کر کلکتہ روانہ کیا۔ حضرت ملک العلما کے آنے کی خبر مولوی صاحب کو ہوئی تو ملک العلما فرماتے ہیں سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اب کس میں مناظرے کا دم ہے، اعلیٰ حضرت کی دعا کا اثر ہے۔ مفصل کیفیت اس زمانہ میں حاجی عبد الرحمٰن مارواڑی کل شمالی ۲۴/ پرگنہ کے نام سے رسالہ ''گنجینہ منظرہ'' ۱۳۳۴ھ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

☆ تدبیر فلاح ونجات: خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ کلکتوی علیہ الرحمہ نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے بارگاہ سیدنا اعلیٰ حضرت میں عریضہ پیش کیا۔ آپ نے اپنے چہیتے کی دلجوئی اور

مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے لیے رسالہ ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' تحریر کیا جو ۱۹۱۲ء میں پہلی دفعہ کلکتہ سے شائع ہوا۔

☆ **مؤذن الاوقات:** حضرت ملک العلما نے یہ رسالہ ۱۳۳۵ھ میں لکھا ہے۔ ہندوستان کے لیے ۱۲/ درجہ عرض سے ۲۴ درجہ عرض تک ۲۳ رسالوں کو مرتب کرنے کی ضرورت تھی۔ دس شہروں کے اوقات صلوٰۃ وصوم مختلف احباب کی ضرورت وفرمائش پر اس رسالے کو تیار کیے۔ جس میں کلکتہ کا عرض ۲۲ درجہ حسب فرمائش حضرت علامہ محمد لعل خاں کلکتوی تحریر فرمایا اور علامہ کلکتوی نے اہل کلکتہ کی افادیت کے اسے شائع کیا۔

☆ **جواہرالبیان:** یہ الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفه النعمان کا اردو ترجمہ ہے۔ حضرت علامہ محمد لعل خاں کلکتوی علیہ الرحمہ کی فرمائش پر حضرت ملک العلما نے یہ ترجمہ کیا اور علامہ کلکتوی نے اپنے مطبع اہل سنت وجماعت زکریا اسٹریٹ سے ۱۳۳۳ھ میں شائع کیا۔

☆ **قادیانی مذہب:** اس کتاب کے مؤلف علامہ پروفیسر الیاس برنی تھے۔ خلیفہ اعلیٰ حضرت علامہ عبدالعلیم میرٹھی علیہ الرحمہ سے دیرینہ تعلقات تھے۔ یہ کتاب دیوبندی حضرت ہم مسلک مصنف کی حیثیت سے تعارف کرا کے بڑی ڈھٹائی سے شائع کررہے تھے۔ فکر رضا کا مبلغ مولانا امتیاز احمد رضوی کلکتوی نے زمانۂ طالب علمی میں اس کی اشاعت کا پروگرام بنایا اور اس کی اشاعت ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء میں الہادی پبلی کیشن کولکاتا، خضرپور کلکتہ سے ہوئی۔ فکر رضا پر اپنی اہمیت کے اعتبار سے منفرد المثال کتاب ہے۔

☆ **تجلیات تاج الشریعہ:** امام احمد رضا سوسائٹی کلکتہ کے زیر اہتمام ۲۰۰۹ء میں عرس رضوی کے پُربہار موقع پر جامعۃ الرضا بریلی شریف، حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے قل شریف کے موقع پر حضور تاج الشریعہ مدظلہ العالی کی موجودگی میں حضرت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ امجدی مدظلہ العالی نے اجراء فرمایا۔ تجلیاتِ تاج الشریعہ کی طباعت رضا اکیڈمی ممبئی کے چیئرمین الحاج سعید نوری صاحب نے کی۔ فکر رضا کے عظیم داعی حضور تاج الشریعہ مدظلہ العالی کے آفاقی شخصیت پر خشت اول

ہے۔ جسے راقم نے ترتیب دی ہے۔

کلکتہ میں فکر رضا کی اشاعت پر حسب ذیل پبلیشرز مصروف ہیں:

(۱) احسن العلما دارالاشاعت ملحقہ امام احمد رضا سوسائٹی کلکتہ (مٹیابرج)، (۲) سیرت پبلیشر کلکتہ (تالتلہ)، (۳) رضا اکیڈمی کلکتہ (کمرہٹی)، (۴) اعجاز بکڈپو کلکتہ (زکریا اسٹریٹ)، (۵) نوری اکیڈمی ہوڑہ (شیب پور)، (۶) الھادی پبلیشر کلکتہ (خضر پور)۔

اسلامی صحافت: فکر رضا کی تشہیر اور پیغام اعلیٰ حضرت کو لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں بنانے کے لیے مختلف پلیٹ فارموں سے کام ہوا۔ ارباب صحافت نے بھی اس فکر کی جڑ کو مستحکم کرنے کے لیے قلم کی سیاہی کو خون جگر کی طرح انڈیل دیا۔ سنی صحافت نے کلکتہ میں بھی فکر رضا کی تجلیات سے صفحات قرطاس کو روشن کیا ہے۔ ایک سرسری جائزہ حاضر خدمت ہے۔

☆ **پندرہ روزہ جام کوثر:** کلکتہ کی دنیا میں صحافتی میدان پہلی پیش رفت تھی۔ اس میدان کو سر کرنے میں جماعت اہل سنت کا جہاں دیدہ عالم، رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی ذات ستودہ صفات شخصیت تھی۔ آپ نے اگست ۱۹۶۶ء میں زکریا اسٹریٹ کلکتہ سے ''پندرہ روزہ جام کوثر'' مکمل آب وتاب کے ساتھ جاری کیا۔ اس کا اداریہ اپنے دامن میں کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی ادبیت لیے ہوئے ہر شمارے میں شائع ہوتا تھا۔

☆ **ماہنامہ جام نور کلکتہ:** پندرہ روزہ جام کوثر ۶ ماہ کے بعد صحافتی دنیا سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا۔ فروری ۱۹۶۷ء میں حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے نئی فکر لے کر ''ماہنامہ جام نور'' جاری فرمایا۔ کئی سال تک لوگوں کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔

☆ **پندرہ روزہ نوائے حبیب کلکتہ:** حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی یاد میں ۱۹۸۴ء میں راجہ بگان کلکتہ۔ ۱۸/ سے پروفیسر شاہد اختر حبیب صاحب (صدر شعبۂ اردو محسن کالج، ہگلی) کی ادارت میں جاری ہوا۔ تقریباً ۸ سال تک مسلک اہل سنت کی ترجمانی اور فکر رضا کی اشاعت میں لگا رہا۔ جنوری ۱۹۸۶ء میں حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی آفاقی شخصیت پر ایک ضخیم نمبر ۵۰۰ صفحات پر شائع ہوا جسے آج مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔

☆ **نوری مجاہد ملت کلکتہ:** حضور مفتی اعظم ہند اور حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی یاد میں ۱۹۸۶ء میں بر جو نالہ کلکتہ۔۴۴ سے مولانا عقیل الرحمٰن نعمانی پوکھر ویروی صاحب کی ادارت اور الحاج محمد مقبول انصاری رضوی صاحب کی نگرانی میں جاری ہوا۔ تقریباً دو سال تک پورے گھن گرج کے ساتھ نکلا اور کمال کی بات یہ کہ اس رسالہ کا اپنا پریس بنام نور یس پریس تھا۔ لیکن افسوس کہ آج کچھ بھی نہیں ہے۔

☆ **سالنامہ صدائے اہل سنت کلکتہ:** سنی علما کونسل مغربی بنگال کی نگرانی میں پہلا شمارہ ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء میں شہزادۂ حضور صدر الشریعہ مفتی اعظم مغربی بنگال حضرت علامہ مفتی ثناء المصطفیٰ امجدی علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات پر تقریباً ۳۰۰ صفحات پر اشاعت پذیر ہوا۔ جس کے مرتبین مولانا محمد شاہد القادری اور مولانا محمد یوسف رضوی تھے۔

☆ **سہ ماہی تبلیغ سیرت:** حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی یاد میں ۲۰۰۵ء میں تالتلہ، کلکتہ۔۱۶/ سے یہ رسالہ مولانا مجاہد حسین حبیبی صاحب کی ادارت میں جاری ہے۔ مئی ۲۰۰۷ء میں حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی مقناطیسی شخصیت پر ایک ضخیم ''مجاہد ملت نمبر'' شائع ہوا اور کئی خصوصی شمارے ہیں۔

☆ **سہ ماہی حضرت بلال کلکتہ:** عاشق رسول سیدنا حضرت بلال صحابی رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یاد میں ۲۰۰۳ء میں نارکل ڈانگہ، کلکتہ۔۱۱/ سے حضرت مولانا علی اعظم خاں قادری صاحب کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے کئی خصوصی شمارے جیسے غوث اعظم نمبر، مخدوم یحییٰ منیری نمبر، مخدوم کچھوچھہ مقدسہ نمبر، حضور محدث بریلوی شائع ہوئے۔ ۲/ سال کے بعد یہ رسالہ دو ماہی ہو گیا فی الحال بند ہے۔

☆ **پندرہ روزہ غازی ملت کلکتہ:** ۲۰۰۱ء میں مولانا غوث سیوانی کی ادارت میں اسماعیل اسٹریٹ کلکتہ۔۱۴/ سے جاری ہوا۔ اس کے کئی شمارے جیسے علامہ ارشد القادری نمبر، حضرت تیغ علی شاہ نمبر، امام احمد رضا نمبر اس میں ایک خاص گوشہ حضرت تاج الشریعہ پر تھا۔ ۲۰۰۴ء میں روزنامہ کی شکل اختیار کر گیا اور تقریباً دو تین ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

☆ **ماہنامہ گلستان رضا، کلکتہ:** نومبر ۲۰۰۹ء میں حضور حجۃ الاسلام مفتی حامد رضا خاں قادری

بریلوی علیہ الرحمہ کی یاد میں مولانا شاہد القادری صاحب کی ادارت میں مٹیا برج کلکتہ سے جاری ہے۔ جس کا اجرا حضرت مولانا سید غلام حبیبی صاحب قبلہ (سجادہ نشین خانقاہ مجاہد ملت، اڑیسہ) نے فرمایا۔ خصوصی شمارہ میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، سیدنا غریب نواز اور سیدنا محدث بریلوی پر شائع ہوا۔ آئندہ حضور حجۃ الاسلام علامہ حامد رضا خاں نوری قادری بریلوی علیہ الرحمہ کی حیات طیبہ پر ۵۰۰ رصفحات پر ۲۰۱۲ء میں نمبر شائع کرنے کی تیاریاں جاری ہیں۔

مراجع:

۱ ماہنامہ اعلیٰ حضرت کا گولڈن جبلی نمبر (۲۰۱۰ء)، ص:۱۸۶۔

۲ ماہنامہ پیام حرم، ستمبر ۲۰۰۷ء ص:۴۶

۳ ماہنامہ پیام حرم، ستمبر ۲۰۰۷ء ص:۴۶۔

۴ کلیات مکاتیب رضا، حصہ دوم، ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی۔ ص:۳۵۸۔

۵ ماہنامہ گلستان رضا، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص:۵۔

۶ کلیات مکاتیب رضا، حصہ دوم، ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی، ص:۳۵۹۔

۷ جہان ملک العلما، ڈاکٹر جابر شمس مصباحی، ص:۷۹۴۔

۸ جہان ملک العلماء، ڈاکٹر جابر شمس مصباحی، ص:۷۹۵۔

۹ سوانح مولانا غیاث الدین سہسرامی، مولانا ڈاکٹر ساحل سہسرامی۔

۱۰ جہان ملک العلما، ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی، ص:۹۷۱۔

۱۱ افکار مجاہد ملت، مولانا محمد شاہد القادری۔

۱۲ رئیس القلم نمبر، مولانا خوشتر نورانی۔

○ ○ ○

غلام مصطفیٰ رضوی، مالیگاؤں
gmrazvi92@gmail.com

حمایتِ دین، صحافت اور فکرِ اعلیٰ حضرت

(یہ مقالہ امام احمد رضا کانفرنس و سمینار میرا روڈ ممبئی میں ۲۶/۲۷ فروری ۲۰۱۱ء کو علما و دانش وروں کے اجتماع میں پیش کیا گیا، مقالہ تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا۔ نیز اس پر ارباب علم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔)

بیسویں صدی میں میڈیا کی بڑھتی ہوئی قوت و اہمیت نے دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کی مسلسل ترقی اور نئے آفاق کی تلاش نے میڈیا پر بھی نمایاں اثر ڈالا۔ اکیسویں صدی میں حال یہ ہے کہ اس کی دست رس سے دنیا کا کوئی خطہ باہر نہیں، ہر جگہ میڈیا کی چھاپ ہے، ہر شعبۂ حیات اس کی بندش میں جکڑا ہوا ہے۔ اَبلاغ اور میڈیا درج ذیل امور کے ذریعے ترقی کی منزل پر پہنچا:

۱ پریس (اُمور طباعت و اشاعت)

۲ کمپیوٹر

۳ سٹیلائٹ

۴ انٹرنیٹ/تھری جی

۵ ٹیلی ویژن

۶ ایف ایم، ریڈیو......وغیرہ

الیکٹرانک میڈیا بڑا برق رفتار واقع ہوا ہے لیکن پرنٹ میڈیا نے بھی اپنی اہمیت برقرار رکھی

اور اس سلسلے میں اخبارات و جرائد کی اشاعت ہر روز بڑھ رہی ہے۔ ان کے توسط سے جہاں لادینی نظریات، صہیونی افکار و خیالات عام ہو رہے ہیں، یہودی سازشیں اپنا دائرہ وسیع کر رہی ہیں وہیں بہ نام اسلام وجود میں آنے والے باطل اور گستاخ فرقوں کے گم راہ کن نظریات آن کی آن میں مسلم معاشرے میں پھیلتے جا رہے ہیں، ان کے جرثومے میڈیا اور صحافت کے ذریعے پنپ رہے ہیں اور فضا مسموم ہوئی جاتی ہے۔ ایک صدی پیش تر (۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۱ء میں) جب کہ میڈیا اور صحافت کی اہمیت اجاگر نہیں ہوئی تھی مفکر اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی (م ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) نے اشاعتِ دین، اَبلاغِ حق اور دینِ متین کے فروغ کی غرض سے اسلامی صحافت کے قیام و استحکام پر زور دیا تھا، اعلیٰ حضرت کے افکار کا اہم نکتہ یہ تھا:

"آپ کے مذہبی اخبار شائع ہوں اور وقتاً فوقتاً ہر قسم کے حمایتِ مذہب میں مضامین تمام ملک میں بہ قیمت و بلا قیمت روزانہ یا کم از کم ہفتہ وار پہنچاتے رہیں۔"[1]

پریس کی قوت کو آغاز ہی میں سمجھ لینا بڑی بات ہے، بندۂ مومن کی یہ شان ہے کہ وہ بے پناہ بصیرت سے مالا مال ہوتا ہے۔ اُس کی دانشِ نورانی مستقبل کے خطرات محسوس کر لیتی ہے، اُس کی تجاویز میں قوم کے عروج و اقبال کا فلسفہ مستور ہوتا ہے:

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

قوم کی بے توجہی و بے پروائی کہ صحافت کے تئیں مسلسل اور مستقل بے داری نہیں رہی جب کہ یہود و نصاریٰ اِس کی اہمیت بھانپ گئے تھے اور اُسی وقت کام شروع کر دیا تھا۔ یہودی خفیہ دستاویز کا ایک نکتہ یہ ہے کہ: "آج کی دنیا میں پریس (Press) ایک عظیم طاقت ہے، پریس کے حقیقی رول کو دراصل بہت کم سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، ریاستیں اِس بے پناہ طاقت کا صحیح استعمال نہیں جانتیں اور اب یہ طاقت ہمارے قبضہ میں ہے، پریس کی قوت سے پس پردہ رہتے ہوئے سارے

عالَم پر اثر انداز ہونے کی قوت حاصل ہوگئی ہے۔'' ۲

میڈیا کا منفی کردار: ایک صدی قبل امام احمد رضا نے قوم کو باخبر کردیا تھا، جاگنے کا پیغام دیا تھا، اسلام کی اشاعت کے لیے صحافت اور جدید ذرائع اَبلاغ (جو شریعت کے دائرے میں ہوں) کے استعمال کی دعوت دی تھی۔قوم کی بے خبری کا یہ حال کہ آج صحافت کے تقریباً ہر شعبے پر اسلام دشمن لابی حاوی ہے۔ ہمارے ملک کا میڈیا زعفرانی فکر کا شکار ہے۔ دو سال پیش تر کی ہی مثال سامنے ہے۔ ہیمنت کرکرے نے تشدد اور دہشت گردی کے جن چہروں سے پردہ اٹھایا تھا، دلائل کے باوجود تنگ نظر میڈیا نے مجرم کی حمایت کی اور صداقت کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی حالاں کہ مکروہ چہرے یکے بعد دیگرے بے نقاب ہوتے چلے جارہے ہیں، دنیا دیکھ رہی ہے انسانیت کا دشمن کون ہے؟ اور دوسری سمت حال یہ کہ بھول سے کسی واردات میں کسی مسلم کا نام آجائے تو اُسے اسلام سے جوڑ کر پروپے گنڈے کا بازار گرم کردیا جاتا ہے۔ انصاف و دیانت کے تمام اصول بالائے طاق رکھ دیے جاتے ہیں۔ اسلام دشمنی کا مظاہرہ کھل کر دیکھنے کو ملتا ہے۔

صحافت کی عمومی تعبیر: میڈیا رفتہ رفتہ ایک مستقل فن کی صورت میں سامنے آیا۔ اِس کے کینوس میں جو وسعت ہے اُس کا انداز Exploring Journalism کے مرتبین کی رائے میں اس طرح ہے: ''صحافت جدید وسائل اَبلاغ کے ذریعے عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے۔'' جب کہ موجودہ صحافت کا معاملہ اجاگر ہے کہ وہ اِس تعبیر سے کس قدر دور ہے اور اِس کی غیر متوازن پالیسی بھی واضح ہے۔

متوسلینِ رضا کا صحافتی پس منظر: فکرِ رضا کے صحافتی نکتے پر عہدِ رضا میں متوسلینِ رضا اور وابستگانِ رضا نے کسی قدر توجہ مرکوز کی اور عملاً کام بھی کیا۔ امام احمد رضا نے اسلامی صحافت کی آبیاری خود بھی کی اور اِس کی رگوں کو تازہ خون بھی فراہم کیا۔ متوسلینِ رضا جنھوں نے صحافت کی وادی کو زرخیز بنایا اور اپنے اخبارات و رسائل کے توسط سے اشاعتِ دین و اصلاحِ

مسلمین کا کام لیا، ان کی ایک مختصر فہرست اس طرح ہے:

(۱) ہفت روزہ دبدبۂ سکندری، رام پور (۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں جاری ہوا، کامیابی کے ساتھ قریب ایک صدی جاری رہا۔ اس نے قوم وملت کی بڑی خدمت کی اور اسلامی فکر کی ترجمانی کرتا رہا۔)

(۲) اخبار روز افزوں، بریلی (برادرِ رضا مولانا حسن رضا خاں کی سرپرستی میں جاری ہوا۔)

(۳) اخبار الاسلام افریقا (۱۳۲۲ھ/۱۹۰۸ء میں خلیفۂ رضا مولانا احمد مختار میرٹھی نے جاری کیا، اخبار کا مزاج داعیانہ تھا۔ اس میں نومسلم افراد کی تربیت کے لیے بھی کافی مواد شامل ہوتا۔)

(۴) ہفت روزہ الفقیہ امرت سر (۱۹۱۸ء میں خلیفۂ رضا مولانا محمد شریف کوٹلوی نے جاری فرمایا۔)

(۵) ہفت روزہ اہل فقہ امرت سر (۱۳۲۴ھ میں جاری ہوا۔ عقائد اہل سنت کی ترجمانی میں پنجاب میں اِس کا اہم رول رہا ہے۔)

(۶) ماہ نامہ الرضا بریلی (صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی کے زیر اہتمام اور مولانا حسنین رضا کی ادارت میں ۱۳۳۸ھ میں جاری ہوا۔ کتبِ رضا کی سلسلہ وار اشاعت اِس کا اہم پہلو ہے۔)

(۷) ماہ نامہ انجمن نعمانیہ لاہور (انجمن نعمانیہ کے صدر ثانی مولانا شاہ محرم علی چشتی، امام احمد رضا سے قلبی وابستگی رکھتے تھے، دینی وقومی اور فکری معاملات میں رہ نمائی لیتے تھے۔)

(۸) ماہ نامہ السوادُ الاعظم مراد آباد (۱۳۳۸ھ میں خلیفۂ رضا مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے جاری فرمایا، اسلامی اُصولوں پر سیاسی رہ نمائی کی اور حمایتِ دین میں نگارشات کی اشاعت کا فریضہ انجام دیا ساتھ ہی دیابنہ اور آریاؤں کے اعتراضات کے بروقت جوابات شایع کیے۔)

(۹) ماہ نامہ تحفۂ حنفیہ پٹنہ (اِس کا اِجرا خلیفۂ رضا مولانا قاضی عبد الوحید فردوسی نے ۱۳۱۵ھ میں فرمایا، ادارت کے فرایض مولانا ابوالمساکین محمد ضیاء الدین نے انجام دیے، اس رسالے نے عقائد اہل سنت کی حمایت میں موثر کردار ادا کیا، امام احمد رضا کی درجنوں علمی و تحقیقی تصانیف کی باضابطہ اشاعت کی۔) [۳]

اِن رسائل و اخبارات نے اسلامی صحافت کو فروغ دیا، برصغیر میں انگریز کے زیر اثر وجود پانے والے لادینی نظریات کا دنداں شکن جواب دیا۔ لیکن افسوس کہ اپنوں کی بے اعتنائی نے اِن کی رگوں کو خونِ تازہ فراہم نہیں کیا، اِن میں کچھ تو کم مدت میں دم توڑ گئے اور بعض کافی آگے تک پہنچے اور ہندوستان میں اسلامی صحافت کی ایک مثال قائم کر گئے۔ اخبار دبدبۂ سکندری میں شائع ایک تحریر میں امام احمد رضا فرماتے ہیں:

''عوام میں اشاعتِ خیالات کا سہل تر ذریعہ اخبارات ہیں، بہ استثنا بعض وہ خود آزادی کے دل دادہ ہیں۔ بد مذہبی بلکہ لا مذہبی کے خیالات آئے دن شائع ہوں وہ نہ جھگڑا ہے نہ نفسانیت، مگر حق کی تائید اور اِس کے لیے اپنا کوئی صفحہ دینا جھگڑے میں پڑنا اور نفسانیت پر اڑنا ہے۔'' ۴

حمایت دین کے لیے جذبۂ خیر: اعلیٰ حضرت نے اخبارات کی اشاعت کا بنیادی مقصد دین کی اشاعت قرار دیا، معاصر اخبار الفقیہ امرت سر نے جب آپ سے قلمی تعاون مانگا تو قلمی تعاون کے ساتھ ہی مالی تعاون سے بھی نوازا، تنبیہ بھی فرمائی کہ دین کی اشاعت ہی محورِ نگاہ ہو، مولانا مقبول احمد مصباحی لکھتے ہیں:

> ''الفقیہ امرت سر'' اخبار کا اجرا ہوا۔ اخبار کے مدیر نے امام احمد رضا سے اس کی اعانت و ترقی کے لیے اپنی نگہِ عنایت کو منعطف کرنے کی درخواست کی۔ امام احمد رضا نے اپنے اہلِ خانہ سے بارہ افراد کو اِس کا سالانہ ممبر بنا دیا اور تین روپے سالانہ فی کس کے حساب سے ۳۶/روپے ارسال کر دیے۔ اور یہ صراحت بھی تحریر فرما دی کہ ''ہمارا یہ تعاون اخبار کے ساتھ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اخبار خالص اسلامی فکر و عقیدہ اور اہلِ سنت کے عقائد کی ترجمانی کرتا رہے گا۔ جوں ہی اس میں فرق آئے گا احمد رضا قلم کے ساتھ ساتھ اپنا ہاتھ بھی کھینچ لے گا۔'' ۵

عہد رضا کے اخبار دبدبۂ سکندری رام پور نے بھی حمایتِ دین کی غرض سے مخلصانہ

خدمت انجام دی۔ اِس اخبار نے فتنۂ ارتداد ''شدھی تحریک'' جسے فرقہ پرستوں نے اسلام کے خلاف بڑے خفیہ طریقے سے میدان میں اتارا تھی اُس کی سرکوبی میں اہم کردار ادا کیا، فتنۂ شدھی تحریک کو کچلنے کے لیے اعلیٰ حضرت کے حکم پر جماعت رضائے مصطفیٰ نے وہ سرگرمی دکھائی جو ہماری جماعت کی تاریخ کا نقشِ جمیل ہے۔ جماعت کی روداد اور ارکان کی داعیانہ سرگرمیوں کی پل پل کی رپورٹ دبدبۂ سکندری میں شایع ہوتی تھی۔ گویا متوسلینِ رضا نے فکرِ رضا پر اُسی دور میں عمل بھی کر دکھایا۔ یہ موضوع تحقیقی ورک کی احتیاج رکھتا ہے۔

پیش منظر: آج کیا ہم نہیں دیکھ رہے کہ اخبارات الا ماشاء اللہ کس طرح سے بے راہ روی کا شکار ہیں، اشاعتِ حق میں بعض ہی مخلص ہیں، اکثر مغربیت، جدیدت، لادینیت اور ماڈرنائزیشن سے مرعوب ہیں، اب تو اُردو صحافت بھی شفافیت سے عاری ہوتی جا رہی ہے۔ پھر یہ پہلو بھی لایق تردد ہے کہ صحافت پر اغیار چھائے ہیں جس کا سبب بھی ہماری اپنی بے اعتنائی اور لاپروائی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہمارے یہاں اصحابِ قلم کی کمی ہے بلکہ باعثِ تردد یہ امر ہے کہ ہمارے اصحابِ قلم میں اخبارات کے لیے لکھنے کا رجحان کم ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اِس میں مالی فائدہ نہیں لیکن دین کی اشاعت اور مسلک حق کے فروغ کے لیے اِسے نظر انداز کرنا غیر دانش مندانہ بات ہے، اِس لیے میں آج یہاں موجود اربابِ علم و دانش سے عرض کروں گا کہ وہ نوجوان نسل کے اصحابِ قرطاس وقلم کی حوصلہ افزائی کریں، اُن میں اسپرٹ پیدا کریں کہ وہ موجودہ صحافت کے شانہ بشانہ مسلکِ حق کی اشاعت کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں، اِس طرح فکرِ اعلیٰ حضرت کی اشاعت بھی ہوگی اور باطل فرقوں کے فریب سے قوم کے تحفظ کا سامان بھی ہوگا۔

آخری نکتہ یہ بھی پیش کیے دیتا ہوں کہ الحمدللہ! صحافت جس کا مقصد ترسیل و اَبلاغ ہے ہمارے یہاں ۱۴ رصدی پہلے سے اِس کا صالح نظام قائم ہے، اشاعتِ دین کا پورا نیٹ ورک اور دعوتِ حق کا معاملہ دراصل ہمارا کامیاب صحافتی محاذ ہے، مساجد کے منبر بھی دعوتِ حق کے لیے اہم

مقام ہیں، انھیں بھی اِسی رُخ سے دیکھا جاسکتا ہے،ہمیں قرآن مقدس نے جو یہ حکم دیا کہ: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

''اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری سے منع کریں، اور یہی لوگ مراد کو پہنچے''۶ (کنزالایمان)

اِس میں بھی ترسیلِ حق کی جو ترغیب ہے یہ دراصل دعوتِ دین کی غرض سے میڈیا کے درست استعمال پر ہمیں غور وفکر کی دعوت بھی ہے۔

ضرورت ہے کہ: صحافت کے تمام ذرائع اشاعتِ مسلک کی نیت سے بروے کار لائے جائیں، مشہور مَقولہ ہے: شرابِ کہن در جامِ نو...... شراب وہی رہے جو ہمیں اَسلاف سے ملی، لیکن پیمانے جدید تقاضوں کے اعتبار سے بدلے جاتے رہیں، دائرۂ شرع میں رہ کر صحافت کے میڈیم اشاعت دین وسنیت کے لیے استعمال میں لائیں۔ آج جنگیں میزائل وبموں سے لڑی جارہی ہیں ہم شمشیر وسناں سے اپنا دفاع کریں گے تو مٹا دیے جائیں گے، اِس لیے ضروری ہے کہ فروغِ اہل سنت کے لیے فکرِ رضا کی رہ نمائی میں انٹرنیٹ، سٹیلائٹ اور پرنٹ میڈیا کے استعمال سے صالح انقلاب برپا کریں

ع بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا

ضرورت اِس بات کی ہے کہ امام احمد رضا کے افکار پر عمل کر کے قوم کی صحیح رہ نمائی اور فکری تربیت کی جائے، ذرائع اَبلاغ کا استعمال اسلام کی اشاعت کے لیے کیا جائے تو فکر کے گلستاں میں بہار آجائے گی اور عقیدہ وایمان تازہ ہو اٹھیں گے:

رکھتا ہے اب تک مے خانۂ مشرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو اِدراک

☆☆☆

حواشی وحوالہ جات:

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج ۱۲، ص ۱۳۴

(۲) یہودی پروٹوکول، بہ حوالہ ماہ نامہ ضیائے حرم لاہور جولائی ۱۹۷۲ء

(۳) یہ فہرست مولانا عبدالسلام رضوی کے تحقیقی مقالہ ''عہد رضا میں وابستگان رضا کی صحافتی خدمات'' مشمولہ یادگار رضا ممبئی ۲۰۰۹ء سے لی گئی ہے تفصیل مقالہ میں دیکھیں۔

(۴) کلیات مکاتیب رضا، دوم، ص ۳۴۵

(۵) مہمان اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور مئی ۲۰۰۶ء، ص ۳، بہ حوالہ کلیات مکاتیب رضا

(۶) سورۃ آل عمران: ۱۰۴

محمد حنیف خاں رضوی بریلوی
صدر المدرسین جامعہ نوریہ رضویہ بریلی شریف

⊙

رضویات کے فروغ واستحکام کے لیے چند تجاویز

امام احمد رضا قدس سرہ کے افکار ونظریات کی اشاعت ایک صدی سے ہوتی آرہی ہے اور امت مسلمہ کو ان کی تعلیمات کے سلسلے میں مختلف ذرائع سے روشناس کرایا جارہا ہے لیکن امام اہل سنت کے پیغام کو جس انداز سے پیش کرکے اپنوں اور غیروں تک پہنچانا ضروری تھا وہ کما حقہ نہ ہوسکا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کچھ نہیں ہوا، الحمد للہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں رضویات کے فروغ کا سلسلہ وہاں تک پہونچ گیا جس کا وہم وگمان بھی نہیں تھا اور اب حال یہ ہے کہ ہماری جماعت کا ماہنامہ ہو یا سالنامہ، ہفتہ روزہ ہو یا پندرہ روزہ، کم از کم ایک مقالہ تو رضویات کے تعلق سے ضرور شائع کرتا ہے اور ہر سال درجنوں مستقل کتابیں منظر عام پر آجاتی ہیں، حتیٰ کہ اب یہ سلسلہ اس منزل پر پہونچ گیا ہے کہ کوئی شخص ان کے ناموں کا احاطہ کرنے بیٹھے اور مقالات ومضامین کی فہرست تیار کرے تو برسوں کوشش کرنا ہوگی، سیدنا امام احمد رضا کے تعلق سے کتابیں اور مقالات ہزاروں کی گنتی میں ہیں، لیکن یہ سب منتشر اور غیر مرتب ہیں اور محنت اور کوشش کے اعتبار سے افادیت اقل قلیل۔

اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ آج تک کوئی ایسا تنظیمی ڈھانچہ تیار نہ ہوسکا جس میں بالغ نظر مصنف ومحقق، مفکر ومدبر اور مختلف زبانوں کے ماہرین موجود ہوتے، ساتھ ہی اہل ثروت کی ان کو مکمل پشت پناہی حاصل ہوتی، موجودہ صورت حال یہ ہے کہ کہیں اہل ثروت ہیں تو محقق نہیں اور کہیں بالغ نظر محقق ومصنف ہیں تو اہل ثروت ندارد۔

ہندو پاک بلکہ عالمی سطح پر درجنوں ادارے فروغ رضویات کے لیے کمر بستہ ہوئے اور ہورہے ہیں، سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جارہی ہیں لیکن مکمل نظم ونسق کے ساتھ یہ کام اسی وقت انجام پاتا جب پہلے غور وفکر کے بعد اس عنوان کا خاکہ تیار کیا جاتا، پھر ارباب علم ودانش اور ماہرین فکر وفن بحث وتمحیص کے بعد اس کو آخری شکل دیتے، اس کے بعد ارباب بست وکشاد اس کے لیے بجٹ کی فراہمی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، اس طرح اہل ثروت اور ارباب علم وفضل دونوں کے اتحاد واتفاق اور تال میل سے کوئی ادارہ وجود میں آتا جس میں عصری تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ کا آغاز ہوتا تو جتنا سرمایہ آج تک فروغ رضویات میں صرف ہوا اور ہورہا ہے اس کے چوتھائی حصے سے ایسا پائیدار کام ہوجاتا جس کو صدیوں نہ بھلایا جاتا، لیکن ہماری جماعت کا انداز فکر اور طریقہ کار کچھ اور ہی ہے، اکثر جگہ نمود ونمائش، پروپیگنڈہ، دینی مقاصد میں شہرت پسندی، دنیوی مفاد کا غلبہ جیسے عناصر اس طرح درآئے ہیں کہ اب خلوص نیت سے کام کرنے والے بھی مشکوک نظر آتے ہیں، اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ جو کام تنظیمی سطح پر ہونا تھا اس کو شخصی طور پر کیا جارہا ہے اور شخصیات کے لیے دشواریاں ہر دور میں رہی ہیں، جو حضرات اجتماعی اور تنظیمی سطح پر کام کرنا چاہتے ہیں، خلوص اور جذبہ دینی بھی رکھتے ہیں ان کے لیے سرمایہ کا فقدان ایک بنیادی رکاوٹ ہے۔

اس پس منظر میں پیش منظر کی جانب توجہ مبذول کرانے کے لیے یہ چند سطور سپرد قرطاس ہیں:

امام احمد رضا کی تصانیف ایک ہزار کے قریب بتائی جاتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، لیکن اب تک منظر عام پر آنے والی ڈھائی سو سے زیادہ نہیں، بعض حضرات نے تصانیف کی فہرستیں بھی تیار کی ہیں اور ناموں کی نشاندہی کے ساتھ یہ تعداد چھ سو اور آٹھ سو تک پہنچائی ہے بلکہ بعض نے نو سو تک شمار کرائی ہیں لیکن کوئی فہرست اب تک جامع مانع مرتب نہ ہوسکی، حضرت مصنف نے بعض کتابوں کے نام دو دو بھی رکھے ہیں بلکہ بعض کے تین نام بھی ہیں اور شمار کرانے والے ہر نام کو علاحدہ مستقل تصنیف کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کتابوں کی فہرست تو لمبی ہوجاتی ہے لیکن محققین اور ریسرچ اسکالروں کے لیے دردِ سر بن جاتی ہے۔

مثلاً ''الامن والعلیٰ'' نامی کتاب کا دوسرا نام ''اکمال الطامه'' اور ضمنی رسالہ کا نام ''منیة اللبیب'' ہے، تصنیف ایک ہے اور نام تین، فہرست سازی کرنے والے سب کو علاحدہ علاحدہ شمار

کر رہے ہیں۔

اسی طرح "سبحان السبوح" کا دوسرا نام "دوصد تازیانہ برفرق جہول زمانہ" ہے، فہرستوں میں دو کتابیں علاحدہ علاحدہ شمار کی گئی ہیں۔ لہٰذا آج تک فہرست بھی مکمل نہ ہوسکی، پھر آگے کی کیا شکایت۔ دوسرا مرحلہ اصل کتابوں کی تلاش اور ان کو منظر عام پر لانے کا تھا، انفرادی کوششیں بہت ہوئیں اور ہو رہی ہیں، کامیابی بھی ملی لیکن کوشش کرنے والوں کا جو ہدف تھا وہ کوسوں دور کی بات ہے۔ ایک ہزار میں ڈھائی سو کتابوں کا منظر عام پر آنا جماعت اہل سنت اور سواد اعظم کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

راقم الحروف کی ناقص رائے میں مندرجہ ذیل امور پر فوری توجہ کی ضرورت ہے ورنہ مزید وقت گزر جانے پر پشیمانی اور افسوس میں اضافہ ہی ہوگا۔

(۱) ارباب بست وکشاد اور اہل ثروت، بالغ نظر علما اور ماہرین رضویات کی سرپرستی میں امام اہل سنت کی ان تصانیف کی تلاش، جستجو میں ہندو پاک کا دورہ کریں اور ہر قیمت پر اس دینی وملی ذخیرہ کو حاصل کریں۔

(۲) کم از کم بیس افراد پر مشتمل دانش وروں اور ریسرچ اسکالروں کی ایک ٹیم تشکیل دیں جو موجودہ تصانیف کو عصری تقاضوں کے پیش نظر جدید طرز پر مرتب کریں اور حسن صوری ومعنوی کے ساتھ ان کو شائع کیا جائے۔

(۳) امام احمد رضا نے جن درسی اور غیر درسی کتابوں پر حواشی تحریر فرمائے ہیں ان کو صاف کر کے اصل کتابوں کی ان عبارتوں کے ساتھ شائع کریں جن پر حواشی قلم بند فرمائے ہیں۔

(۴) تمام تصانیف کا مکمل سیٹ مع حواشی خواہ پچاس جلدوں میں ہو یا سو جلدوں میں ایک ساتھ شائع کیا جائے اور ہندو پاک کی تمام چھوٹی بڑی لائبریریوں میں بلا قیمت اپنے خرچ پر پہنچایا جائے۔

(۵) تمام تصانیف عربی زبان میں منتقل کرائی جائیں اور عرب دنیا کی لائبریریوں میں پہنچائی جائیں۔

(۶) جن تصانیف کی اشاعت انگلش وہندی زبان میں ضروری سمجھی جائے ان کا ان زبانوں میں ٹرانسلیشن کیا جائے۔

(۷) اصل کتابیں علما وطلبہ کے لیے باقی رہیں لیکن عمومی افادہ واستفادہ کے لیے یہاں ہندو پاک میں ترجمہ ضروری ہے، لہٰذا جو ترجمے ہو چکے ہیں ان پر ماہرین سے نظر ثانی اور اصلاح کرائی جائے اس کے

بعد ان کی اشاعت ہو۔

(۸) کتابیں جو بھی شائع ہوں ان کی تصحیح اعلیٰ پیمانے پر ہو۔

(۹) امام اہل سنت پر اب تک جو کچھ لکھا گیا اس کو یکجا کیا جائے اور مکمل مواد یکجا کرنے کے بعد حضرت پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مجددی علیہ الرحمہ کا بنایا ہوا خاکہ ''دائرہ معارف امام احمد رضا'' سامنے رکھا جائے اور اس میں حذف واضافہ کے بعد جملہ عنوانات پر بھرپور معلومات فراہم کی جائیں اور ہر موضوع پر مستند معلومات کے ساتھ امام موصوف کی سیرت وسوانح، حیات وخدمات اور ملی ودینی کارناموں کو قید تحریر میں لایا جائے اور مختلف زبانوں میں ان کی اشاعت ہو۔

(۱۰) ''مسلک اعلیٰ حضرت کیا ہے'' اس سلسلہ میں ایک تفصیلی کتاب کم از کم پانچ ارباب علم وفضل سے لکھوائی جائے اور وہ ہندو پاک کے کم از کم پانچ سو علمائے کرام اور مفتیان عظام کی تائیدات سے مزین ہوتا کہ اس موضوع پر پھر کوئی حرف زنی نہ کر سکے اور جو اس نعرہ سے متفق نہیں ہیں ان کے لیے بھی شرح صدر کا سامان ہو سکے، بلکہ جن کو مسلک اعلیٰ حضرت کی صحیح حدود معلوم نہیں ہیں وہ بھی اس کو جان لیں کہ مسلک کا اطلاق کن امور پر ہوتا ہے اور ان کی مخالفت مسلک سے خروج کا سبب کب بنتی ہے۔

تلک عشرة كاملة

یہ کامل دس تجاویز ہیں، باقی ارباب علم ودانش کے مشورہ سے ان میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

○ ○ ○

عبدالمجید سرور
ایڈیٹر سرور ٹائمز، مالیگاؤں

⊙

مولانا احمد رضا خان اور اقتدارِ باطل

عبدالمجید سرور مالیگاؤں کے متوطن تھے۔ دارالرشاد سرائے میز اعظم گڈھ اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے تربیت یافتہ تھے۔ جماعت اسلامی سنٹرل باڈی کے رکن رکین تھے۔ ہفت روزہ 'سرور ٹائمز' مالیگاؤں کے ایڈیٹر تھے۔ شعر وادب اور تقریر و تحقیق سے خاصا شغف تھا۔ امام احمد رضا کی ذات، خدمات، افکار، نظریات کے گہرے مطالعہ کے بعد انہوں نے یہ مضمون لکھا۔ ۱۹۹۹ء میں لکھا گیا یہ مضمون اب تک نہیں چھپا۔ ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی کے توسط سے یہ گراں قدر نادر مضمون ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ ہم ان کے شکریہ کے ساتھ پہلی بار ہم یہاں شائع کرتے ہیں۔ واضح رہے مضمون نگار کا وصال ۲۰۰۱ء کے بعد ہوگیا۔ گویا یہ تحریر عبدالمجید سرور کی آخیر عمر کی ہے۔ (شمس مصباحی)

عمر کی ابتدائی منزلیں تھیں، بسم اللہ خوانی ہو چکی تھی، ہمارے محلے موتی تالاب میں بڑی تعداد میں ہندوستانی قریشی رہتے تھے۔ میرے شب و روز انہیں کے درمیان گزرتے تھے۔ شہر بہت چھوٹا سا تھا۔ چند گلیوں، چند راستوں اور چند محلوں پر مشتمل۔ ہماری گلی ختم ہوتے ہی کھیت شروع ہو جاتے تھے، جس میں بوائی ہوتی تھی، فصل لہلہاتی تھی۔ بجلی آ چکی تھی، لیکن اسے شیطانی چرخا کہا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا استعمال عام نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں گلی کے قریشیوں کے بچے، اسلام پورہ کی دوست

محمد مسجد میں قرآن پڑھنے جاتے تھے، اکثریت ان پڑھ تھی، پرائمری اسکول اور مدارس نہ تھے، جو تھے، ان میں والدین بچوں کو داخل کرانے سے خائف رہتے تھے، قرآن پڑھانا بڑی برکت، سعادت اور کامرانی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ خط آجاتا تھا، تو اس کا پڑھنے والا نہیں ملتا تھا۔ جو گنے چنے لوگ اردو خوانی میں معمولی شُد بُد رکھتے تھے، ان کو منشی کہا جاتا تھا۔ انہیں سے خط پڑھانے کی کوشش کی جاتی تھی اور وہ بے چارہ منشی اٹک اٹک کر کچھ صحیح بہت کچھ اٹکل سے خط پڑھ دیتا تھا۔ تعلیم عام نہ تھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے، میں بھی قریش برادری کے ان بچوں کے ساتھ حاجی دوست محمد کی اس مسجد کے مدرسہ میں قرآن پڑھنے جایا کرتا تھا۔ آج بھی اس کی دھندلی یادیں میرے ذہن سے لپٹی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد مجھے وہاں جانے سے روک دیا گیا اور مدرسہ بیت العلوم میں بھیجا جانے لگا، میں نے وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ میرے بچپن کے ساتھی اب بھی اسی مدرسے میں پڑھنے جایا کرتے تھے، میرا ان کا ساتھ چھوٹ گیا تھا، اس کا مجھے بڑا صدمہ تھا، اس وقت مجھے اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ وہ رضائیوں کا مدرسہ تھا، میرے ننھے سے ذہن میں خیال کی کونپل پھوٹی ''رضائی کوئی الگ مخلوق ہے، جس سے ہمیں بچنا چاہیے۔''

زندگی میں پہلی بار مجھے لفظ رضائی سے آگاہی ہوئی۔ پھر تعلیم کا سلسلہ بیت العلوم، انگلو اردو ہائی اسکول، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) اور استاذ محترم علامہ عبدالمجید نعمانی تک چلا۔ ایک علمی، ادبی، تحقیقی ذہن بنا، لیکن مطالعہ کا سلسلہ یک طرف چلا۔ ایسے علما اور مصنفین کی کتابیں پڑھتا رہا، جن کے یہاں مولانا احمد رضا خاں کا ذکر تک نہیں آتا تھا۔ مواعظ میں ایک دوسرے کے خلاف شدت کے جذبات سننے میں آئے تھے، میں کبھی مولانا احمد رضا خاں کی طرف رجوع نہیں ہوسکا۔ مولانا ماہر القادری سے میرے مراسم تھے، وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے، میری تحریروں کی ادبی حیثیت، میرے مضامین، میری غزلوں میں تنقیدوں کو سراہتے تھے، ان کا یہ جملہ میری طویل ادبی وعلمی زندگی کا اثاثہ ہے، انہوں نے ایک بار مجھے لکھا'' آپ ایک بیدار مغز نقاد، قابل قدر محقق اور دلیر صحافی ہیں۔'' آخر وقت تک فاران مجھے بھیجتے رہے۔ ۱۱رمئی ۱۹۷۸ء کو جب حجاز کے ایک مشاعرے میں انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی، تو اللہ تعالیٰ نے ۱۹۴۵ میں انہوں نے جوتمنا کی

تھی، اسے قبول کرلیا تھا، انہوں نے دھولیہ کے طرحی آل انڈیا مشاعرے کے مقطع میں پڑھا تھا۔

'میں دیکھنے میں یہاں ہوں ماہر مگر مرا دل حجاز میں ہے اور اردو ادب کا یہ کوہِ علم و وقار، شریعت واسلام کا شیدا جدہ سے جنت المعلیٰ میں ہمیشہ کی ہمتیں کے لیے جذب ہوگیا۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کے برادر محترم مسرور حسین صاحب نے ترسیل کا سلسلہ جاری رکھا۔' اسی فاران میں ماہر القادری نے ایک بار مولانا احمد رضا خان کے بارے میں لکھا۔

''مولانا احمد رضا خان دینی علوم کے جامع تھے، یہاں تک کہ ریاضی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ دینی علم وفضل کے ساتھ ساتھ شیوہ بیان شاعر بھی تھے، ان کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ مجازی راہِ سخن سے ہٹ کر صرف ''نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کو اپنے افکار کا موضوع سخن بنایا۔ مولانا احمد رضا خان کے چھوٹے بھائی مولانا حسن خاں بڑے خوشگوار شاعر تھے اور مرزا داغ سے نسبت تلمذ رکھتے تھے، مولانا احمد رضا کی نعتیہ غزل کا یہ مطلع۔

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

جب استاد مرزا داغ کو حسن بریلوی نے سنایا، تو داغ نے بہت تعریف کی اور فرمایا کہ مولوی ہوکر ایسے اچھے شعر کہتا ہے۔ (ماہنامہ فاران، کراچی، (پاکستان) ستمبر ۱۹۷۳ء، ص: ۴۴-۴۵)

مولانا ماہر القادری کی یہ وہ تحریر تھی، جس نے پہلی بار سوچنے پر مجبور کیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ سنی سنائی باتوں میں آکر میں نے مولانا احمد رضا خاں کی علمی، شعری، ادبی، روحانی حیثیت کے بارے میں کوئی مطالعہ نہیں کیا ہے؟ اس کے بعد سے مسلسل میں اس کوشش میں رہا کہ مولانا کو پڑھوں لیکن مشکل یہ تھی کہ جس حلقے سے میرا تعلق تھا، وہاں ان کی کتابوں کا ملنا جوئے شیر لانا تھا، چند سال قبل بھیونڈی سائی نگر کے ایک دوست کے تعاون سے مولانا کے افکار، نظریات، تصورات اور خیالات اور ان کی علمی ادبی کتابوں کو دیکھنے کا موقع ملا، جواب بھی جاری ہے۔

مطالعہ کے دوران یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ مولانا احمد رضا خان تصنیف وتالیف کے میدان کے بھی شہ سوار تھے، تحقیق، تدقیق، تبحرِ علمی اور کثرتِ تصنیف اور موضوعات کے تنوع لیکن

تمام تصنیفات کا رخ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی جانب یک طرفہ ہے، بلاشبہ اس لحاظ سے مولانا جینئس عبقری اور نابغہ میں شمار کیے جائیں گے۔ ایک اندازے کے مطابق مولانا نے ایک ہزار کتابیں لکھی ہیں۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث و اصول حدیث، عقائد و کلام، فقہ، اصول فقہ، لغتِ فقہ، فرائض، تجوید، تنقیدات، تصوف، اذکار، اوفاق، اخلاق، تاریخ، سِیَر، مناقب، فضائل، ادب، نحو، لغت، عروض، زیجات، جبر و مقابلہ، مثلث، ارثما طیقی۔ لوگارثم، توقیت، نجوم، حساب، ہیئت، ہندسہ، ریاضی، فلسفہ، منطق اور دیگر معلوم موضوعات پر مبنی ہیں۔ پھر ایک ایک موضوع پر متعدد تصانیف و تالیفات میں اس کا حصار کیا گیا۔ مولانا احمد رضا خاں کو دنیا کی کئی معلوم اور بڑی زبانوں پر قدرت، دستگاہ اور تصنیفی و تحریری عبور حاصل تھا۔ چنانچہ عربی، فارسی، اردو، عرب اردو، فارسی، فارسی اردو، عربی فارسی اردو، زبانوں پر مولانا کی کتابیں مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا کے کارناموں پر ١٠٠ ر کے قریب کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

اسی مطالعہ کے دوران یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ مولانا احمد رضا خان اسلامی دنیا میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ قندھار (کابل) کے ایک سرکردہ قبیلے کے ایک پٹھان سعید اللہ خان تھے، جو مغل دور میں لاہور آئے اور باوقار عہدوں پر فائزہ ہوئے۔ لاہور کا شیش محل انہیں کی جاگیر تھا۔ لاہور سے شش ہزاری عہدے پر دہلی منتقل ہوئے۔ ان کے ایک بیٹے کو جن کا نام سعادت یار خان تھا۔ انہیں حکومت مغلیہ نے جنگی مہم سر کرنے کے لیے روہیل کھنڈ بھیجا تھا۔ فتح کے بعد ان کا انتقال وہیں ہوا۔ ان کے تین بیٹے میں سے ایک کاظم خان بریلی آئے، کچھ دن حکومت کے بعض اہم عہدوں پر ذمے داریاں انجام دیں اور ترک دنیا کر کے بریلی میں سکونت اختیار کر لی۔ کاظم علی خاں بدایوں کے تحصیلدار انہی اعظم خاں کے بیٹے تھے جن کے پاس دو سو سواروں کا دستہ تھا۔ انہیں جاگیر میں آٹھ گاؤں ملے تھے۔ ان کے بیٹے رضا علی خاں (متوفی ١٢٨٢ھ) روہیل کھنڈ کے بزرگ علما میں شمار کیے جاتے تھے، انہی کے زمانے میں اس خاندان میں حکمرانی کا دور ختم ہوا۔ فقر و درویشی کا رنگ غالب آیا۔ ان کے صاحبزادے مولانا نقی علی خان (متوفی ١٢٩٧ھ) علوم ظاہری و باطنی سے متصف جلیل القدر عالم تھے، آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے، اعلیٰ

حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی انہی مولانا نقی علی خان کے صاحبزادے تھے۔ ان کی ولادت بریلی میں دس شوال ۱۲۷۲ھ بمطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء کو ہوئی۔ ولادت کی ہجری تاریخ اس آیت کریمہ سے مستخرج ہوتے ہیں۔ اولئک کتب فی قلوبھم الایمان ایدھم بروح منه۔ یہ ہیں وہ لوگ اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں میں ایمان نقش فرمادیا ہے اور اپنی طرف کی روح سے ان کی مدد فرمائی ہے۔

میرا تعلق مسلمانوں کی اس نسل سے ہے جس نے ہوش سنبھالا، لکھنے پڑھنے کی شُد بُد پائی تو نیاز فتحپوری کی فن ویزداں کے تصورات اور نیاز کے سحر نگار قلم کے اثر میں آگئے۔ پروفیسر شوکت ہزاروی، سید اختر علی تلہری اور علی اختر حیدر آبادی کے فلسفۂ دہریت نے ہمیں اپنے دینی ماحول سے جدا کر دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا، جب کائنات کی مادی تعبیر، جدلی مادیت کے نظریات، نئی نسل کو متاثر کر رہے تھے۔ روس ایک طاقتور اسٹیٹ کی صورت میں ان مادہ پرستانہ نظریات کی عملی تعبیر قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اردو ادب میں میں ترقی پسندی کا غلغلہ عام تھا اور نئی نسل اسے ہی علم وہوش مندی سمجھنے لگی تھی اور اپنے آبائی دین اور اس کے اثرات سے آزاد ہو رہی تھی۔ میں بھی چند سال ان کاذب نظریات کا اسیر رہا اور میری اسارت اس وقت ختم ہوئی، جب میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے استدلالی قلم اور صاف واضح نثری سرمائے سے آگاہ ہوا اور مولانا کی کتاب 'تنقیحات' میں 'تجدد کا پائے چوبیں' کے عنوان سے نیاز فتحپوری کے افکار کا تعاقب دیکھا۔ یہی وہ مضمون تھا، جو مجھے دوبارہ اپنی بنیادی اسلامی شناخت کی طرف واپس لایا اور ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ جو ہم پر مسلمان کی چھاپ لگی ہے آخر وہ ہے کیا؟ اس کے بعد مولانا مودودی کی کتابیں یکے بعد دیگرے پڑھتا چلا گیا اور اپنے مسلمان ہونے پر پورا انشراح صدر حاصل ہو گیا۔ اسلام کے بارے میں معذرت خواہی کا رویہ ہم نے ترک کر دیا۔ اسی زمانے میں جب مطالعہ کا سلسلہ جاری تھا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ تحریر مولانا احمد رضا خان صاحب کے تعلق سے پڑھی اور ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا اور مولانا احمد رضا خان کے علمی کارناموں کو جاننے کی مزید جستجو ہوئی۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"مولانا احمد رضا خان صاحب کے علم وفضل کا میرے دل میں بڑا احترام ہے، فی الواقع وہ

علوم دینی پر بڑی نظر رکھتے تھے اور ان کی اس فضیلت کا اعتراف، ان لوگوں کو بھی ہے، جو ان سے اختلاف رکھتے ہیں؟

ذہن و مزاج میں شاعری، ادب، تحقیق اور صحافت سے مناسبت تھی۔ تقریباً ۱۹۴۳ء سے میں نے لکھنا بھی شروع کر دیا تھا، اسی زمانے میں جماعتِ اسلامی کے حلقے سے افتخار اعظمی صاحب بڑے توانا اور اسلوب بیان کے ساتھ اور اسلام کے حلقے میں نمایاں ہوئے، افتخار صاحب کے تنقیدی ادبی مضامین اسلامی ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں ادب کو کلمہ پڑھانے کی جو تحریک ادب اسلامی نے جاری کی تھی۔ افتخار اعظمی صاحب کے ان عظیم ناقدوں میں تھے، اردو کے قدیم نعتیہ کلام کا جائزہ انہوں نے ''ارمغان حرم'' کے عنوان سے لیا ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا احمد رضا خاں کے بارے میں لکھا ہے۔

''احمد رضا بریلوی کے مسلک سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ غیر معمولی ذہین متبحر عالم تھے، وہ عالم دین کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے، ان کی شاعرانہ تخلیقات کی طرف کم توجہ دی گئی۔ حالاں کہ ان کا نعتیہ کلام اس پایہ کا ہے کہ انہیں طبقۂ اول کے نعت گو شعرا میں جگہ دینی چاہئے۔ انہیں بیان اور زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کے یہاں تصنع اور تکلف نہیں۔ چوں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ جس کی وجہ سے ان کا کلام شدتِ احساس کے ساتھ خلوص جذبات کا آئینہ دار ہے۔ (ص:۴۱)

اس طرح مولانا احمد رضا خاں صاحب سے مزید ذہنی قربت ہوئی۔ دوری اور اجتناب کی کیفیت قریب قریب ختم ہوگئی۔ اب تک مولانا کے بارے میں میرے جو خیالات تھے وہ مزید تبدیل ہو چکے تھے، لیکن اجنبیت پھر بھی باقی رہی۔ ابتدائے زندگی سے اپنے ماحول کے باعث جو بے رغبتی پیدا ہوئی تھی، وہ بنی ہوئی تھی، عین انہی دنوں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پرسنل اسسٹینٹ ملک غلام علی صاحب، جو خود بھی زبردست عالم تھے، قدیم و جدید علوم پر عبور رکھتے تھے۔ بعد میں جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں انہیں عدالت کا جج بھی نامزد کیا گیا تھا۔ کی رائے پڑھنے میں آئی، ملک غلام علی نے لکھا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں اب تک ہم لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔ ان کی بعض تصانیف اور فتاویٰ کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو علمی گہرائی، میں نے ان کے یہاں پائی وہ بہت کم علما میں پائی جاتی ہے اور عشق خدا اور عشق رسول تو ان کی سطر سطر سے پھوٹا پڑتا ہے۔ (ہفت روزہ شہاب لاہور، ۲۰؍نومبر ۱۹۶۲)

اپنے گھر میں میں نے مولانا شرف علی تھانوی اور ان کی بہشتی زیور کا بہت زیادہ ذکر اپنے بزرگوں سے سنا تھا اور یہ تمام بزرگ دینی علم وفضل اور ان پر عمل کرنے میں ممتاز تھے، بڑے حافظ جی کے خانوادے کے لوگ تھے بعد میں میرے بڑے ماموں حافظ محمد یوسف، حافظ محمد غفران، حاجی محمد شفیع، حاجی محمد صدیق یہ اب بھی بقید حیات نہیں ان سبھوں نے اپنے اسلاف کے علم وفضل کا یہ معیار قائم رکھا تھا اور آج مولانا ظل الرحمٰن جیسا نوجوان اپنے بزرگوں کی اس شمع کو ہاتھ میں لیے امامت اور پیشوائی کے منصب پر فائز ہونے جارہا ہے۔ ایسے گھرانے میں دین کا چرچا جہاں عام رہا ہے، وہاں مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کی بہشتی زیور کا بھی چرچا رہا ہے۔ انہی مولانا اشرف علی تھانوی نے مولانا احمد رضا خاں کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے دل میں احمد رضا کے لیے بے حد احترام ہے، وہ ہمیں کافر کہتا ہے لیکن عشق رسول کی بنا پہ کہتا ہے کسی اور غرض سے تو نہیں کہتا۔''

مولانا احمد رضا خان کے بارے میں یہ ان علما ادیبوں شاعروں اور ناقدوں کی رائے تھی۔ ذہنی وفکری نظریاتی، علمی وادبی طور پر جن سے میری ذہنی قربت تھی۔ جن کی اصابت رائے کا میں قائل تھا، جن کی علمی، ادبی، دینی کوششیں میرے لیے قابل تقلید وعمل تھیں۔ اس لیے میں نے سب سے پہلے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی شاعری اور نثر کا مطالعہ شروع کیا اور جوں جوں مطالعہ آگے بڑھتا جاتا تھا مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرے اندر بھی علمی، ادبی، لسانی طور پر اضافہ ہو رہا ہے۔ مولانا احمد رضا کی نعتیہ شاعری کے مطالعہ سے پہلے نعتیہ شاعری کے بارے میں میری رائے تھی کہ ایسی شاعری کرنے سے بہتر ہے کہ شاعر تسبیح لے اور سو بار درود شریف پڑھ لیا کرے کم سے کم ثواب تو ملے گا۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں افراط وتفریط سے محفوظ رہے۔ لیکن مولانا احمد رضا خاں کی

سنبھلی ہوئی، مگر والہیت سے بھرپور نعتیہ شاعری کے مطالعہ کے بعد میری نظر میں نعتیہ شاعری اور اس کا فنی علو بڑھتا چلا گیا۔

جیسے جیسے مولانا احمد رضا خاں کے افکار وخیالات کا مطالعہ بڑھتا گیا۔ دل میں مولانا کی عظمت کا احساس جاگزیں ہوتا گیا۔ مولانا احمد رضا خاں ایک عہد آفریں شخصیت کا نام ہے۔ جس کے علم، جس کے قلم، جس کی فکری یلغار نے اسلام کے گرد سے اٹے ہوئے ماضی کو ایک نئے، روشن اور تابناک حال سے جوڑنے کا مجددانہ کارنامہ انجام دیا۔

مولانا احمد رضا خاں کا اسلوب نگارش اپنے وقت کی نہایت تازہ کار اردو زبان سے تھی، یہ وہ پرکشش اسلوب تھا جو روزمرہ اور محاورہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے، اس کے ایک ایک گوشے اور شوشے کو باریک سے باریک نکتے کو اس طرح روشنی میں لے آتے تھے کہ اشتباہ باقی ہی نہیں رہنے پاتا تھا۔ مولانا کا اپنا ایک سیاسی نقطۂ نظر بھی تھا۔ وہ دین اور سیاست میں فرق وامتیاز کے قائل نہ تھے، بلکہ سیاست کو بھی دین کے تابع ہی مانتے تھے، مولانا کی سیاست کا محور مرکز دین حق تھا۔ وہ شاخوں کے کاٹنے کے قائل نہ تھے، بلکہ شرک، اصنام کی تہذیب وثقافت اس کے غلبہ واستیلاء کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ساری زندگی ساعی رہے۔ ان کی سانس سانس اور زندگی کا لمحہ لمحہ اور تحریر کا نقطہ نقطہ اس بات کا شاہد عادل ہے، ان کی نظر میں جہاد صرف یہی نہیں ہے کہ تلوار لے کر جنگاہِ خیر وشر میں رزم آرا ہو جائے۔ بلکہ انسان کے کردار میں مجاہدانہ شان اور رنگ روپ بھی مجاہدانہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے سستی جذباتیت اور نعرہ بازی کی بجائے، وہ صبر وتحمل اور پتہ ماری سے باطل کے ایک ایک نشان کو مٹانے کے لیے سرگرم تھے، باطل کی تہذیب، ثقافت، اس کا ننگا پن اس کی بے شرمی اور بے حیائی، جو اس زمانے میں مسلمانوں کی ذہنی مرعوبیت کا سامان بنی ہوئی تھی اور مسلمان ''دیسی انگریز'' بننے میں جو ریس لگائے ہوئے تھے، وہ ان کے لباس سے لے کر ان کی ثقافتی گندگیوں تک قبول کرنے لگے تھے، سرسید احمد خاں کی تحریک نے ایک طرف تو مسلمانوں کے اندر انگریزی سے ڈر اور نفرت کم کی تھی۔ مگر اس کا ایک بڑا نقصان بھی ہوا تھا اور وہ یہ کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ انگریزیت کے رنگ ڈھنگ میں

ڈوب گیا تھا۔ مولانا احمد رضا خاں نے اس آنے والے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ یہ مولانا کی قرآنی اور اسلامی نظر کا کمال تھا کہ انہوں نے بروقت اس کا احساس وادراک کیا اور اس کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، سب جانتے ہیں کہ روشِ عام سے ہٹ کر چلنے والوں کو دشواریوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن مولانا احمد رضا خاں نے عشق خدا ورسول میں ڈوب کر کسی بات کی پرواہ نہیں کی اور اس انگریزی تہذیب کو عقلی ونقلی طریقے سے ہدف بنایا۔ حالاں کہ یہ وہ زمانہ تھا، جب ملک پر انگریزی حکومت پوری قاہرانہ طاقت سے جم چکی تھی اور ملک میں اس کی غلامی سے رہائی کی تحریکوں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد جس بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تھا اور ان میں خوف ودہشت پیدا کی گئی انہیں بے زر بے در اور بے گھر کیا گیا تھا۔ مولانا احمد رضا خاں نے انہیں خوب سمجھا، پرکھا اور دیکھا تھا اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان اس قسم کی کسی تحریک اور اسی طرح کے جذباتی راستے سے وقت کی انگریز قاہر حکومت سے متصادم ہوئے، تو ان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ بعد کے حالات نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ مولانا احمد رضا خاں نے شاخوں کو الگ الگ کاٹنے کی بجائے اس پورے نظام کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جذبات پیدا کیے جو اس نظام کا خاصہ تھے۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے علما کی اکثریت نے 'ترک موالات' کا فتویٰ صادر کیا۔ جس میں انگریزی عدالتوں، تعلیم گاہوں، دفتروں، پولس اور افواج سے عدم تعاون وموالات کا فتویٰ صادر کیا۔ اس وقت تک کانگریس بھی 'نان کوآپریشن' ریزرویشن منظور کر چکی تھی۔ یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔

اس فتویٰ پر غیر منقسم ہندوستان کے ہر صوبے اور بڑے بڑے علما کرام کے دستخط ملتے ہیں مگر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد رضا خاں کے دستخطوں سے یہ فتویٰ عاری ہے اس فتوے نے ہندوستان میں انگریزی عمل دخل ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اس سے برطانوی قاہر حکومت کے رعب وداب ۱۸۵۷ء کے بعد ایک اور ضرب لگی لوگوں میں انگریزوں کے خلاف لب کشائی کی جرأت پیدا ہوئی، لیکن انگریزی تہذیب وثقافت اس وقت تک سیاسی غلبہ واستیلاء سے زیادہ خطرناک حد تک غالب آچکی تھی، نئی تہذیب کلچر اور ثقافت کیطوفانِ بدتمیزی میں اسلامی تہذیب

وثقافت اور اسلامیت کے لیے سنگین صورت حال پیدا ہوگئی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح آج ہندوئیت کے بڑھتے ہوئے غلبے میں ملت اسلامیہ کے لیے سنگین سوالات پیدا کر دیئے ہیں۔ مولانا احمد رضا خاں اپنی بے مثال اسلامی فہم وبصیرت سے اس کیفیت کو دیکھ رہے تھے، دین اور سیاست کا جداگانہ تصور وہ نہیں رکھتے تھے، ان کی فکر مکمل اسلامی تھی، جو کتاب وسنت سے ہم آہنگ تھی، اس لیے مولانا احمد رضا خاں نے پوری باجگری سے باطل انگریزی تہذیب وثقافت اور عیسائیت کے تثلیث کے نظم پر بلاخوف قلم کا حملہ جاری رکھا۔ مولانا کا یہ وہ جہاد بالقلم تھا، جو جہاد بالسیف سے زیادہ کارگر اور تیز تھا۔ مغرب اور مغربی تہذیب کے دلدادہ اور مغربی تہذیب کے عشوہ وغمزہ جس پر چیخ چیخ اٹھے۔ مغرب اور مغربیت دونوں بے چین ہو اٹھے اور مولانا کو بدنام کرنے کی ایک ایک مہم جاری کردی گئی۔ ترکِ موالات کے فتویٰ پر دستخط نہ کرنے کو بنیاد بنا کر انہیں جنگاہِ آزادی سے فراری بتانے کے لیے زبان وقلم اور پرچار و پروپیگنڈے کے وہ آتشیں اسلحہ استعمال کیے گئے کہ شیطان بھی انہیں دیکھ کر شرمندہ ہونے لگا۔ شکست خوردہ ذہنیتیں جو اپنی اصل کو چھوڑ کر دوسروں کے تابع مہمل اور ان کی تہذیب وثقافت کے فکری وعملی غلام بن جاتے ہیں۔ وہ اس قسم کی اوچھی حرکتوں پر اتر آتے ہیں۔ اللہ کے پاک نبی فداہ امی وابی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ان کے زمانے کے معاندین نے یہی سلوک کیا۔ بعد میں ان کے حقیقی پیروؤں اور جانثاروں اور فداکاروں کو بھی اسی ذلیل پرچار کا نشانہ بنایا گیا۔ اس طرح مولانا احمد رضا خاں نے عشق رسول کا ایک اور ثبوت دے دیا ورنہ ان کے جد امجد مولانا رضا علی کا اسم گرامی برطانوی حکمرانوں کی نیندیں اڑا دیتا تھا۔ انہوں نے برطانوی تسلط کے خلاف مجاہدین آزادی کی نہ صرف بھرپور حمایت کی تھی۔ بلکہ اپنے ہراول دستے کے ساتھ جنگ آزادی میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ برٹش جنرل ہڈسن نے آپ کا سر قلم کرنے والے کو انعام دینے کا اعلان تک کیا تھا۔ لیکن آپ اور آپ کا پورا خاندان برطانوی تسلط اور جبر وانقلاب اور لادینی نظم حکومت کے خلاف برسرِ پیکار اور اسلامی نظام کے احیاء، اس کے بقاء واستحکام کے لیے ہمیشہ سرگرم رہا۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب ۱۸۵۷ء کے زخم خوردہ انگریز ہر قسم کے حربے استعمال کر کے ہندوستان کو

اپنے زیرِ نگیں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، انہوں نے چند زرخرید مولویوں سے فتویٰ عدم جہاد حاصل کر کے مسلمانوں کے سینے سے اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جذبۂ جہاد کو بالکل محو کر کے مسلمانوں کی تمام روحانی وجسمانی قوتوں کو ناکارہ بنادینے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن مولانا فضل حق خیر آبادی، سید کفایت اللہ کافی مرادآبادی، مولانا سید عبدالجلیل (علیگ) مولانا امام بخش صہبائی، مولانا رضا علی جیسے مجاہد وکبیر علمائے اہل سنت نے انگریزوں کی اس چال کو پیدل مات دیا۔ ناکافی وسائل کے باوجود جنگ آزادی میں ان کے حلیفوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کر کے ان کے عزائم مٹی میں ملادیئے۔ اس جہاد میں ان علما کی بیش قیمت جائیدادیں اور جما ہوا کاروبار تباہ ہوگیا۔ مگر ان لوگوں نے غیر ملکی تثلیث زادوں کی بالادستی وحکمرانی قبول نہیں کی۔ یہ تاریخ ہے کہ ۱۲۵۰ھ میں جب مولانا احمد اللہ مدراسی اور جنرل بخت خاں نے مرادآباد پر حملہ کیا، تو مولانا رضا علی اس لشکر کے ہمراہ شریک جہاد تھے، اس جنگ میں برطانوی فوجی دستہ ہزیمت اٹھا کر رامپور کی طرف بھاگ نکلا تھا۔

مولانا محمد احسن دہلوی نے اس پہلو سے بڑی وضاحت سے لکھا ہے:

’آپ جنگِ آزادی کے عظیم رہنما تھے، عمر بھر فرنگی تسلط سے برسرِ پیکار رہے۔ آپ ایک بہترین جنگجو اور بے باک سیاسی تھے۔ لارڈ ہیڈنگ آپ کے نام سے بے حد نالاں رہا، جنرل ہڈسن جیسے برطانوی جنرل نے آپ کا سر قلم کرنے کا انعام ۵۰۰ روپے مقرر کیا تھا، مگر وہ اپنے مقصد میں عمر بھر ناکام رہا‘

اب ایک انگریز مؤرخ کی بات بھی پڑھ لیجیے وہ لکھتا ہے:

’جب برطانوی حکام ہندوستان پر مکمل قبضے کی کوشش کر رہے تھے، اس وقت فضل حق خیر آبادی احمد اللہ مدراسی، امام بخش صہبائی اور رضا علی بریلوی جیسے پُر جوش اور الہڑ مولوی برطانوی اقتدار کے خلاف سنگین وآہنیں دیوار بنے ہوئے تھے۔‘

ایک برطانوی ذمے دار آفیسر ملی سن نے اپنی خفیہ رپورٹ میں برٹش حکومت کو آگاہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

’رضا علی بریلوی نے جب برطانوی حکومت کے خلاف جہاد میں حصہ لیا، تو انگریزوں نے

آپ کے احاطہ میں نقب لگوائی اور ۲۵ گھوڑے چوری کرا لیے کیوں کہ رضا علی یہ گھوڑے تحریکِ آزادی کے کارکنوں کو انگریزوں پر شب خون مارنے کے لیے مفت دیتے تھے، اس کے علاوہ آپ کی حویلی میں اکثر و بیشتر انگریزوں کے خلاف کام کرنے والے کارکنوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ لنگر وغیرہ بھی آپ ہی تقسیم کرتے تھے۔'

برطانوی مؤرخ ڈاکٹر ملی سن مید لکھتا ہے:

'بریلی شریف میں جب برطانوی حکام کے خلاف شورش پھیلی تو اس کے تمام تر ذمے دار جنرل بخت خاں اور ان کے ساتھی ملا رضا علی بریلوی ولد حافظ کاظم علی والد سعادت یار خان پٹھان ہی تھے، جو بریلی کے عوام کو برطانوی حکومت کے خلاف اکسانے کے نہ صرف مجرم ٹھہرے، بلکہ انہوں نے بریلی کے عوام کو برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے بے انتہا جوش دلایا۔

'اگر ملا رضا علی اپنے عقیدت مندوں سمیت ہمارا مقابلہ نہ کرتا تو بریلی شہر پر ہمارا قبضہ کرنا بالکل آسان ہوتا۔ اس بریلوی ملا رضا علی کی مزاحمت کی وجہ سے برطانوی افواج کو کافی کشت و خون اور آگ کے دریا کو پار کرنا پڑا۔ تب جا کر بہ مشکل بریلی پر قبضہ کیا جا سکا۔'

مولانا کے تمام ساتھی شہید ہو گئے تو آپ اپنی حویلی کے اندر ہتھیاروں سے لیس ہو کر سینہ سپر ہو گئے۔ بریلی پر قبضہ کر کے انگریز بچے کھچے مجاہدین کا تعاقب اور ان کو شہید کرنا شروع کر دیا۔ جو مجاہدین آزادی ان کے سامنے آئے، گولی کا نشانہ بن گئے۔ جنرل بخت خاں، مولانا احمد اللہ مدراسی بھی شہید ہو گئے۔ مولانا رضا علی بریلی میں تن تنہا باقی بچے رہے تھے، جو اپنی حویلی میں محصور اور قلعہ بند ہو گئے تھے، انگریزوں نے آپ کو زندہ گرفتار کرنے یا سر مبارک قلم کرنے کی ہر چند کوشش کی۔ یہاں تک کہ فصیل اور حفاظتی دیوار پھاند کر جب انگریزی فوج اندر گھس گئی اس وقت مولانا زرہ بکتر پہن کر شمشیر بکف تھے اور قرآن کی آیات تلاوت فرما رہے تھے۔ صرف ایک تمنا تھی، خدایا! اس جہاد میں شہادت نصیب ہو، مگر مصلحت خداوندی نہیں چاہتی تھی کہ آپ کا بال بھی بیکا ہو، ورنہ کیا وجہ ہے کہ انگریزی فوج حویلی میں داخل ہو کر بھی آپ کو شہید نہیں کر سکی۔ یہ سارا واقعہ مولانا محمد احسن دہلوی نے ماہنامہ طریقت دلی میں اہل سنت نمبر میں بڑی تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ مولانا کے جد امجد

مولانا فخر الدین قادری سندیلوی بذات خود مولانا رضا علی کے مرید اور شاگرد تھے۔ بریلی میں آپ ہی کے دستہ میں شامل تھے اور جرأت و بہادری کے کارنامے انجام دیتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔

اور مولانا احمد رضا خاں انہیں مولانا رضا علی کے پوتے اور مولانا نقی علی خان کے صاحبزادے ہیں اور مولانا رضا علی کے پدر بزرگوار ہیں حافظ کاظم علی خان، ان کے والد تھے، مالیات کے وزیر سعادت یار خان اور ان کے والد تھے سعید اللہ خان صاحب (شجاعت جنگ بہادر)۔ اس طرح شجاعت، سپہ گری اور اقتدار ان کی میراث قرار پاتے ہیں، غالب نے کہا تھا، سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری۔ اسی طرح مولانا احمد رضا خان پشتی مجاہد اور سپاہی مانے جائیں گے۔ جہاد اور شمشیر وسنان ان کو ورثے میں ملا تھا اس لیے ان کے مزاج اور خمیر میں جہاد کے اوصاف کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اس جہاد کے لیے ایک ایک شاخ کو کاٹنے کا طریقہ نہیں اپنایا۔ بلکہ اپنی دینی اور اسلامی فراست، خدا کی طرف سے دیئے گئے بے پناہ عشق رسول کے سہارے، کفر وشرک، باطل کے قلعے پاش پاش کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ شاخوں کی قطع و برید کی بجائے مولانا احمد رضا خاں نے عشق رسول کے سہارے باطل کے مضبوط اور جمے جمائے اور چاروں طرف سے قابو یافتہ اور گہری جمی ہوئی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کی قلمی علمی اور عملی جدوجہد کی۔ نظریہ تثلیث، مغربی کلچر، مغربی طور طریقے، اس کے پہناوے اور باطل کے نظریئے کو دلائل سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جو کبھی جہاد کیا ہے وہ وہی جہاد تھا۔ جو ایک مجدد کے حصے میں خدا کی طرف سے ودیعت کیا جاتا ہے۔ مولنا احمد رضا خاں نے مغربی افکار و نظریات، نظریۂ تثلیث کے خلاف مسلسل، انتھک اور بے خوف جہاد کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس کی وجہ سے ہندوستان میں برٹش مزاج کو وہ زک اور ہزیمت اٹھانی پڑی ہے کہ جس کی وجہ سے برطانوی اقتدار کے خلاف ہمہ گیر نفرت پھیلی اور وہ بے پناہ جوش و جذبہ پیدا ہوا، جو آگے چل کر برطانوی اقتدار کے خاتمے کے اسباب میں سے ایک اہم اور بنیادی سبب ثابت ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہ علما ہی تھے، جنہوں نے فوجیوں میں سور کی چربی بھرنے کا خیال پیدا کر کے بددلی اور بغاوت کی راہ کھولی تھی، لیکن وہ ایک جذباتی اور ہنگامی عنوان تھا، جس کا انجام بھی بہت جلد اور ہنگامی نکلا۔ جس میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ جائداد و املاک برباد

ہوئیں۔ خانماں بربادی نے جمے جمائے شہروں اور خود کفیل خاندانوں کو بے در، بے گھر اور مارے مارے پھرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مولانا احمد رضا خاں ایک مجدد کی طرح ان سب حالات کوائف کو دیکھ اور سمجھ چکے تھے، چنانچہ انہوں نے جہادِ آزادی کے لیے وہ علمی اور استدلالی طریقہ اختیار کیا جو برطانوی سامراجی نظریوں اوران کے درآمد کیے جانے والے تثلیث کے عقیدے کو اس طرح دیس نکالا دینے لگا کہ آہستہ آہستہ یہ غیر ملکی استبداد اور سامراج والے وادیٔ موت کے راستے پر بڑھنے لگا۔

مولانا احمد رضا خان نے جس دور میں ایک مجدد کی طرح باطل سیاست اور باطل افکار وخیالات کے خلاف اپنی چومکھی لڑائی کا آغاز کیا تھا، اس زمانے میں ہندوستانی مسلمان، تعلیمی تہذیب، ملی اور سیاسی طور پر غلام اور مفلوج ہوتا چلا گیا تھا، انہوں نے اس بے دینی کو جوان کے زمانے میں سیاست کے دروازے سے مسلمانوں کی اجتماعیت میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کی سخت مخالفت کی اور علیٰ وجہ البصیرت کی۔ انہوں نے پر شور اور نعرہ باز سیاسی لیڈروں کی طرح سڑک چھاپ رہنمائی اور قیادت کو یکسر مسترد کر کے ایک باوقار اور عالمانہ مقام وموقف اختیار کیا اور علمی واستدلالی انداز واسلوب سے انگریزی تہذیب اس کے دوں نہاد کلچر کو جو مسلمانوں کی تہذیب ومعاشرت کو ہڑپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی زبردست استدلالی طاقت سے بے نقاب کیا اور مسلمانوں کے دلوں میں اس تہذیب، تمدن، کلچر، طرزِ معاشرت سے نفرت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور انگریزی نظریات کے غلبہ واستیلاء کے خلاف مکمل مدلل علمی جہاد کیا اور ایسا کیا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ مفتی شمس الضحیٰ اشرفی الجیلانی بلیک برن (یوکے) کے ایک مضمون 'شان تجدید' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'وہ سیدی فاضل بریلوی علیہ الرحمہ، جس نے خارجی محاذ پر تثلیث کے فرزندوں کی عیارانہ چالوں کو واشگاف کیا، الحاد ودہریت کے ناخداؤں، مغرب کی مادہ پرست تہذیب، نیوٹن اور ڈارون کے فلسفہ ہائے باطلہ کے تاروپود بکھیر دیئے اور طاغوتی طاقتوں کے بھڑکتے ہوئے سیلاب کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہو گئے اور بڑی حد تک مسلمانوں کو گمراہ ہونے سے بچا لیا۔

'اور داخلی محاذ پر دریدہ ذہنیت وتفضیلت کے پھیلنے اور بڑھتے ہوئے جراثیم کو ختم کر کے

قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کی، قادیان سے پیمبری کے بلند بانگ دعوے کے قلعی کھول کر رکھ دی (قادیانیت کو بھی برطانوی فتنہ کہا جاتا ہے جس کے ذریعے امت مسلمہ میں پھوٹ اور انتشار پیدا کیا گیا تھا، برطانوی حکومت کو یقینی مسلم خطرے سے بچانے کی شاطرانہ چال انگریز علمی انداز میں کی تھی تاکہ مسلمانوں کے عقیدے میں دراڑ پڑ جائے اور باعمل اور دلیر مسلمان باہمی جنگ وجدال میں لگ جائیں۔ (مضمون نگار)

ہندوستان میں مسلمان حکومت واقتدار سے بے دخل کردیئے گئے تھے۔ مغلیہ حکومت کی بساط لپیٹ دی گئی تھی۔ انگریز قائم ہو چکا تھا۔ جو بہت ہی ظالمانہ اور قاہرانہ طور پر قبضہ کرتا چلا جارہا تھا اور اس کا اولین نشانہ اور ہدف مسلمان تھے، لاکھوں پھانسی پر چڑھائے گئے تھے۔ بادشاہ ظفر کو رنگون میں قید کردیا گیا تھا، ان کے دو شہزادوں کا سر کاٹ لیا گیا تھا، جائیدادیں اور املاک ضبط کر لی گئی تھیں۔ حبس دوام دریائے شور کی سزا میں مبتلا کردیئے گئے تھے، انگریز پوری سفاکی اور وحشیانہ طور پر مسلمانوں کو دبانے اور ان کی حاکمانہ خو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شب میں کچل رہے تھے اور انقلاب حکومت کے بطن سے بہت سارے نئے نئے فتنے بھی پیدا ہونے لگتے ہیں، اس وقت مسلمانوں کی دینی اور اقتصادی حالت دگرگوں ہوگئی تھی۔ اعتقادی گمراہیاں پیدا ہونے لگی تھیں۔ نئے نئے بدعی مقاصد اور کافرانہ خیالات کی اشاعت ہو رہی تھی۔ فقہی واقتصادی نظریات کا لاؤلشکر قادیانیت کی باطل اور نئی نبوت کا پرچار شروع کر چکا تھا۔ ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ جس طرح دارالایمان مدینہ پر احزاب کفار نے جنگ مسلط کردی تھی اسی طرح ہندوستان میں بھی شریعت دینیہ پر احزاب کفر نے دھاوا بول دیا تھا۔

ایسے نازک اور پُر آشوب دور میں پھونک پھونک کر مگر پوری ذہانت اور بے جگری کے ساتھ قلم اور قدم دونوں کو اٹھانے کی ضرورت تھی کیوں کہ بقول میر تقی میر

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

ان حالات میں جذبات پر ہوش اور جوش پر عقل کے غلبہ کی ضرورت تھی۔ اسلام اس کے

عقائد اور اس کے اساسی و بنیادی نظریات کو کفر و شرک اور بدعت ہی سے نہیں بڑھتی ہوئی عیسائیت، اس کی تثلیث اور اس کے تثلیث زادوں سے بچا کر دنیا کے سامنے حقیقی اسلام پیش کرنا، عصر کے مجدد کی ذمے داری تھی۔ اب چاہے ان باتوں پر کافروں کو ناگواری ہو مشرکوں کو ناگواری ہو، بدعتیوں کو ناگواری ہو، وقت کی قاہر حکومت اور اس دیسی چاکروں کو ناراضگی ہو، مجدد کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ ہر غلط چیز سے اسلام کو بچائے اور اس کے چہرہ مسخ نہ ہونے دے اور بعد کی نسلوں کے لیے حقیقی چہرہ ورثہ میں چھوڑ جائے۔

مولانا احمد رضا خاں نے اپنی غیر معمولی فراست سے یہی کام لیا۔ اگر وہ ترک موالات وغیرہ کے پھیرے میں آ گئے ہوتے، تو انہوں نے جو مجددانہ کارنامے انجام دیئے ہیں، شاید دنیا ان سے محروم رہ جاتی۔ کیوں کہ قائم ہونے والی نئی حکومت جو سات سمندر پار سے عیسائیت اور تثلیث کا عقیدہ لے کر قائم ہو رہی تھی وہ اس میں سد راہ ہوتی۔ اس لیے مولانا احمد رضا خاں نے اس عہد میں دینی و سیاسی و ملی فتنے جو مختلف طریقوں سے سر اٹھا رہے تھے ان کی مدلل علمی و عقلی سرکوبی کی۔ ہر محاذ پر پوری عزیمانہ قوت قلبی اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ ان غیر اسلامی اور باطل تصورات و نظریات سے نبرد آزما ہوئے۔ بلا شبہ انہوں نے برطانوی حکومت کے عیسائی اور تثلیث کے نظریئے پر سخت گرفت کی۔ تثلیث کے عقیدے اور اس کے فرزندوں کی عیارانہ چالوں کو کھول کر رکھ دیا۔ الحاد و مادیت، مغربیت و دہریت کی تہذیب پر ایسے کاری وار کیے کہ وہ تلملا تلملا کر رہ گئی اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کو ان کے حملوں سے بچا لے گیا اور ملک کے ایک ایسا خوشگوار ماحول اور نظریہ اسلام کا چہرہ منقح کر گیا کہ اگر آج بھی ہندوستان کی تعمیر نو مولانا احمد رضا خاں کے بتائے ہوئے اس اسلامی نظریئے اور نظام کی بنیاد پر کی جائے تو امن، مساوات، انصاف، انسان دوستی کی گنگا بہنے لگے، فسادات، دہشت گردی، اسمگلنگ، منافع خوری خون آشامی، سود خوری وغیرہ کا خاتمہ ہو جائے اور ایک خوش حال، ترقی پذیر، انسان دوست ہندوستان کی صورت نکھر کر سامنے آ جائے۔

○ ○ ○

نیوز رپورٹس

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں

فتاویٰ رضویہ پڑھا جا رہا ہے (ڈاکٹر سید امین میاں)

قومی سطح پر منعقدہ امام احمد رضا سمینار و کانفرنس میں علما و دانشوروں کی شرکت

(روزنامہ وترجمان اردو، مالیگاؤں ۱۱ر فروری ۲۰۱۰ء)

ممبئی: امام احمد رضا کو شریعت کے ساتھ ہی طریقت میں بھی مہارت حاصل تھی۔ عالمی جامعات و یونیورسٹیوں میں امام احمد رضا پر تحقیق و ریسرچ ہو رہی ہے۔ آپ کی ذات ایک لائٹ ہاؤس کی سی ہے جس سے دور و نزدیک روشنی پا رہے ہیں۔ آپ کا نام اہل حق کی علامت بن چکا ہے۔ امام احمد رضا ۲۱۰ر علوم میں مہارت رکھتے تھے، جس پر ایک جامع کتاب جلد آ رہی ہے۔ امام احمد رضا ایک ولی کا نام ہے جس نے ۵۴ر سال تک اپنے قلم سے باطل کی سرکوبی کی۔ اعلیٰ حضرت کا مسلک مسلکِ غوث و خواجہ ہے، مسلک صاحب البرکات و مسلک مخدوم سمناں ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں فتاویٰ رضویہ پڑھا جا رہا ہے، ان خیالات کا اظہار امین ملت پروفیسر ڈاکٹر سید محمد امین میاں مارہروی، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے مرکز برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے مرکز برکات رضا ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ امام احمد

رضا سمینار و کانفرنس میں کیا۔ ۷ر فروری کو قومی سطح پر مریا روڈ میں منعقدہ اس علمی اجلاس میں ملک بھر سے مشاہیر دانش وران، علما و مشائخ نے شرکت کی، ملکی و ملی مسائل پر امام احمد رضا کے افکار کی روشنی میں غور و فکر کیا گیا۔ امین ملت نے سمینار کے روح رواں امیر القلم ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی خدمات کی پذیرائی کی اور فرمایا۔ ڈاکٹر غلام جابر نے ایک تحریک کا کام کیا ہے۔ مجھے ان پر فخر ہے۔

صبح ۱۰ ر بجے سمینار کا آغاز شرف ملت حضرت سید محمد اشرف مارہروی، انکم ٹکس کمشنر دہلی نے پرچم کشائی سے فرمایا، ازیں قبل تلاوت و نعت خوانی بھی ہوئی۔ سمینار کی نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر عبد الحمید اکبر، گلبرگہ یونیورسٹی نے انجام دیے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر منظر حسین، رانچی یونیورسٹی نے بہ عنوان ''اعلیٰ حضرت بہ حیثیت مفکر'' پیش کیا۔ موصوف نے کہا: مولانا احمد رضا کی شخصیت ایسے ہشت پہل ہیرے کی مانند ہے جس کا ہر پہلو درخشاں ہے۔ ان کے نزدیک وہی تصوف واقعی ہے جو شریعت کی پابندی رکھتا ہو۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر خواجہ اکرام، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی نے ''نئی نسل اور فکر رضا کی ترسیل، اس کے مسائل اور امکانات'' کے زیر عنوان پیش کیا، موصوف نے علمی دنیا میں امام موصوف پر کام کے سلسلے میں چند سوالات قائم کیے اور تجاویز پیش کیں، موصوف نے کہا: انٹرنیٹ اور میڈیا سطح پر امام احمد رضا پہ کام کی ضرورت ہے، آپ کی کتابوں کو عام فہم انداز میں نئی نسل کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر شائع کر کے عام کیا جائے۔

تیسرا مقالہ پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد دکنی، گلبرگہ یونیورسٹی نے پیش کیا۔ ''امام احمد رضا کا ایک ادبی افق'' کے عنوان سے تحریر کردہ مقالے میں انہوں نے کہا: یونیورسٹیز اور تعلیمی اداروں میں امام احمد رضا کو بہ حیثیت شاعر و ادیب متعارف کرانا وقت کی ضرورت ہے۔ آپ نے منطقی استدلال سے فن نعت گوئی اور ادب فہمی میں امام احمد رضا کی بصیرت پر روشنی ڈالی۔ اس ضمن میں کئی ایک مثالیں بھی ذکر کیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سراج احمد اجملی (شعبۂ اردو) نے ''کمالات رضا کے اعتراف کی صورتیں'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا، موصوف نے علمی انداز میں گفتگو کی اور فرمایا: امام احمد رضا کی سائنسی بصیرت سے عوام کو واقف کرانا چاہیے، انگریزی میں آپ کی تحریریں شائع کر کے انہیں دنیا بھر میں عام کیا جائے۔ ان کا تعارف دانش ور حلقوں میں کروایا جائے تا کہ امت

مسلمہ ان کی خدمات سے استفادہ کرے۔ پانچویں مقالہ نگار، تھے، پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی، شعبۂ اردو مظفر پور یونیورسٹی بہار انہوں نے اپنے مقالہ ''امام احمد رضا کا اسلوب تنقید اردو ادبیات کے حوالے سے'' میں کہا: ادبی خدمات میں بلند منصب پر فائز ایسی جامع شخصیت دور دور تک نظر نہیں آتی۔

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

سمینار کا چھٹا مقالہ بہ عنوان ''امام احمد رضا اور طب یونانی'' ڈاکٹر سعید احسن قادری، یونانی میڈیکل کالج پونے نے پیش کیا، موصوف نے اپنے اس اچھوتے مقالے میں تحریر کیا: آپ نے ضرورت کے تحت طب کے موضوع پر حذاقت کے جلوے دکھائے، لغت وتلفظ ادویہ پر امام کو دسترس حاصل تھی۔ آپ کی طبی بصیرت علم طب کے لیے باعث فخر ہے۔ ساتواں مقالہ ''اعلیٰ حضرت۔ مجدد علم معاشیات'' پروفیسر عبد المجید صدیقی، سابق پرنسپل سٹی کالج مالیگاؤں نے پیش کیا، موصوف نے ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی صورت حال پر گفتگو کی، سچر کمیٹی کی رو سے مسلمانوں کی معاشی میدان میں کم زوری کا حل امام احمد رضا کے معاشی نکات کے تناظر میں کیا۔ موصوف نے کہا: مسلم معیشت کے استحکام کے لیے امام احمد رضا کی تدابیر پر عمل ناگزیر ہے، آج دنیا کو سکون عافیت کے لیے امام احمد رضا کے معاشی نظریات کو اپنا کر مسلم معیشت کے استحکام کی سمت تدریجاً بڑھنا چاہیے۔ ۱۹۱۲ء میں بلا سودی بینک کاری کا تصور امام احمد رضا نے دیا جس کی بنیاد پر معاشی نظریات بڑی تیزی سے دنیا پر اثر انداز ہوئے۔ اب بھی ان نظریات پر عمل کی ضرورت ہے۔ آٹھواں مقالہ ''امام احمد رضا کی اتحاد امت کے لیے جد وجہد'' پروفیسر ڈاکٹر سید شمیم منعمی، اورینٹل یونیورسٹی پٹنہ نے پیش کیا، موصوف نے فرمایا: اتحاد امت مسلمہ کا سب سے بڑا علم بردار امام ہے۔ آپ نے اسلامی روایات کو باقی رکھا۔ پٹنہ سے امام احمد رضا کی سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں۔ امام احمد رضا کی کتابیں نصاب میں داخل کی جانی چاہئیں۔ معمولات اسلامی پر کار بند بہار کی خانقاہیں فکر امام احمد رضا کے مطابق قائم کی گئیں۔ جہاں سے شریعت پر استقامت کا پیغام عام ہوا، اپنے مقالے میں موضوع سے متعلق مثالیں بھی

واضح کیں۔ موصوف نے کئی جہتوں سے امام احمد رضا پر سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو کی، سمینار کی پہلی نشست کے اختتام پر دعائیہ کلمات حضرت سید شاہ محمد اشرف اشرفی الجیلانی نے ارشاد فرمایا اور کہا کہ: امام اہل سنت صادقین کے امام ہیں، ان کے مسلک پر استقامت میں نجات ہے۔ تاثرات حضرت سید محمد اشرف میاں مارہروی نے دیے، موصوف نے فرمایا: ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے پانی میں پتھر ڈال کر اضطراب پیدا کر دیا اور سمینار و کانفرنس کے انعقاد سے امام احمد رضا کی خدمات پر علمی کام کے نئے آفاق تلاش کیے ہیں۔

سمینار کی دوسری نشست کے مقالہ نگار ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نجم القادری اور ڈاکٹر امجد رضا امجد تھے، ہر دو نے امام احمد رضا کے اردو ادب پر احسانات، نثری وادبی اثاثے اور دقت نگاہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا، امام کی علمیت کے اعتراف کے باوجود نصاب میں ان پر گوشے شامل نہ کرنا تعصب پر مبنی ہے، اردو ادب کے سرمائے میں امام احمد رضا کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ مفتی عبد المنان کلیمی، جامعہ اکرم العلوم مراد آباد نے ''مسئلہ تکفیر اور امام احمد رضا'' کے عنوان پر استدلال سے بھر پور سنجیدہ گفتگو فرمائی۔ موصوف نے مسئلے کی نزاکت کو شرعی بنیادوں پر واضح کیا، امام احمد رضا کی تحقیق میں احتیاط اور شریعت کی پاس داری واضح کی۔ نماز عصر کے بعد سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی، اٹھتے ہوئے سوالوں کے برجستہ ومدلل جوابات پر پروفیسر ڈاکٹر سید شمیم منعمی نے دیے سنجیدہ اسلوب میں موصوف کے جوابات سے اہل علم محظوظ و مطمئن ہوئے۔ کانفرنس میں جب کہ ملک بھر کے علما و دانش ور اور مشائخ مسند نشیں تھے، امام احمد رضا کی سائنسی بصیرت، قوت استدلال، علوم جدیدہ میں مہارت کے موضوع پر خواجۂ علم وفن خواجہ مظفر حسین رضوی، پورنیہ نے خطاب فرمایا جسے عوام وخواص سبھی نے یکسوئی کے ساتھ سنا۔ بعدہٗ بارگاہ رضا میں پروفیسر فارروق احمد صدیقی نے منقبت پیش کی۔ علامہ عبد القادر علوی براؤں شریف نے خطاب فرمایا، موصوف نے کہا: امام احمد رضا عرب کے بھی امام تھے اور عجم کے بھی، آپ حق کی علامت کے طور پر جانے جاتے ہیں، چشم و چراغ خاندانِ برکات کا نام ہے امام احمد رضا، پہلے کالجوں میں امام احمد رضا کا تذکرہ باعث عار تھا اور آج ہر علم کی بزم امام احمد رضا، پہلے کالجوں میں امام احمد رضا کا تذکرہ باعث عار تھا اور آج ہر علم کی بزم

امام احمد رضا کے ذکر کی خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ مجھے مسرت ہو رہی ہے کہ علمی انداز میں تعارف رضا کے لیے سنجیدہ قلم کار ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے سمینار و کانفرنس کے ذریعے نئے انداز میں کام کا آغاز کیا میں ان کے خلوص کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ آپ نے امام احمد رضا کی عشق نبوی میں سرشاری پر علم الصرف وعلم النحو کے دلائل کی روشنی میں کئی ایک جلوے پیش کیے۔ دورانِ کانفرنس ایک شخص متاثر ہو کر امین ملت کے ہاتھوں داخلِ اسلام ہوا جس کا نام امین ملت ڈاکٹر سید امین میاں مارہروی نے محمد عبد اللہ تجویز کیا۔ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے اس مبارک عمل کو فیض رضا قرار دیا کہ جس سے ایمان دلوں میں بس گیا۔

آخر میں خطبۂ صدارت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری نے ارشاد فرمایا: آپ کا موضوع امام احمد رضا کی محدثانہ وسائنسی بصیرت کے جلوے تھا، فرمایا: امام احمد رضا نے پانی کی رنگت پر تحقیق کی تو حدیث نبوی سے استدلال فرمایا۔ آپ تمام علوم کے ماہر تھے۔ آج حق اور دین حق کسی کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے تو وہ امام احمد رضا کی ذات ہے۔ آپ کا علم بارگاہ غوثیت کا عطا کردہ تھا، جو علم لدنی تھا، جس کی یہ شان کے قلم سے نکلے ہوئے کو کوئی چیلنج نہ کر سکا۔ امام احمد رضا سمینار و کانفرنس کا اہتمام کر کے مولانا غلام جابر شمس نے بہت بڑا قرض اتار دیا ہے۔ کانفرنس کا اختتام ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' جسے نوری مشن مالیگاؤں کے رکن عتیق الرحمٰن حباب رضوی نے پیش کیا۔ اور امین ملت کی پر سوز دعا پر ہوا، اخیر میں علما و دانشوروں اور مشائخ کرام نے اس طرح کی علمی نشست کے انعقاد پر مرکز برکات رضا کو مبادباد پیش کی۔ اس تاریخی سمینار و کانفرنس میں ملک بھر سے ہزاروں اہل علم وارباب دانش نے شرکت کی اور امام احمد رضا کی دینی و علمی خدمات پر سنجیدہ خطبات ومقالات کو سنا۔ مجموعی طور پر نظم وضبط لائق ستائش رہا، اور سمینار و کانفرنس امیدوں سے زیادہ کامیاب اور انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔ جس کی علمی حیثیت یقیناً متاثر کن ہے اور اس کی آواز دور تک پھیلے گی، افکار رضا کی روشنی سے نگاہیں خیرہ ہوں گی اور اس بزم رضا کی خوشبو سے گلستانِ علم وادب مہک اٹھیں گے۔

رپورٹ: غلام مصطفیٰ رضوی مالیگاؤں۔

○ ○ ○

میرا روڈ میں امام احمد رضا انٹرنیشنل سمینار اور کانفرنس کا انعقاد

اعلیٰ حضرت کی علمی اور طبی مہارت پر مقالات

کانفرنس میں مقررین نے امام کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آپ جیسی ماہر علم وفن شخصیت دنیا میں کم نظر آتی ہے

(روز نامہ انقلاب ممبئی، سنیچر، مارچ، ۲۰۱۱ء)

میرا روڈ: ''دنیا کے بڑے بڑے سائنس داں امام احمد رضا کے نظریات پر عمل پیرا ہیں۔ کئی صدیوں تک امام احمد رضا جیسی ماہر علم وفن شخصیت نظر نہیں آتی'' اس طرح کا اظہار خیال مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی پٹنہ نے اپنے تحقیقی مقالہ ''امام رضا اور علم توقیت'' میں کیا۔ برکات رضا چیریٹیبل ٹرسٹ میرا روڈ کے زیر اہتمام منعقدہ امام احمد رضا انٹرنیشنل سمینار و کانفرنس کے دوسرے روز کی پہلی نشست کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، پھر امام احمد رضا کی طبی بصیرت پر ڈاکٹر سعید احسن قادری (پونے میڈیکل کالج) نے مقالہ خوانی کی اور جدید طب میں امام احمد رضا کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ تصنیف رضا ''الدولۃ المکیہ'' کے حوالے سے ریاضی اور سیٹ تھیوری میں امام احمد رضا کی دسترس پر مدلل مقالہ ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی نے پیش کیا۔

اس نشست کا تیسرا مقالہ مولانا مجاہد حسین حبیبی نے رضویات میں علما اور تنظیموں کا کردار کے موضوع پر پیش کیا۔ پروفیسر رفیق منیار کے مقالے کا موضوع تھا (اعلیٰ حضرت اور علم حیوانات Alahazrat and study of zoology)، ادبیات رضا پر مولانا مفتی حسن منظر قدیری نے گفتگو کی۔ مفتی مطیع الرحمٰن نے علوم جدیدہ میں امام احمد رضا کی

دسترس پر مقالہ پیش کیا۔ صدارتی خطبہ میں علامہ یٰسین اختر مصباحی دار القلم دہلی نے کہا کہ ''سنجیدہ علمی انداز میں افکار رضا پیش کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی عظیم قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔''

سمینار کی آخری نشست میں تاثراتی کلمات مفتی محمد علاؤ الدین رضوی (میرا روڈ) نے کہے۔ غلام مصطفیٰ رضوی مالیگاؤں نے اشاعت دین میں فکر رضا کی روشنی میں میڈیا کے کردار پر پُر مغز مقالہ پیش کیا۔ تحقیقات رضویات پر سید ولی الدین نے مقالہ پیش کیا۔ آخری مقالہ ناظم سمینار ڈاکٹر واحد نظیر نے امام احمد رضا کی نعت گوئی میں عزم واحتیاط کے موضوع پر پڑھا۔ عصر تا مغرب سوال وجواب کا علمی سلسلہ جاری رہا۔ سوالات کے جوابات فقیہ النفس مفتی مطیع الرحمٰن رضوی نے دیئے۔ شب میں علما ومشائخ کے فکر انگیز خطاب ہوئے۔

مرکزی خطاب حضرت مفتی محمد مجیب اشرف رضوی (ناگپور) نے دیا۔ انہوں نے کہا کہ ''امام احمد رضا کی مقبولیت ومہارت فن اور اشاعت دین کی بنیاد پر ہے۔ اپنے عہد کے تمام ماہرین فن پر امام احمد رضا فوقیت رکھتے ہیں۔ اسلامی وقار کی بحالی کے لیے آپ کی خدمات سب سے نمایاں ہیں'' اس سمینار وکانفرنس کا اختتام ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کے اظہار تشکر اور رقت انگیز دعا پر ہوا، جب کہ ان کی دو تالیفات ''امام احمد رضا ایک نئی تشکیل اور کاملانِ پورنیہ'' کا اجرا علما کے ہاتھوں ہوا۔ پورے ہندوستان سے ارباب علم ودانش اور جامعات ویونیورسٹی کے اساتذہ نے شرکت کی۔ شرکاء نے پوری متانت کے ساتھ مقالات خطبات کو سنا۔ نیز امام احمد رضا پر تحقیق وریسرچ کے حوالے سے منصوبہ بندی کی گئی۔ اس سمینار کے انعقاد میں میرا روڈ کی سرکردہ شخصیات اور علما وائمہ نے بھی پورا تعاون کیا۔ بڑی تعداد میں علمائے کرام اور ائمہ مساجد نے اس سمینار میں شرکت کی۔

○ ○ ○

عالمی یونیورسٹیوں میں امام احمد رضا تحقیق کا موضوع بن چکے ہیں

دوروزہ امام احمد رضا کانفرنس وسمینار سے علماودانشوروں کا خطاب

(ہفت روزہ انوار، مالیگاؤں بروز پیر ۷؍مارچ ۲۰۱۱ء۔ بمطابق ۲؍ربیع الآخر ۱۴۳۲ھ)

ممبئی۔ امام احمد رضا سائنس کو اصول شریعت کی روشنی میں پرکھنے کے قائل تھے، میں نے ہزاروں صفحات رضویات پر لکھے ہیں لیکن اب بھی بہت سے پہلو تشنہ ہیں، کہ اعلیٰ حضرت علم وفضل کا اتھاہ سمندر ہیں، اس طرح کا اظہار خیال برکات رضا چیریٹیبل ٹرسٹ میرا روڈ کے زیر اہتمام منعقدہ امام احمد رضا سمینار وکانفرنس میں مولانا یٰسین اختر مصباحی (دارالقلم دہلی) نے فرمایا۔

پہلا دن: ۲۶؍فروری۔ سمینار کا آغاز صبح دس بجے تلاوت کلام اللہ سے ہوا۔ پہلی نشست کے مقالہ نگار یہ ان کی تفصیل اس طرح ہے: پروفیسر عبدالمجید صدیقی (سابق پرنسپل سٹی کالج، مالیگاؤں) نے ''اعلیٰ حضرت اور زر کی بازار کاری'' کے موضوع پر پُر مغز مقالہ پیش کیا نیز سود، بنکاری زر بازار، صرف بازار، شیئر اور مسلم اقتصادیات کے لیے امام احمد رضا کے اسلامی معاشی اصولوں پر تفصیلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے فرمایا: اعلیٰ حضرت نے اپنی خداداد بصیرت سے ایک صدی قبل ہی علم معاشیات کی افادیت کو جان لیا تھا اور مسلمانوں کے معاشی استحکام کی غرض سے رہنما اصول پیش کیے تھے۔'' دوسرا مقالہ مولانا محمد حنیف خان رضوی مصباحی (جامعہ نوریہ بریلی) نے ''اشاعت فکر رضا کے لیے دس نکاتی علمی منصوبے'' کے عنوان سے پیش کیا، موصوف نے کہا ''بین الاقوامی سطح پر امام احمد رضا کی تعلیمات کا احیا وقت کا تقاضا ہے'' مولانا انوار احمد امجدی (دہلی) نے ''علوم وفنونِ رضا کی جدید تقسیم'' کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔

بعد نماز ظہر دوسری نشست کا آغاز ہوا مولانا شاہد القادری (مدیر گلستان رضا کلکتہ) نے ''کلکتہ میں فکر رضا کی تابشیں'' (۱۹۰۱ء تا ۲۰۱۱ء) کے عنوان پر تاریخی تناظر میں مقالہ خوانی کی، کلکتہ میں اشاعت علم

دین اور اصلاحی و فکری امور میں تلامذہ و وابستگانِ رضا کے رول پر گفتگو کی۔ ’’فروغ رضویات اور مدرسہ منظر اسلام بریلی‘‘ کے زیر عنوان ڈاکٹر اعجاز انجم لطیفی (مدیر ماہنامہ اعلیٰ حضرت بریلی) نے مقالہ خوانی کی، موصوف نے اسلامی علوم کے فروغ کے ساتھ مسلم مسائل کے حل کے سلسلے میں عہد بہ عہد فضلائے منظر اسلام کی کاوشات کا دلائل سے تجزیہ پیش کیا۔ جب کہ عصر حاضر کے ابھرتے تقاضوں کے تناظر میں ’’کلام رضا کی شعری جمالیات‘‘ کو ڈاکٹر خواجہ اکرام (جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی) نے موضوع بنایا۔ موصوف نے کہا: ’’نعتیہ شاعری میں احساس جمالیات جو موجود ہے، وہ کسی صنف شعری میں نہیں اور اس کی مثالیں اعلیٰ حضرت کے کلام میں ملتی ہیں‘‘ اس نشست کے آخری مقالہ نگار پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی (بہار یونیورسٹی مظفر پور) تھے۔ موصوف نے ’’اعلیٰ حضرت کی ادبی بصیرت اور صنف نعت‘‘ کے زیر عنوان فرمایا: ’’رضویات کا مستقبل بہت تابناک ہے جس پر درجنوں پی ایچ ڈی اور ایم فل کے اعزازات شاہد ہیں۔‘‘

بعد از عصر سمینار کی تیسری نشست کا آغاز ہوا، ڈاکٹر صاق الاسلام دہلی نے تحقیقی گوشوں پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر آدم رضا شیخ (شولا پور) نے یونیورسٹیوں میں امام احمد رضا پر تحقیق کی افادیت اور اصول پر اظہار خیال کیا۔ اخیر میں مفتی مطیع الرحمٰن رضوی نے مقالات پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہا: ’’۱۹۱۲ء میں اسلامی بنیادوں پر امام احمد رضا نے اپنے مشہور معاشی نظریہ پیش کیا۔ جو عالمی معیشت میں اہم مقام رکھتا ہے۔ عالمی جامعات میں امام احمد رضا تحقیق کا موضوع بن چکے ہیں۔‘‘ رات میں اجلاس عام منعقد ہوا، جس میں مولانا تطہیر احمد رضوی بریلوی نے امام احمد رضا کے اصلاحی افکار اور معاشرتی احوال پر پر مغز خطاب کیا۔ اسی دوران ۲۰۱۰ء میں علمی و تحقیقی کام انجام دینے والے تین اسکالرز کو مولانا یٰسین اختر مصباحی کے ہاتھوں اعزازات سے نوازا گیا۔ کانفرنس میں درجنوں علما و مشائخ نے شرکت کی اور امام احمد رضا کی دینی، فقہی، اصلاحی، تعلیمی و تحقیقی خدمات کے گوشوں کو اجاگر کیا۔

دوسرا دن: ۲۷ رفروری، سمینار و کانفرنس کے دوسرے روز کی پہلی نشست کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، پہلا مقالہ ’’امام احمد رضا کی طبی بصیرت‘‘ پر ڈاکٹر سعید احسن قادری (پونے میڈیکل کالج) نے پیش کیا، جدید طب میں امام احمد رضا کی مہارت کے ضمن میں دلائل پیش کیے۔ تصنیف رضا

"الدولۃ المکیہ" کے حوالے سے ریاضی و سیٹ تھیوری (Set Theory & Topology) میں امام احمد رضا کی دسترس پر مقالہ ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی (بریلی) نے پیش کیا آپ نے مثال میں عباراتِ رضا بھی پیش کیں۔ اس نشست کا تیسرا مقالہ مولانا مجاہد حسین حبیبی (مدیر ماہنامہ تبلیغ سیرت کلکتہ) نے "کلکتہ میں متوسلین رضا کی علمی خدمات" کے موضوع پر پیش کیا۔ بعدازاں پروفیسر ڈاکٹر رفیق منیار (پونا) نے بعنوان Alahazrat and study of zoology انگریزی میں مقالہ پیش کیا۔ ادبیات رضا پر مولانا حسن منظر قدیری نے مقالہ پڑھا، آپ نے کہا: "حدائق بخشش میں اعلیٰ حضرت نے فکر و فن کو سمو دیا ہے۔" مفتی مطیع الرحمٰن رضوی نے علوم جدیدہ میں امام احمد رضا کی دسترس پر مقالہ خوانی کی، فرمایا کہ "دنیا کے بڑے بڑے فلاسفر بھی اعلیٰ حضرت کے سائنسی نظریات سے استفادے پر مجبور ہیں۔" صدارتی خطبہ علامہ یٰسین اختر مصباحی نے ارشاد فرمایا آپ نے کہا کہ: "سنجیدہ و علمی انداز میں افکار رضا کو پیش کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی عظیم قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔" سمینار کی آخری نشست میں تاثراتی کلمات مفتی علاؤالدین رضوی (میرا روڈ) نے ارشاد فرمائے۔ غلام مصطفیٰ رضوی (مالیگاؤں) نے اشاعت دین کے لیے فکر رضا کی روشنی میں میڈیا کے کردار پر پرمغز مقالہ پیش کیا اور کہا کہ "فکر رضا کی روشنی میں ابلاغ حق کے لیے میڈیا کے شعبے شرعی احتیاط کے ساتھ بروئے کار لائے جائیں اور دین کی اشاعت کی جائے" "تحقیقات رضویات" پر سید ولی الدین نے مقالہ پیش کیا۔ آخری مقالہ ناظم سمینار ڈاکٹر واحد نظیر (پٹنہ) نے "امام احمد رضا کی نعت گوئی میں حزم و احتیاط" کے موضوع پر پڑھا۔ عصر تا مغرب سوال و جواب کا علمی سلسلہ رہا۔ شب میں علما و مشائخ کے فکر انگیز خطبات ہوئے۔ مرکزی خطبہ مفتی اعظم مہاراشٹر مفتی محمد مجیب اشرف رضوی (ناگپور) نے ارشاد فرمایا۔ آپ نے کہا کہ "امام احمد رضا کی مقبولیت و مہارت اشاعت دین کی بنیاد پر ہے۔ اپنے عہد کے تمام ماہرین فن پر امام احمد رضا فوقیت رکھتے ہیں۔ اسلامی وقار کی بحالی کے لیے آپ کی خدمات سب سے نمایاں ہیں۔" علمائے کرام کے ہاتھوں ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی دو تصانیف "امام احمد رضا: ایک نئی تشکیل" اور "کاملان پورنیہ" کا اجرا علما و دانش وروں کے ہاتھوں عمل میں آیا، سمینار و کانفرنس کے انعقاد کے پس منظر اور مقاصد پر

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے روشنی ڈالی اور فرمایا کہ ملک کی مختلف شعبوں سے وابستہ ماہر شخصیات کی خدمات کے اعتراف میں یونیورسٹیاں اور انسٹی ٹیوٹ ان کے نام منسوب ہیں لیکن وہ ذات جو ہر علم وفن میں ماہر اور ملک کے لیے باعث فخر ہے ''امام احمد رضا'' ان سے منسوب کوئی تحقیقاتی ادارہ نہیں، ہماری اولین ترجیح امام احمد رضا سے منسوب ایک عظیم تحقیقاتی ادارہ کا قیام ہے جس کے لیے ہم کوشاں ہیں۔ اصلاحی، سماجی، تعلیمی، طبی اور دیگر فلاحی شعبوں میں فکر رضا کے حوالے سے کام کے لیے ہم منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ آپ نے کہا کہ ''شریعت کی اتباع ہی مسلک رضا ہے۔'' سلام ودعا پر اس علمی وتاریخی سمینار وکانفرنس کا اختتام ہوا۔ شرکا کی بڑی تعداد ملک کے مختلف مقامات سے پہنچی جب کہ جامعات، کالجوں اور دانش گاہوں سے وابستہ علما اساتذہ اسٹوڈنٹ کی بڑی تعداد بھی حاضر تھی۔ پروگرام کے انعقاد میں میرا روڈ اور ممبئی کی سرکردہ شخصیات اور علما وائمہ نے نمایاں کردار انجام دیا۔

○ ○ ○

پروفیسر عبدالمجید صدیقی اور غلام مصطفیٰ رضوی کی کامیاب نمائندگی

(ہفت روزہ انوار، مالیگاؤں بروز پیر ۷؍مارچ ۲۰۱۱ء۔ بمطابق ۲؍ربیع الآخر ۱۴۳۲ھ)

ممبئی: میرا روڈ میں ۲۶؍۲۷ فروری کو امام احمد رضا سمینار وکانفرنس کا انعقاد مرکز برکات رضا چیریٹیبل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ہوا جس کی پہلی نشست میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے ''اعلیٰ حضرت اور زرکی بازارکاری'' کے موضوع پر مقالہ خوانی کی اور غلام مصطفیٰ رضوی نے ''میڈیا اشاعت دین اور فکر رضا'' کے زیر عنوان تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ دونوں محققین کو توسیفی سند اور ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ دونوں مقالوں کو ملک کے دانشوروں اور علما نے حوصلہ افزا تاثرات سے نوازا۔ دونوں مقالہ نگاروں نے شہر کا نام روشن کیا اس مبارک موقع پر ہم مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ کریم انہیں مزید عزت اور علم وعمل کی دولت سے نوازے۔ آمین۔ تہنیت منجانب: درواراکین جامعۃ الرضا برکات العلوم، صدر واراکین رجا

اکیڈمی، حامد رضا انصاری، اجوید رضوی، عامر رضوی، معین رضوی، سبطین رضا اراکین نوری مشن مالیگاؤں، مالیگ فیملی آف برطانیہ، آل انڈیا تبلیغ سیرت کولکاتا، امام احمد رضا سوسائٹی کولکاتا، زبیر قادری مدیر مسلک ممبئی، سید وجاہت رسول قادری مدیر معارف رضا کراچی، سنی دعوت اسلامی۔

○ ○ ○

اپنے عہد کے ماہرین علم وفن پر امام احمد رضا بریلوی فوقیت رکھتے ہیں

امام احمد رضا کانفرنس وسمینار کے دوسرے دن علما اور دانشوروں کا خطاب

(روزنامہ صحافت ممبئی، ۱؍ مارچ بروز منگل ۲۰۱۱ء)

ممبئی: دنیا کے بڑے بڑے فلاسفر وسائنس داں امام احمد رضا کے نظریات سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ کئی صدیوں تک امام احمد رضا جیسی ماہر علم وفن شخصیت نظر نہیں آتی۔ اس طرح کا اظہارِ خیال مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی پٹنہ نے اپنے تحقیقی مقالہ ''امام احمد رضا اور علم توقیت'' میں فرمایا۔ برکات رضا چیریٹیبل ٹرسٹ میرا روڈ کے زیر اہتمام منعقدہ امام احمد رضا انٹرنیشنل سمینار وکانفرنس کے دوسرے روز کی پہلی نشست کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا پھر امام احمد رضا کی طبی بصیرت پر ڈاکٹر سعید احسن قادری (پونے میڈیکل کالج) نے مقالہ خوانی کی اور جدید طب میں امام احمد رضا کی مہارت کے جلوے دکھائے۔ تصنیف رضا ''الدولۃ المکیہ'' کے حوالے سے ریاضی وسیٹ تھیوری میں امام احمد رضا کی دسترس پر مدلل مقالہ ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی نے پیش کیا۔ اس نشست کا تیسرا مقالہ مولانا مجاہد حسین حبیبی کلکتہ نے کلکتہ میں رضویات میں علما اور تنظیموں کا کردار کے موضوع پر پیش کیا۔ پروفیسر رفیق منیار پونا کے مقالے کا موضوع تھا ''اعلیٰ حضرت اور علم حیوانات (Aalahazrat and study of zoology) ادبیات رضا پر مولانا حسن منظر قدیری نے اور مفتی مطیع الرحمٰن صاحبان نے علوم جدیدہ میں امام احمد رضا کی دسترس پر مقالہ پیش کیا۔ صدارتی خطبہ میں علامہ یٰسین اختر

مصباحی دارالقلم دہلی نے ارشاد فرمایا آپ نے کہا کہ سنجیدہ وعلمی انداز میں افکار رضا تو پیش کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی عظیم قومی خدمات انجام دے رہے ہیں۔سمینار کی آخری نشست میں تاثراتی کلمات مفتی علاؤالدین رضوی (میرا روڈ) نے ارشاد فرمائے۔غلام مصطفیٰ رضوی مالیگاؤں نے اشاعت دین میں فکر رضا کی روشنی میں میڈیا کے رکدار پر پر مغز مقالہ پیش کیا۔تحقیقات رضویات پر سید ولی الدین نے مقالہ پیش کیا۔آخری مقالہ ناظم سمینار ڈاکٹر واحد نظیر نے امام احمد رضا کی نعت گوئی میں عزم واحتیاط کے موضوع پر پڑھا۔عصر تا مغرب سوال وجواب کا علمی سلسلہ رہا۔ سوالات کے جوابات مفتی مطیع الرحمٰن رضوی نے ارشاد فرمائے۔شب میں علما ومشائخ کے فکر انگیز خطاب ہوئے۔مرکزی خطبہ مفتی اعظم مہاراشٹر مفتی محمد مجیب اشرف رضوی (ناگپور) نے ارشاد فرمایا۔آپ نے کہا کہ امام احمد رجا کی مقبولیت ومہارت فن اور اشاعت دین کی بنیاد پر ہے۔اپنے عہد کے تمام ماہرین فن پر امام احمد رضا فوقیت رکھتے ہیں۔اسلامی وقار کی بحالی کے لیے آپ کی خدمات سب سے نمایاں ہیں۔اس سمینار وکانفرنس کا اختتام ڈاکٹر غ ام جابر شمس مصباحی کے اظہار تشکر اور سلام ودعا پر ہوا جب کہ موصوف کی دو تالیفات ''امام احمد رضا ایک نئی تشکیل اور کاملان پورنیہ'' کا اجراء علما کے ہاتھوں ہوا۔پورے ہندوستان سے ارباب علم ودانش اور جامعات ویونیورسٹیز کے استاذہ نے شرکت کی۔شرکاء نے پوری متانت کے ساتھ مقالات خطبات کو سنا نیز امام احمد رضا پر تحقیق وریسرچ کے حوالے سے منصوبہ بندی کی گئی۔اس سمینار کے انعقاد میں مریا روڈ کی سرکردہ شخصیات اور علما وائمہ نے نمایاں کردار انجام دیا۔بڑی تعداد میں علمائے کرام اور ائمہ مساجد نے اس سمینار میں شرکت کی۔

○ ○ ○

سرزمین ممبئی پر اپنی نوعیت کی منفرد و تاریخی

امام احمد رضا بین الاقوامی دوروزہ کانفرنس و سمینار

(ہفت روزہ انوار، مالیگاؤں بروز پیر ۱۴/ مارچ ۲۰۱۱ء۔ بمطابق ۷ا/ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ)

ممبئی: مرکز برکات رضا ایجوکیشنل اینڈ چیرٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام ۲۶/۲۷ فروری بروز سنیچر اتوار بمقام انجمن اسکول گراؤنڈ نیا نگر میرا روڈ ممبئی میں عظیم الشان امام احمد رضا بین الاقوامی دوروزہ سمینار و کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہے، علمی نوعیت سے افکار و تعلیمات امام احمد رضا تحقیق و تدقیق کے حوالے سے منعقد ہونے والے اس منفرد پروگرام میں ملک و بیرون ملک سے درجنوں دانش ور علما و محققین نیز اسکالرز شریک ہوں گے بالخصوص عالم عرب سے قد آور علمی شخصیات کو مدعو کیا گیا ہے۔ یونیورسٹیوں سے وابستہ پروفیسرز و محققین بھی زینت بزم ہوں گے۔ اس دوروزہ پروگرام میں منتخب گوشوں پر مقالہ خوانی کے علاوہ کانفرنس میں متعین موضوعات پر سنجیدہ و خطبات بھی ہوں گے جب کہ اس دوروزہ پروگرام کی سرپرستی حضرت ڈاکٹر سید محمد امین میاں قادری مارہروی (سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف و پروفیسر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) فرما رہے ہیں۔ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے سال گزشتہ بھی قومی سطح پر سمینار و کانفرنس کا کامیاب انعقاد کیا تھا۔ پروگرام کی تیاریاں زوروں پر ہیں نیز ملک کے مشاہیر ادبا و ارباب علم سے مسلسل رابطہ جاری ہے۔ ارباب علم و دانش سے گزارش ہے کہ دونوں اجلاس میں شریک ہو کر فکر رضا کی علمی اہمیت اور امام احمد رضا کی تحقیقی خدمات سے آگہی حاصل کریں۔ ایک اطلاع کے مطابق اس سمینار و کانفرنس میں پورے مہاراشٹر سے علم دوست افراد شرکت فرما رہے ہیں۔

○ ○ ○

امام احمد رضا کانفرنس وسمینار میں شرکت کریں

(ہفت روزہ انوار، مالیگاؤں بروز پیر۱۴؍مارچ ۲۰۱۱ء۔ بمطابق ۷؍ربیع الاول ۱۴۳۲ھ)

ممبئی۔ ۲۶؍۲۷ فروری، ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی فعال قیادت میں منعقد بین الاقوامی امام احمد رضا کانفرنس وسمینار میں ضرور شرکت کریں اور عالمی محققین وعلما ومشائخ کے خطبات ومقالات سماعت فرما کر اپنے علم میں اضافہ کریں۔ یہ ایک تاریخی پروگرام ہے جس میں عرب شیوخ اور دیگر ممالک کے درجنوں مندوبین کی شرکت یقینی ہے۔ نیز امام احمد رضا کے علمی فیضان سے مالا مال ہوں۔ اپیل کنندہ: مالیگ فیملی آف برطانیہ، رضا اکیڈمی مالیگاؤں، جامعۃ الرضا برکات العلوم، غلام مصطفیٰ رضوی، سید منور علی شاہ بخاری (کرولینا امریکہ)، سید وجاہت رسول قادری (کراچی)

○ ○ ○

امام احمد رضا سمینار وکانفرنس

(روزنامہ شامنامہ، مالیگاؤں، مورخہ ۱۳؍جنوری ۲۰۱۱ء)

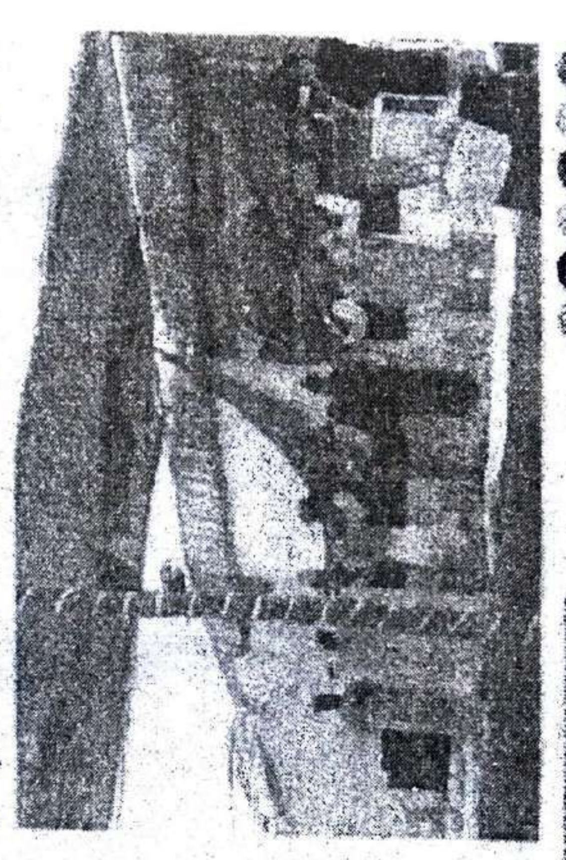
تاج الشریعہ علامہ اختر رضا ازہری کے فیضان وامین ملت ڈاکٹر سید محمد امین مارہروی کی سرپرستی میں ۷؍فروری ۲۰۱۰ء میرا روڈ ممبئی میں قومی امام احمد رضا سمینار وکانفرنس کا انعقاد برکات رضا چیریٹیبل ٹرسٹ نے ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی نگرانی میں کیا، اس میں ملک بھر کے مشہور دانشوروں مشائخ وعلما نے شرکت کی، اس تاریخی وعلمی سمینار وکانفرنس کے اہتمام میں مشن نے اہم کردار ادا کیا، جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے غلام مصطفیٰ رضوی وعتیق الرحمٰن رضوی کو توسیفی سند واعزاز سے بھی نوازا۔

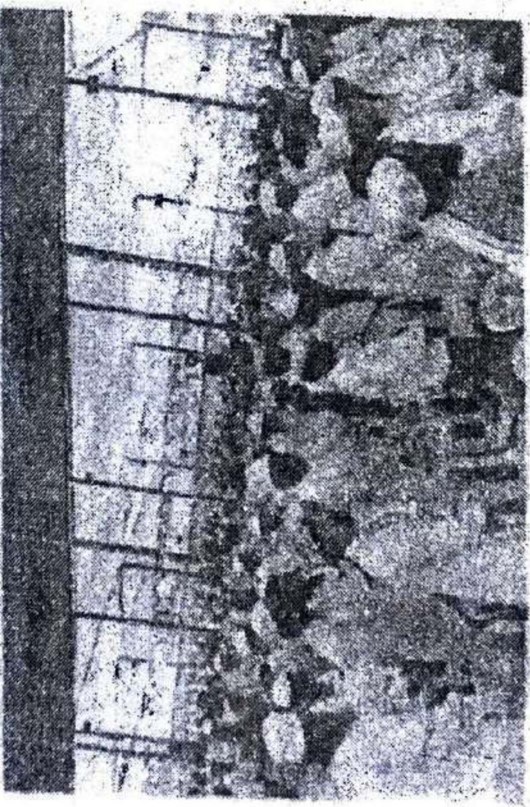
میرا روڈ میں امام احمد رضا پر فکر انگیز کانفرنس و سیمینار کا انعقاد

ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے اسکالرز نے اپنی جامع تقاریر میں امام احمد رضا کی تعلیمات کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا، دینی اور اسلامی معلومات پر کتاب میلہ

صابر شیخ

میرا روڈ: (ایس این بی) میرا روڈ کے گولڈن نیسٹ پولس چوکی کے پیچھے واقع گراؤنڈ پر آج صبح امام احمد رضا کانفرنس و سیمینار کا آغاز مولانا نصیر احمد کی تلاوت قرآن پاک اور قاری عبد علی کی نعت پاک سے ہوا۔ بعد تلاوت قرآن و نعت مالیگاؤں سے تشریف لائے پروفیسر عبد المجید صدیقی نے اپنے مقالہ میں اعلیٰ حضرت اور ان کے معاشیاتی نظریات پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے افتتاحی کلمات مفتی انوار احمد (دہلی) نے علوم رضا سے متعلق تقریر پیش کی۔ سیمینار کے افتتاح کے بعد مفتی حنیف خان مصباحی بریلوی نے اعلیٰ حضرت پر 10 نکاتی اشاعتی و تعلیمی منصوبوں پر طویل گفتگو کی۔ دوسری نشست بعد..... باقی صفحہ ۱۱ پر





روزنامہ راشٹریہ سہارا ممبئی۔

ڈاکٹر شمس پورنوی کی تالیفات وتحقیقات

☆ کلیات مکاتیبِ رضا (تین جلدیں) — مطبوعہ ہند و پاک ۲۰۰۵ء

☆ پروازِ خیال — مطبوعہ ادارہ مسعودیہ، کراچی پاکستان، ۲۰۰۵ء

☆ حیات رضا کی نئی جہتیں — مطبوعہ ممبئی ۲۰۰۷ء

☆ خطوط مشاہیر بنام امام احمد رضا (دو جلدیں) — مطبوعہ ممبئی ۲۰۰۷ء

☆ امامِ احمد رضا خطوط کے آئینے میں — مطبوعہ ممبئی ۲۰۰۸ء

☆ آئینہ حیات قادری — مطبوعہ ممبئی ۲۰۰۸ء

☆ بولتی تصویریں — مطبوعہ مرادآباد و ممبئی ۲۰۰۹ء

☆ تین تاریخی بحثیں — مطبوعہ ممبئی ۲۰۰۹ء

☆ جہانِ ملک العلماء — مطبوعہ ممبئی ۲۰۰۹ء

☆ انتخاب کلام عاطف — مطبوعہ ممبئی ۲۰۰۹ء

☆ کاملان پورنیہ جلدا — مطبوعہ ممبئی ۲۰۱۰

☆ امام احمد رضا ایک نئی تشکیل — مطبوعہ ممبئی ۲۰۱۰

☆ تحقیقات امام علم وفن — مطبوعہ ممبئی ۲۰۱۰

☆ سفر خوشبو دیش کا — مطبوعہ ممبئی ۲۰۱۱

☆ فکر رضا کے نقشہائے رنگ رنگ — مطبوعہ ممبئی ۲۰۱۱

☆ پرواز خیال — مطبوعہ ممبئی ۲۰۱۱

☆ امام احمد رضا کی مکتوب نگاری (مقالہ پی، ایچ، ڈی) — غیر مطبوعہ

☆ مسئلہ اذان ثانی ایک تحقیقی مطالعہ — غیر مطبوعہ

☆ ندوۃ العلماء ایک تجزیاتی مطالعہ — غیر مطبوعہ

☆ تقریظات امام احمد رضا — غیر مطبوعہ

☆ اسفار امام احمد رضا — غیر مطبوعہ

☆ امام احمد رضا کے چند غیر معروف خلفاء — غیر مطبوعہ

☆ امام احمد رضا آداب والقاب کے آئینے میں — غیر مطبوعہ

☆ حکایات امام احمد رضا — غیر مطبوعہ

BARKAAT-E-RAZA FOUNDATION

Mira Road, Mumbai